کُفر

(ناول)



تہمینہ دُرّانی

کُفر (ناول)

مصنفہ : تہمینہ درانی

ترجمہ : میجر (ر) آفتاب احمد

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

غیر مجلد: 969 0 01679 2
باراول ــــــــــــــ ۲۰۰۰ء
باردوم ــــــــــــــ ۲۰۰۴ء

ہیڈ آفس و شوروم: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔
راولپنڈی آفس: 277 پشاور روڈ، راولپنڈی۔
کراچی آفس: فسٹ فلور، مہران ہائٹس، کلفٹن روڈ، کراچی۔

کفر (ناول)	Kufar (Novel)
تہمینہ درانی	Tehmina Durrani

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر و پبلشر

انتساب

ہیر کے نام جس نے یہ سب کچھ سہا

فہرست

باب ۱

نجات

مسجد کے لاوڈ سپیکر سے اذانِ فجر فضا میں بلند ہوئی۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَشْہَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ، کا اقرار نامہ خوابیدہ گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے حدِ نگاہ تک پھیلے صحرا کے نشیب و فراز پر سے ہلکورے لیتا گزرا۔

دروازے سے باہر نکلتی میری چیخوں نے خوش الحانی سے ادا ہوتے مقدس الفاظ کی روانی اور لے میں چھید کر ڈالے۔ اَشْہَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ کی پکار اپنے ہی رنگ میں میری چیخوں کے وقفوں میں سماتی چلی گئی۔

دونوں کے ملاپ نے تیرہ و تاریک آسمان کو چاک کر ڈالا۔

میں اللہ کے حضور فریادرس تھی۔

صُبح کا تڑکا تھا۔

حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ، حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ، یہ سب کے لئے اٹھ کھڑا ہونے اور نماز کے لئے آنے کا حکم تھا۔ لوگ میٹھی نیند سے جیسے جھٹکے کے عالم میں بیدار ہوئے۔

پلک جھپکتے میں عورتیں شہد کی مکھیوں کی طرح میرے چاروں طرف منڈلانے لگیں۔ انہوں نے مالک کو دیکھا اور فضا چیخوں سے اَٹ گئی۔ میں ایک پاگل ہجوم کے درمیان سر نہوڑائے بیٹھی تھی ..... لامتناہی دکھائی دیتا شور اس وقت یکلخت تھم گیا جب مرد اندر داخل ہوئے اور عورتیں بدکتی ہوئی باہر نکلیں۔

ایک فطری ردِعمل کے زیرِ اثر میں نے اپنا رخ اس کے چاروں بھائیوں سے پھیر لیا۔ سوگ کے اس موقع پر بھی ان کی وہاں موجودگی بڑی عجیب سی تھی۔ قبل ازیں انہوں نے کبھی یوں میرے سامنے ہونے کی جسارت نہ کی تھی، اگر کبھی ایسا ہوا بھی تو میں اپنا چہرہ پلو سے ڈھانکے نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے اس پلنگ کی طرف بڑھے جس کے اوپر چھت کا پنکھا ساکت کھڑا تھا، بالکل یوں ہی جیسے اس کے نیچے دراز میرا خاوند، بے حس و حرکت، مُردہ۔

میں نے کنکھیوں سے اُسے دیکھا۔ اس کی دونوں آنکھیں چوپٹ کھلی تھیں۔ دہشت

انگیز! ہیبت ناک!! لیکن نہیں یہ کتنی حیران کن بات تھی کہ آج وہ خود ڈر اور خوف میں ڈوبی ہوئی تھیں!

لہو کی دو پتلی سی دھاریں اس کے دونوں کانوں سے بہتی ہوئی گردن کے اطراف پہ دو سیاہ دھبوں کی صورت جم گئی تھیں۔ امام ضامن ہمیشہ کی طرح اب بھی اس کے بازو سے بندھا ہوا تھا۔ چاندی اور چمڑا منڈھے کئی تعویز اس کے گلے میں موجود کالے دھاگے سے لٹک رہے تھے۔ مسہری کی تپائی پہ رکھا بھاری کلاک ٹِک ٹِک کر رہا تھا۔

مرد مہر بہ لب تھے۔ ٹکٹکی بندھی میری خوفزدہ نگاہیں ان میں سے کسی کی تیز دھار شعلہ نظروں سے ٹکرائیں تو میں جیسے اپنی جگہ منجمد ہو کے رہ گئی۔ ان سب کی وہاں موجودگی گویا اس امر کا شگون تھی کہ اس کے بعد اب ان چہروں کو میری زندگی پہ چھائے رہنا تھا۔ مستقبل کی غیر یقینی تصویر کا کوندا میرے ذہن میں لپکا اور اگلے ہی لمحے میں ہوش و حواس کھو بیٹھی۔

ہوش بحال ہوئے تو میں اپنے میاں کی لاش کے بالمقابل رکھے صوفے پر پڑی تھی۔ یادوں کے ہجوم نے مجھ پہ اس شدت سے دھاوا بولا کہ یوں لگا جیسے وہ میرے اوپر جھکا بھاری بھاری سانسیں لے رہا ہو، لیکن اس گہرے احساس کے باوجود میرے اور اس کے درمیان فاصلہ کتنی کامل اور اٹل حقیقت بن چکا تھا۔ میں نے سوچا موت فنا ہو جانے کا نام تھا لیکن کیا واقعی؟ .....

اب کمرے میں دوسری کوئی عورت نہ تھی۔ بھائیوں کا ہیبت ناک چوکہ میت کے ارد گرد براجمان تھا۔ بے یقینی اور تاسف کے ملے جلے روایتی انداز میں سر ہلانے کے ساتھ ساتھ وہ آپس میں کچھ کہہ سُن بھی رہے تھے۔ تو کیا وہ میرے خاوند اور اپنے ماں جائے کی موت کے اگلے ہی لمحے معاملات طے کرنے پر اتر آئے تھے؟ میں جاننا چاہتی تھی۔ میں نے کان لگانے کی کوشش کی لیکن میرے ہاتھ کچھ نہ آسکا۔

باہر عورتیں اب ہماری اکلوتی اولاد اور جانشین راجہ جی سے صاحب سلامت کے ساتھ ساتھ تعزیت میں مصروف تھیں۔

"ہائے! تیرا نام اور نشان والا باپ رخصت ہوا، لوگو! ہم لُٹ گئے، سائیں ہمیں بے آسرا یتیم کر گیا۔"

دروازہ کھٹاک سے کھلا اور میرا بیٹا دھڑام سے اپنے باپ کی چارپائی پہ آگرا۔ میں پے در پے مسکن ادویات لے رہی تھی۔ کچھ اور گولیاں نگلتے ہوئے بے ربط سے انداز میں میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ مجھے ہمت سے کام لینا چاہیے۔ اسی اثناء میں خاندانی حکیم تیزی سے اندر داخل ہوا اور میرے میاں کی لاش پہ جھک گیا۔

راجہ جی نے مجھے وہاں سے چلے جانے کو کہا، میں لڑکھڑاتی ہوئی کمرے سے نکلی۔ مجھے خیال آرہا تھا کہ اسی طرح جیسے اس نے اپنے باپ کی پگڑی سنبھالی تھی بہت جلد وہ میرے معاملات کو بھی اپنے تصرف میں لے آنے کو تھا۔

صحن آسمان کی طرف منہ اٹھائے بھیڑیوں کی طرح چیختی چلاتی عورتوں سے اٹا پڑا تھا۔ خواب آور گولیوں کی پھیلائی ہوئی دھندلاہٹ میں ڈوبتی میری آنکھیں چیخ و پکار سے بالا کسی حقیقی تبدیلی کے نشان کی متلاشی تھیں۔

کیا یہ لمحہ ان اوقات سے مختلف تھا جب وہ حیات تھا؟ لیکن سوگوار عورتوں نے مجھے دیکھ لیا اور وہ فلک شگاف بین کرتے ہوئے میری طرف لپکیں۔ بوڑھی، ادھیڑ عمر اور جواں سال وہ سبھی حویلی اور گھرانے کی خادمائیں تھیں۔ ان میں سے اکثر نے مجھے سرخ جوڑا پہنے حویلی میں پہلا قدم رکھتے ہوئے دیکھا تھا۔ کچھ زچگیوں میں میرے ساتھ ساتھ رہی تھیں، کچھ میرے بچوں کی آیائیں اور کچھ وہ جن کے ہمراہ کھیلتے ہوئے وہ پلے بڑھے۔ میرے دُکھ سُکھ ان سب پہ روزِ روشن کی طرح عیاں رہے تھے۔

باسی پسینے کی بوجھل اور کسیلی بدبو میں ڈوبی ان عورتوں سے گلے ملتے ملتے میں تر بتر ہو گئی۔ ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے میں نے بدقت اپنے آپ کو ماتمی دالان کی اس گہری سوہانِ روح صورتِ حال کے چنگل سے آزاد کروایا اور اپنی ساس کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اماں سائیں کو تکیوں کے سہارے بٹھا دیا گیا۔ ان کے بوڑھے ہونٹوں پہ خاموشی کی مہر تھی۔ عورتیں غمگساری کے لئے ان کے گلے لگنے کو دیوانہ وار آگے بڑھتیں لیکن جواب نہ پاتے ہوئے کچھ خفت کے ساتھ انہی قدموں پیچھے ہٹ جاتیں۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ اگر گذرے ہوئے مہ و سال اس سنگین مہر سکوت کے گواہ نہ ہوتے تو میں ضرور یہ سمجھتی کہ بیٹے کی موت کا صدمہ اس کا سبب بنا تھا، لیکن ایسا تو نہ تھا۔

اماں سائیں مدتوں حویلی کی بیگم اور مالکن کہلائیں۔ بہت بعد میں آہستہ آہستہ

ذمہ داریوں کا یہ بوجھ میری طرف منتقل ہوا۔ سب کچھ جاننے کے باوجود یوں لگتا تھا جیسے وہ کچھ نہ جانتی تھیں، یا شاید یہ عورتوں کی عقل و فہم اور مخصوص حسیات کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے علم اور اظہار کو حدود میں مقید رکھتی تھیں۔ اماں سائیں کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے میں نے اُن کا جھریوں بھرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا، اسے پلٹایا اور اس کی گہری نمایاں لکیروں کا جائزہ لینے لگی۔ ان کی چپ کا روزہ تڑوانے کے لئے میں کسی سرے کی کھوج میں تھی، لیکن شاید ان کے حق میں بہتر یہی تھا کہ وہ خاموشی کے اپنے سمندر سے کبھی باہر نہ نکلتیں۔ سوچوں کی اس بھرمار کے دوران عورتیں آتی اور جاتی رہیں۔ ان کی آہ و بکا کی لے تال اور سُر جوار بھاٹے کی طرح اماں سائیں کے سامنے اپنی انتہا کو چھونے کے بعد میرے بالمقابل مدھم پڑتی دروازے تک پہنچتے پہنچتے، ہائے قیامت!! ہائے قیامت!! کا تاثر دیتی ہوئی معدوم ہو جاتی۔

بوڑھی چچیاں اور خالائیں، سگی اور سوتیلی بہنیں، سالیاں اور بھانجیاں بھتیجیاں سب ہی پہنچ رہی تھیں۔ شدید، رقت آمیز انداز میں یکے بعد دیگرے وہ بڑھ چڑھ کے آہیں اور سسکیاں بھرتے مجھے چومتے چاٹتے میرے گلے لگ رہی تھیں۔ سینہ کوبی کے دوران ان کی آہ و فغاں کی تان بار بار اس دعا پر ٹوٹتی، "خدا تجھے صبر دے کہ تو پہاڑ جیسی بیوگی کاٹے" حتمی بددعا۔

میرے میاں کی بوڑھی آیا دائیں بائیں ٹٹولتے ہوئے گلے لگنے میری طرف بڑھی۔ دائی ڈھلکے ہوئے چھیچھڑوں کا ڈھیر لگ رہی تھی۔ اس کے سینے سے قریب میں اس کی سانسوں میں غربت کی پون صدی کی گاڑھی بو سونگھ رہی تھی۔ بڑھیا اس بچے کی موت کے غم میں ڈوبی ہوئی تھی جسے اس نے پالا پوسا اور اب اس کی میت کے سرہانے زندہ کھڑی تھی۔ کیا قیامت اس مر جانے والے پر اتری تھی یا اس کا نشانہ بھی ہم ہی تھے؟ کیا یہ ہماری زندگیوں میں تبدیلی کی پیغامبر تھی؟ اگر نہیں تو پھر کس لئے کس کی خاطر؟ یہ راز ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ ارے قیامت!! ہائے قیامت!! وہ سب چلا رہی تھیں۔

تازہ ہوا میں سانس لینے کے لئے میں کسی طرح صحن میں آ نکلی۔ وہاں وحشیانہ بھگدڑ کا عالم تھا۔ فضا دہشت زدہ عورتوں کی ڈراؤنی چیخوں سے بھری پڑی تھی۔ کچھ فاصلے پہ مجھے حویلی میں پناہ گزین بیوہ کی دونوں لڑکیاں دکھائی دیں۔ بہت سے سوال بزبانِ خاموشی میرے اور ان کے درمیان اُٹھے۔ میری ہمجولیاں اور رازداں میری آنکھوں میں جھانک رہی

تھیں۔ مالک کے بنا زندگی کیسی ہوگی؟ ان کا کیا بنے گا جن پہ اس کی خاص چشمِ التفات تھی؟ ان کی ماں کے سامنے آتے ہی میرے خیالات کا سلسلہ منتشر ہو گیا۔ سینہ کوبی کرتے ہوئے وہ میرے قدموں میں آگری۔ وہ التجا کر رہی تھی کہ میں انہیں بے آسرا نہ چھوڑوں، تینوں اس وقت تک میری ٹانگوں سے لپٹی رہیں۔ جب تک میں نے انہیں پرے نہیں دھکیل دیا۔

بالآخر باتھ روم میں گھستے ہوئے میں نے اسے مُقفل کر لیا۔ میں لکڑی کے سٹول پہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ میرے تار تار اور زخمی دل و دماغ میں یادوں کا ریلا اُمڈتا چلا آرہا تھا۔ ایک پوری زندگی یوں ہی بیت گئی تھی۔

میں نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالتے ہوئے سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ ہاتھ کے دوسرے غوطے سے ایک سگریٹ لائٹر باہر آیا۔ میں نکوٹین کا زہر اندر کھینچ رہی تھی اور دھوئیں کے مرغولے میرے منہ سے یوں نکل رہے تھے جیسے موت رقص کناں ہو۔ خوف کے ہیولے باہر ہو رہے تھے۔ موت اس کی یادوں کو مٹانے میں ناکام رہی تھی۔ بے ربط اور بے ہنگم وہ دیوانہ وار ناچتی چلی آرہی تھیں۔ ذہنی خلفشار کے اس عالم میں میرے اندر کہیں زہریلے مواد کی ہانڈی اُبل رہی تھی۔ اس کے دھوئیں میں سے ایک صورت ابھری اور ابھرتے ساتھ ہی میری طرف لپکی۔

یتیم لڑکی، یتیمڑی

اس کا تصور تپ کی طرح میرے رگ و پے میں دوڑ گیا۔ ذہن کے چوپٹ کھلے دریچوں کو بند کرنے کے لئے میں نے دوپٹے کو رسے کی طرح سر پر لپیٹتے ہوئے اسے بُری طرح کس ڈالا۔ لیکن منتشر سوچیں اب بھی اندر ہی اندر کروٹیں بدلتی، تڑپتی اور پھڑکتی رہیں۔

باہر آہ و فغان تیز تر ہو گئی۔

میرے میاں کا کوئی بہت قریبی عزیز آن پہنچا تھا۔ ادھ جلا سگریٹ میری انگلیوں میں تھا کہ دروازہ پیٹتے ہوئے بہت سی عورتیں اوپر تلے چلا اٹھیں۔

"ہائے بی بی جی، لاڈلیاں پہنچ گئیں، ہائے تیری یتیم بچیاں آ گئیں۔"

موت، دنیا میں ہمارے خطے کا سب سے عجیب و غریب وقوعہ لوگوں کو کیا کیا سوانگ رچانے پہ مجبور کر دیتا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ جذبات کا مبالغہ آمیز اظہار ہی دکھ درد کی گہرائیاں ناپنے کا بہترین پیمانہ ہو سکتا ہے۔

سامنے دیوار پہ نصب آئینے میں میرے جیون کے اڑتیس سالوں کی ٹوٹی پھوٹی مسخ کہانی چل رہی تھی۔ اپنے بطن سے میں نے چھ بچوں، تین بیٹوں اور تین بیٹیوں کو جنم دیا تھا۔ ایک لڑکا پیدا ہی بے جان ہوا تھا۔ دوسرا عین جوانی کے عالم میں چل بسا۔ تینوں لڑکیاں بیاہی جا چکی تھیں اور تینتیسویں ہی سال میں میں نانی اماں بن گئی تھی۔ میرے چہرے پہ بہر حال اس جاں کوشی کی نسبت گذشتہ ایک شب کی اذیتوں اور دباؤ کے اثرات زیادہ نمایاں تھے۔ مسلسل دستک کے شور سے نجات کے لئے میں نے دروازہ کھول دیا۔ میری بیٹیوں کی آنکھوں کے سوال آنسوؤں کے غبار میں چھپے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ حالات میں تبدیلی کا وہ عجیب لمحہ ہمیں ساجھے داری میں گذارنا تھا۔

مقبرے میں نصب لاؤڈ سپیکروں سے پیر سائیں کے گزر جانے کے اعلان ہو رہے تھے۔ میں موت کی اس کوٹھڑی میں لوٹ آئی جہاں اس کی دنیا سے غیر حاضری اب کوئی پہیلی نہ رہی تھی۔ اس کے حجرے میں اتنا شور؟ یہ وہ مقام تھا جہاں بنا اجازت کوئی پاؤں دھرنے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ اِکا دُکا جنہیں یہ اعزاز ملتا عقیدت مندانہ لہجے میں نیم سرگوشیوں پہ اکتفا کرتے۔ اب وہاں ایک مسلسل نہ ختم ہونے والا بیزار کن شور بپا تھا۔ مجھے خیال آیا وہ ان سب کو جہنم بدر کرنے کے لئے دوبارہ اٹھ کھڑا ہوگا۔

اس شخص کو جو کبھی کبھار ہی اپنے ہاتھ پاؤں چومنے کی اجازت دیا کرتا تھا بلکہ جس کی قدم بوسی کے علاوہ کوئی اسے چھونے کی جسارت تک نہ کر سکتا تھا۔ ٹانگوں اور بازوؤں سے اٹھائے چارپائی پہ ڈالتے ہی سفید چادر سے ڈھک دیا گیا تھا، پھر چارپائی کو اٹھا کے باہر نکال دیا گیا۔ وہ اسے آخری غسل کے لئے لے جا رہے تھے۔

مجھے یاد آیا وہ کس شاہانہ انداز میں اس دہلیز سے اندر باہر ہوا کرتا تھا۔ اب قبر میں کیڑے اُس کے منتظر تھے۔

چارپائی کا دکھائی دینا تھا کہ باہر کہرام مچ گیا۔ سوگواروں کے ان گنت سروں کے اوپر تیرتی ہوئی میت نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ راجہ اپنے باپ کی میت کو غسل دینے جا رہا تھا جبکہ اس کے چچا اس پہ معجزاتی آب زم زم ڈالتے۔ اس کے بدن سے اترا پانی قریبی مریدوں کے درمیان تقسیم کیا جانا تھا جو اسے شافی الامراض سمجھتے۔

کلام پاک کا ختم شروع ہوا۔ پیر سائیں کو نہلانے دھلانے کے بعد سوتی کفن پہنا

کر رب ذوالجلال کے سامنے حاضری کے لئے تیار کر دیا گیا تھا۔ روح کیوڑہ کی موت یاد دلانے والی گاڑھی خوشبو فضا میں پھیل گئی۔ غسل کے بعد جب اس کی کھاٹ دالان میں رکھی گئی تو آہ و فغاں یوں بلند ہوئی جیسے پورا جہان لُٹ گیا تھا۔

غیر یقینی کی ایک گہری کیفیت چار سو چھائی ہوئی تھی۔

پیر سائیں مردہ؟

اس کا تصور ممکن نہ تھا۔

لیکن وہ سرخ گلاب کے ڈھیر تلے چت پڑا تھا اور بہت دور جہاں تک نگاہیں کام کرتی تھیں عورتیں اس کے ارد گرد دائرے پہ دائرہ ماتم کناں تھیں۔ اضطراب اور شور و غوغا کے اس گرد باد میں مجھے تیمبڑی ابھرتی دکھائی دی۔ اس نے مجھے دیکھا اور یوں غائب ہو گئی جیسے قبل از وقت پیدا ہونے والی کوئی روح لوٹ جاتی ہے۔

اماں سائیں کے لئے راستہ بنایا گیا۔ میں لڑکھڑاتی ہوئی اُٹھی اور اُن کے پہلو میں جا کھڑی ہوئی۔ ہم سب کی نگاہیں اُس کے سپاٹ مردہ چہرے پہ مرکوز تھیں۔ وہاں اذیتوں بھری ہماری رات کی کوئی گواہی نہ تھی۔

تیمبڑی مجھے پھر دکھائی دی۔ وہ دن بھر مجھ سے چھپنے کی کوشش میں رہی تھی، لیکن اس لمحے جیسے اتنے ہی تردّد سے وہ میری توجہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس کی دلدوز چیخیں دیکھتے ہی دیکھتے پوری فضا پہ حاوی ہو گئیں۔ ہجوم کو چیرتے ہوئے وہ آگے بڑھی اور پیر سائیں کی چارپائی سے لپٹ گئی۔

میرا خاوند تیمبڑی پہ بہت مہربان تھا۔ تین سال کی عمر سے جب وہ یتیمی کے عالم میں حویلی پہنچی اسی کے زیر سایہ رہی تھی۔ وہ گیارہ سال کی ہوئی تو اُسے ذاتی خادمہ کا بلند رتبہ عطا ہوا۔ رفتہ رفتہ وہ اس کے ایسے قریب ہو گئی جیسے کوئی دوسرا نہ تھا، لیکن اسے اتنی سوجھ بوجھ تو تھی کہ آج توجہ کا مرکز نہ بنتی۔ آخر نوکرانیوں کو گھروالیوں سے بڑھ چڑھ کے بلند آواز میں رونے دھونے کا کیا حق پہنچتا تھا۔ جذبات کے اس بھرپور اور کھلم کھلا اظہار پہ مجھے واقعتاً بہت غصہ آیا۔ میں بہر حال اس حالت میں نہ تھی کہ اسے کوئی دلاسہ دیتی یا مستقبل کے بارے میں اس کے ذہن میں جنم لیتے ممکنہ اندیشہ ہائے دور دراز کا مداوا کر سکتی۔ میں تو خود اپنی ذات میں عدم تحفظ کے احساس کا شکار تھی۔

غروبِ آفتاب سے کچھ پہلے میرے بیٹے راجہ جی کی آواز آئی، "اماں اب خدا حافظ کہہ لو، بابا کے جانے کا وقت آن پہنچا۔"

اماں سائیں کے ہاتھ دعائے خیر کے لئے اُٹھ گئے۔ پیر سائیں کی میت فضا میں بلند ہوئی۔ وہ میرے خاوند کو لے چلے تھے۔ میں اس کی چارپائی کے پیچھے چل رہی تھی۔ برہنہ پا عورتیں پتنگوں کی طرح مالک کی میت کے پیچھے جھول رہی تھیں۔ پھر وہ اُن کی پہنچ سے دور ہو گئی۔ حویلی کا بیرونی دروازہ عورتوں پہ بند کر دیا گیا، لیکن مردوں اور عورتوں کی آہ و بکا اس تقسیم کی نفی کرتی ہوئی دیواروں کے اوپر آپس میں گھل مل رہی تھی۔ میں نے چیل کی عقابی نگاہیں خطرناک انداز میں اپنے اوپر مرکوز پائیں۔ اس کے بازو ہمیشہ کی طرح سینے پہ بندھے تھے۔ ہمیشہ کی طرح وہ اس وقت بھی چغلی لگانے کے لئے کسی خبر کی تلاش میں تھی، لیکن کس کو؟ مالک تو مر چکا تھا۔

باہر گہرے صدمے کا عالم تھا۔ پیر سائیں کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح چار سو پھیل گئی تھی۔ سوگواروں کے گروہ ملک کے طول و عرض سے چلے آ رہے تھے۔ وہ شخص جوان کے اور خدا کے درمیان وسیلہ تھا چل بسا تھا۔ اب راجہ جی کو پُل بننا تھا۔ نماز جنازہ کی ادائیگی کی آواز آئی۔ قدم اُٹھے، کسی نے زور سے "کلمہ شہادت" کے الفاظ دہرائے۔ قدم اور کندھے بدلنے کی مخصوص سرسراہٹ مسلسل ابھرتی رہی۔ میں جانتی تھی میت ایک سے دوسرے کندھے پہ جا رہی تھی۔ فضا میں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰهِ کی گونج تھی۔

چار دیواری سے باہر کی دنیا میرے لئے انجان تھی پھر بھی رُک رُک کے رینگتے پھسلتے سانپوں جیسی پتلی موڑ کاٹتی وہ پگڈنڈیاں میرے ذہن میں تھیں جن کے پہلوؤں میں کہیں کہیں سوکھی جھاڑیاں تھیں۔ چند جھونپڑے ایک آدھ دُکان، جاگیردار کی وسیع و عریض حویلی، اس کا آموں کا باغ اور حویلی کے ساتھ ساتھ راستے کا لمبا موڑ، دستی نل اور ٹیوب ویل کے پاس سے گذرتے ہوئے جنازہ مقبرے تک پہنچ گیا ہو گا۔

بڑے باباجی کی قبر گنبد کے عین نیچے تھی۔ اس کی بغل میں سات پیروں کے قبے ایک ہی قطار میں تھے۔ قطار کے آخر میں آٹھویں خالی قبر میرے خاوند کی منتظر تھی۔ کچھ ہٹ کے سنگ مرمر کے فرش میں ایک نشان زدہ قطعہ میرے بیٹے کے لئے مخصوص تھا۔

منوں مٹی تلے دفن ہو جانے کے بعد میرا خاوند ہلنے جلنے سے یکسر قاصر ہوتا

لیکن وہ وقت دور نہ تھا جب عقیدت مندوں کے برہنہ پا قافلے دور و نزدیک سے اس کے حضور خدا اور اس کے بندوں کے درمیان وسیلہ بنے رہنے کی تمنائیں لئے پہنچتے۔ یہی کچھ اس کے آباؤاجداد کی قبروں کے ساتھ ہوتا چلا آیا تھا۔

اب لوگ منتشر ہو رہے ہوں گے۔

گرفت کھل گئی تھی۔

پیر سائیں گزر گیا لیکن اس تصور سے اتفاق بڑا مشکل تھا۔ اس کا وجود اتنا غالب رہا تھا کہ زندگی کے دوران ہمیں کبھی بھی اس کے گھر سے غیر حاضر ہونے کا یقین نہ ہوا۔ اس کی گھر اور آستانے سے روانگی ہمارے اعصاب پہ یوں سوار رہتی کہ اس دوران ایک ایک لمحہ ہم اس کی ممکنہ واپسی کے متعلق اندازے لگانے میں ہی بسر کرتے۔ اس کی گاڑی کی جھلک پڑتے ہی دہقان مرد و زن راستے کے اطراف میں چھلانگیں مارتے اپنے ہاتھ سلام و نیاز کے لئے اپنے سروں پر رکھ لیتے۔ وہ اس وقت تک نیم رکوع کے عالم میں رہتے جب تک اس کی کار کے ٹائروں کا اڑایا ہوا گرد و غبار بیٹھ نہ جاتا۔ اندر زنان خانے میں بے چینی اور تشویش کا دور دورہ ہوتا اور میں، میں اس کے قدموں کی چاپ اپنے نہاں خانہ دل میں سنا کرتی۔ آواز جوں جوں قریب آتی مجھے یوں لگتا جیسے وہ میرے دل کو کچلتے مسلتے ہوئے چلا آ رہا ہو۔

دن کبھی اتنا گرم نہ ہوا تھا۔ بدن جھلسے جا رہے تھے جیسے ان سب کو جو پیر سائیں کے بعد زندہ رہ گئے تھے جل مرنا چاہیئے تھا۔ پسینے میں ڈوبی ہوئی سینکڑوں عورتیں اپنے ارد گرد بھنبھناتی چہروں سے چپکتی مکھیوں کو اُڑانے کے لئے ہاتھ چلا رہی تھیں۔ ہم سب گویا دیگوں میں پگھلائے اور کشید کئے جا رہے تھے۔ زمین کے بطن سے لپکتی آگ ہماری روحوں کو بھسم کیے دے رہی تھی اگرچہ بظاہر اس میں شعلے تھے نہ دھواں۔

کیا وہ آگ کا ایندھن ہو گیا تھا؟ میں نے سوچا۔

مالک کی موت کے سوگ میں باورچی خانہ تین روز کے لئے ٹھنڈا کر دیا گیا۔ "کوڑے وٹے" کا کھانا اگلے کئی روز تک باری باری بھائیوں کے گھروں سے آتا تھا۔ گوشت شوربے کی سو، زردے کی ان گنت دیگیں اور ڈھیروں ڈھیر روٹیاں تیزی سے ہضم ہو گئیں۔

"اماں تمہیں آرام کی ضرورت ہے ہم جو ہیں تم تھوڑا آرام کر لو۔" بڑی بیٹی گی نے میرے کندھے دباتے ہوئے کہا۔ بہت کچھ سوچتی ہوئی میں اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھی لیکن

دروازہ کھلتے ہی سب کچھ بھلا بیٹھی۔

بہت سی نئی بلائیں سر اٹھا رہی تھیں۔ وہ جو اندر ہی اندر اٹھ رہی تھیں اور وہ جو اندر باہر ہونے کے لئے میری اجازت کی محتاج نہ تھیں۔ دل و دماغ کی شدید مزاحمت کے باوجود میں اپنے وجود کو گھسیٹتے ہوئے وہاں پہنچ گئی جہاں وہ مردہ پڑا رہا تھا۔

ماں دھڑام سے اندر داخل ہوئی۔

"ہائے! میری بچی کا سہاگ جوانی میں لٹ گیا، ہائے حاسد نگاہوں نے اس کا آسمان اس پہ گرا دیا، ماں قربان! میری بچی جیتے جی مرگئی۔" وہ بین کر رہی تھی۔ اس کے عقب میں درجنوں نوکرانیوں میں گھری میری بہنیں بیک زبان آہ و فغاں کرتی اندر آئیں۔

حویلی کی عورتوں کے لئے یہ ہنگامہ یہ بے کلی ایسی تھی، جس نے ان کے روزمرہ کو تو متاثر کیا تھا، لیکن ان کے لئے اس کے کوئی نتائج و عواقب نہ تھے۔ جس دلچسپی اور غور سے وہ میری حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی تھیں وہ بہر حال خطرناک ہو سکتی تھی۔ میرے صبر، اور خاموشی کو کوئی اور معنی پہناتے ہوئے وہ حویلی کو میرے خلاف ان سازشوں کا چھتا بنا سکتی تھیں جس کا وہ سب حصہ ہوتیں۔ میں نے اُن سب سے کہیں بلند آواز سے چیخنا چلانا اور بین کرنا شروع کر دیا۔

میری ماں کے آنسو حقیقی تھے۔ یہی بات میری بہنوں پہ بھی صادق آتی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر میرے خاوند کی دریادلی کے تذکرے کر رہی تھیں "ان جیسے انسان ہر روز کہاں جنم لیتے ہیں، وہ ہمیں موسم کا پھل اور میوہ بھیجنا کبھی نہ بھولے، اور ہاں اناج اور چاول کا حصہ۔" وہ رو رو کے خدا سے اس کے لئے ابدی سکون کی دعائیں کرتی رہیں۔

جب کبڑی نے انہیں دلاسہ دیتے ہوئے کہا "غم نہ کرو پیر سائیں کی قبر قیامت تک ہم پہ سایہ کرے گی، سائیں خود ہمارا نگہبان ہوگا۔" تو میں لرز کے رہ گئی۔

ماں ایک لمحے کے لئے بھی میرے خاوند کی تعریفیں کرتے نہ تھکی۔ راجہ جی کا نام لیتے ہوئے اُس نے اپنی چھاتی پہ زوردار دوہتڑ مارا "ہائے قیامت! میرا نواسہ سہرے کے روز اپنے باپ کی شفقت سے محروم ہوگا، کیا المیہ ہے کبھی نہ ختم ہونے والا، ہم لٹ گئے ہم لٹ گئے۔" کمرے میں موجود عورتیں ماں کے بین سنتے ہی ایک بار پھر تڑپ اُٹھیں۔ دکھ درد کے اس تسلی بخش اظہار کے بعد میرے میکے کا ٹولہ میری ساس سے تعزیت کے لئے چل دیا۔ میں

نے دروازہ بند کرتے ہوئے چابی گھما دی۔

پھر تنہا ..... میں نے ڈر اور خوف کا سامنا کرنے کی کوشش کی اور اپنے آپ کو سمجھایا کہ اسے سبز مرچوں کی طرح کھا کے ختم کیا جا سکتا تھا۔ گرم تیز، تیز تر اور پھر ختم۔ اسے چھوؤ اور چکھ ڈالو، میں نے اپنے آپ کو مشورہ دیا۔

میرا سر تکیے پر تھا۔ کوئی سرد لہر تیز دھار برچھی کی طرح میری ریڑھ کی ہڈی کے اندر اوپر نیچے لپکی۔ میں نے آنکھیں سختی سے میچ لیں، لیکن اس کے کانوں سے رستے خون کی سرخ دھاریں میرے ذہن میں بارود کی آگ کی طرح بھڑک اٹھیں۔ میری آنکھیں پھٹ گئیں۔

میرے اوپر چھت کا پنکھا بالکل ویسے ہی ساکت اور بے حس و حرکت تھا جیسے اس کی لاش۔ اب اس میں میرے سکوت کا عکس تھا۔

میں چھلانگ مارتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے انگیا سے ایک اور سگریٹ نکال کر سلگایا اور زور کا کش لیا۔ کچھ خوف تو دھوئیں کے ساتھ نکل گیا۔

دوبارہ لیٹتے ہوئے میں نے خوف پہ غالب ہونے کی نئے سرے سے کوشش کی، ساکت رہو ..... ہلو مت ..... ڈرو نہیں، میں اپنے آپ سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔ لیکن یہ کیا ..... میں تو جیسے اس کی میت میں ڈھل رہی تھی۔ ایک بار پھر چھلانگ لگا کر میں سوچ رہی تھی ان بھیانک سوچوں سے نجات کے لئے میں کہاں جا سکتی تھی۔ میرے اپنے اندر فرار کے لئے کتنی گنجائش تھی۔

میں نے اپنے آپ کو دائیں بائیں اوپر نیچے دیکھنے سے روک دیا "باہر مت دیکھو، اندر مت دیکھو" میں نے اپنے آپ کو سمجھایا لیکن ماضی حاوی رہا، حال طلوع نہ ہو سکا۔

اس وقت نہیں۔

اس وقت تک یہ ناممکن رہا جب تک میں کسی اور وقت اور دور میں واپس نہ لوٹ گئی ان حالات میں جو اس سے قبل مجھ پہ بیت چکے تھے۔

باب ۲

بابل کا گھر

"ہیر" عقب میں میری سہیلی چاندی کی آواز ابھری۔ میں نے پیچھے مُڑتے ہوئے اپنے برقعے کی پتلی نقاب میں سے دیکھا اور میری نظریں گاڑی کے سٹیرنگ پہ بیٹھے شخص کی مقناطیسی نگاہوں میں جکڑی گئیں۔ "تمہیں اچھا لگا" اس نے پُرجوش انداز میں میری توجہ اپنی طرف کرتے ہوئے پوچھا "میرا سب سے بڑا بھائی ہے، اس نے تمہاری تصویر دیکھتے ہی کہا تھا یہ تو جھنگ والی ہیر سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ وہ تمہیں اپنی دلہن بنانا چاہتا ہے۔ کیسا ہے؟ ہے نا ہینڈسم؟"

سُنی ان سُنی کرتے ہوئے میری آنکھیں زمین میں گڑ گئیں، میرا چہرہ حیا سے لال ہو رہا تھا اور میں اُس کے سوال کے جواب اور اپنی رنگت دونوں کو چھپانا چاہتی تھی۔ "اگر کسی نے سُن لیا تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔" میں نے جی کڑا کرتے ہوئے کہا۔

میرے ہاتھوں میں ایک گلابی لفافہ تھماتے ہوئے وہ ہنس دی "کسی کو خبر نہ ہو گی۔ وعدہ، میں کسی کو نہ بتاؤں گی، یہ لو اس نے ایک خط اور تصویر تمہارے لئے دی ہے۔" میں ہچکچائی لیکن اندر سے میں اس کے لئے جیسے مری جا رہی تھی۔

میں اگلے لمحے پڑھ رہی تھی "تم ہیر کی طرح خوبصورت ہو، تمہارا حسن اسی کی طرح افسانوی ہے اور میں تمہارا رانجھا ہوں۔"

وہ کالج ختم کرنے کے ساتھ ہی مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اچٹتی ہوئی ایک نگاہ میں نے تصویر پہ ڈالی۔ وہ سرخ سوئیٹر پہنے کار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ پس منظر میں دلفریب پہاڑی سلسلہ تھا۔ اچانک مجھے چاندی کی پُرتجسس نگاہوں کا احساس ہوا جو مجھ پہ مرکوز تھیں۔ خط اور تصویر تیزی سے دوبارہ لفافے میں رکھتے ہوئے میں نے ایسا تاثر دینے کی کوشش کی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا، لیکن میری آنکھوں میں لاکھوں ستارے ٹمٹما اُٹھے تھے اور میرا دل وہ گیت گا رہا تھا جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہ سُنے تھے۔

دن بھر میں پیار کے سپنوں میں کھوئی رہی۔ یہ تصور کرتے ہوئے کہ پہلی تنہائی میں وہ مجھے کیا کہے گا میں لال گلابی ہو رہی تھی۔ یہ سب قابو سے باہر ہوا جا رہا تھا، مجھے یہیں

رک جانا چاہیئے تھا، لیکن اب یہ میرے بس میں کہاں رہا تھا۔ وہ اچانک میرے وجود اور میری پوری کائنات پہ چھا گیا تھا۔

کھانا وقت اور توجہ کا ضیاع ثابت ہونے لگا، میری بھوک ختم ہو گئی۔ کلاس روم میں میری ٹیچر نے مجھے ڈانٹا "لڑکی توجہ کرو، تم پھر کہاں کھو گئی ہو۔" ایک دوسری استاد نے کہا "میں پچھلے دس منٹ سے کھپ رہی ہوں اور تم نے ایک لفظ تک نہیں سنا۔" بالآخر مجھے کلاس چھوڑ دینے کو کہہ دیا گیا۔ آخرکار گھنٹی بجی اور میرا امتحان ختم ہوا۔

ہمارا فلیٹ ایک تنگ سی گلی میں تھا جو گنجان آباد شہر کے مرکز میں واقع تھی۔ گلی پیدل چلنے والوں اور دن رات دیواروں سے ٹیک لگائے گپیں ہانکنے والوں سے کبھی خالی نہ ہوتی۔ بچے پہل دوج یا گشتی میں مصروف ہوتے۔ عورتیں دروازوں کے باہر بیٹھی دالیں صاف کر رہی ہوتیں یا مٹر نکال رہی ہوتیں۔ یہاں ہر کوئی تنگ دست تھا لیکن یہ تلخیٔ اوقات ان لوگوں کے چہروں سے مسکراہٹیں نہ چھین سکی تھی۔ میرے والد زندہ تھے تو میں نے ان سے ان لوگوں کی خوشیوں کا راز پوچھا تھا۔ بابا نے جواب دیا تھا "یہ لوگ دولت اور طاقت کے مسخ کر دینے والے دکھاوں سے آزاد ہیں۔"

وہ گلی جہاں میں رہ رہی تھی نہ تو پکی تھی، نہ صاف اور نہ ہی ہموار۔ بارش کے دنوں میں ہم لوگ اپنی ڈھیلی ڈھالی شلواریں پنڈلیوں سے اوپر اٹھائے گدلے پانی کے ان جوہڑوں سے گذرتے جو جلد ہی مچھروں کی افزائش گاہوں میں بدل جاتے۔ بالغ افراد بہتی ہوئی نالیوں کو پھلانگنے کی کوشش میں ہوتے، لیکن بچے چھینٹے اُڑاتے ہوئے یہ تاثر دیتے جیسے وہ پیراکی میں مصروف ہوں۔

تیسری منزل پہ ہمارے فلیٹ کا دروازہ اسی گلی میں کھلتا تھا۔ یہ ہر وقت چوپٹ رہتا تھا اگرچہ اس پہ ایک چک لٹکی ہوتی جو ہمیں راہ گیروں کی نظروں سے بچاتی۔ گھسے ہوئے کناروں والی تنگ و تاریک سیڑھیاں اوپر ایک دروازے تک جاتی تھیں جس پہ ہمیشہ کنڈی لگی رہتی۔ میں نے دستک دی تو میری چھوٹی بہن چُھٹکی نے دروازہ کھولا۔ دروازہ کُھلتے ہی میں بالاخانے سے گذرتی باتھ روم کی طرف دوڑی۔

میری ماں نے کہیں سے آواز دی "کچھ اور کرنے سے پہلے آؤ اور مجھے سلام کرو۔" باتھ روم کو مقفل کرتے ہوئے میں جواباً چلائی "ایک منٹ ماں" اور ساتھ ہی تیزی کے

ساتھ اپنے بیگ میں رکھا اس کا خط نکالا۔ میں رانجھے کا خط پوری احتیاط کے ساتھ پڑھ رہی تھی، اس کی ہینڈ رائیٹنگ کتنی خوبصورت تھی! بار بار اس کی تصویر پہ ستاروں کی طرح نظریں جمائے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔ یہاں تک کہ دروازے پہ دستک نے مجھے اس کے حصار سے نکال دیا۔

"جلدی سے نکل آؤ، ماں تمہیں بُلا رہی ہے" چھٹکی کہہ رہی تھی یہ سوچتے ہوئے کہ ہمارے لئے وقت کب آئے گا میں نے اپنے راز اور ہر چیز اپنے بیگ میں ڈالی اور بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بیگ الماری کے دور دراز کونے میں دباتے ہوئے اسے تالا لگایا اور چھلانگ مارتی ماں کے سامنے حاضر ہو گئی۔ خدا جانے وہ کب سے میرے عقب میں کھڑی تھی۔ غصے میں بپھری ہوئی وہ مجھے شک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے میرے سامنے سوالوں کا طومار کھڑا کر دیا۔

"تمہارے کیا ارادے ہیں؟ تم ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہو میں بلاؤں تو تم پہ اثر ہی نہیں ہوتا۔ کیا یہ اس لئے کہ اب تمہارا باپ سر پہ نہیں رہا اور میں بیوہ ہوں اور تم میری وہ عزت نہیں کر سکتیں جو اس کی زندگی میں تھی؟"

ایسا پھر نہیں ہو گا، میں نے سوچا ماں اپنے مقام کے بارے میں مالیخولیا کا شکار تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ سال بھر قبل بابا کی موت کے بعد یہ ہر ایک کی نظروں میں گر گیا تھا۔ اسے بازوؤں سے تھامے ہوئے میں نے یقین دلایا کہ ایسا ہرگز نہ تھا اور ساتھ ہی اسے اوپر بالاخانے کی چھت پہ لے گئی۔ ماں کو الماری میں رکھے ٹِک ٹِک کرتے بم سے دور رکھنا ضروری تھا۔

اللہ کا شکر ہے اس کا مشکوک ذہن بہت دور تک نہ گیا تھا، رہا میرا بیگ کھلوا کر اس کی جانچ پڑتال کرنا تو وہ تو اس کے لئے معمول کی بات تھی۔

"اپنی آئندہ نسلوں کو عورت ذات کی کسی غلط حرکت کے باعث پہنچ سکنے والی بدنامی اور ذلت سے بچانے کے لئے یہ ضروری ہے، عورتوں کو اسی لئے تو لعنت سمجھا جاتا ہے۔" وہ ایک ہی سانس میں کہتی۔

آج گھر کچھ مختلف نظر آ رہا تھا معمول سے کہیں صاف ستھرا اور نفاست بھرا۔ میں نے گلاب کے سرخ پھولوں سے بھرے گلدان کے نیچے بچھے کشیدہ کاری سے مرقع میز پوش کو

دیکھا۔ میز کے ہر دو اطراف پڑی چاروں کرسیاں تازہ پالش کی ہوئی تھیں۔ ان کی بید مرمت شدہ دکھائی دے رہی تھی۔ میرے چودہ سالہ بھائی کے ہاتھوں میں بیکری کے ڈبے تھے۔ چھٹکی اور گیارہ سالہ منھی نے پُر جوش انداز میں میری منت کی "آپا آؤ اور ہماری چائے کی ٹرالی سجانے میں مدد دو۔"

"نہیں" میری ماں چلائی "میں نے ہیر سے باتیں کرنا ہیں، ٹرالی تم لوگ خود لگاؤ"

چائے؟ .....

یہاں کیا ہو رہا تھا؟

میں صرف چند گھنٹوں کے لئے ہی تو باہر گئی تھی۔ کون آ رہا تھا ہمیں ملنے؟

میں نے ماں سے پوچھا تو اس نے مجھے اپنے بالمقابل بٹھاتے ہوئے حکم سنایا "کرسی کو ہاتھ مت لگاؤ، تم اسے دھبے لگا دو گی، تمہارے بیاہ کا پیغام آیا ہے، آج شام وہ تمہیں دیکھنے آ رہے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ اور سخت ہو گیا۔

میرے دل کی دھڑکن جیسے بند ہو گئی، رانجھا اتنی جلد میرے ساتھ منگنی کرنا چاہتا تھا۔ میں اوپر دیکھنے کی جرأت نہ کر سکی۔ یقیناً ماں کو یہ احساس تو ضرور ہو جائے گا کہ میں اس معاملے سے بے خبر نہ تھی لیکن مجھے اتنی جلدی کی توقع کہاں تھی۔ سب کچھ آج ہی تو ہو رہا تھا۔ میری زندگی ایک ہی دن میں بدل جانے کو تھی۔

"وہ لوگ بڑے امیر ہیں، ہمارے مقام سے بہت بلند مرتبت ہمارے لئے تو اُن کا یہاں آنا ہی بہت بڑا اعزاز ہوتا، اپنی طرف تو دیکھو" اُس نے ہاتھ اپنے گھر کی طرف لہراتے ہوئے کہا" ہمارے پاس انہیں دینے کے لئے یہاں کیا رکھا ہے؟" ..... پھر اُس نے اس سوال کا جواب بھی خود ہی دے دیا" یہ صرف اس لئے ہے کہ تم اتنی حسین ہو۔"

ماں کی زردی مائل سفید رنگت اس کی چمکدار عنبریں آنکھوں کے اردگرد بھڑک اُٹھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے اتنا مشابہہ تھیں کہ اگر میں اس کی جوانی تو وہ میرے مستقبل کی تصویر تھی۔

"یہ ہمارے پیر صاحب کی دین ہے۔" اُس نے یہ اعلان کرنا بھی ضروری سمجھا۔ وہ پیر کی کرامتوں کے قصے سنتے سنتے اس کی مرید ہو گئی تھی۔ اس کے دور دراز واقع گاؤں کے پچھلے سفر پہ وہ ہم تینوں بہنوں کو بھی ساتھ لے گئی تھی، وہاں پہنچ کر اس نے ہمیں تاکید

کرتے ہوئے کہا تھا "تم سب کو پیر سائیں کے سامنے نقاب ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں، وہ مُقدس ہستی ان باتوں سے بالاتر ہے۔"

پیر کا حُجرہ توجہ کی منتظر عورتوں اور فرش پہ آلتی پالتی مارے بچّوں سے بھرا ہوا تھا۔ عطا ہوئے تھوڑے سے وقت میں ماں کو اپنے بہت سے مسائل پہ بات کرنا تھی۔ اُس نے روتے ہوئے عرض کی کہ وہ اس کی بیٹیوں کے لئے اچھے رشتوں کی دعا کریں۔

"سائیں، دعا کرو میرے ناتواں کندھوں سے ان لڑکیوں کا بوجھ اُتر جائے۔" وہ مسلسل التجائیں کر رہی تھی اور پیر نے باری باری ہمارے سروں پہ دستِ شفقت رکھا۔ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے اُس نے کہا "اس کا حسن بے مثال ہے، یہ تمہارے لئے بوجھ نہیں ہو گی" ماں خوشی سے جھوم گئی۔ مُقدس ہستی نے پیشین گوئی کر دی تھی، اور اب وہ اس کے پورا ہونے پر جذبات سے مغلوب ہو گئی۔ "وہ پاک نسل گھرانہ ہے۔" اس نے بے اختیار کہا۔

میری دوست چاندی نے بھی یہی بتایا تھا۔ ماں کی آواز امتیازی طور پہ مترنم سی ہو گئی۔ "اس نے آج تک شادی نہیں کی، کوئی اس قابل تھی ہی کہاں وہ تم سے بڑے ہیں شاید اٹھارہ سال یا کم یا زیادہ" اس کی مجھے خبر نہ تھی۔ میرا خیال تھا رانجھا اس سے بہت چھوٹا تھا، ابھی کالج میں ہی تو تھا۔ "وہ شدت سے پردے کے قائل ہیں، بڑے دین دار ہیں، گاؤں میں رہتے ہیں آخر وہ اس غلیظ شہر میں کیوں رہیں جب کہ وہاں ان کی اپنی بادشاہی ہے۔" اس نے فخریہ کہا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔ میں اُسے نہیں سن رہی تھی۔ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ کیا چاندی کے گھر والے بھی پردے کی پابندی کرتے تھے؟ کیا وہ گاؤں میں ہی رہتے تھے؟

ماں اپنی کہے جا رہی تھی۔ "ہم بہت خوش نصیب ہیں تمہارے باپ کی موت کے بعد تو لوگوں نے ہمیں صفر ہی کر دیا تھا۔ تمہارے بیاہ سے سوسائٹی میں ہمارا وقار بحال ہو جائے گا۔ تمہاری بہنوں کی اچھی اچھی جگہوں پہ شادیاں ہوں گی، تمہارے بھائی کو اچھی لڑکی اور اعلیٰ روزگار ملے گا۔ ہمارا مقام بہت بلند ہو جائے گا۔ مجھے تو اس کا نام بھی پسند ہے۔ کتنا باوقار اور بھاری بھر کم سا سنائی دیتا ہے۔" اور بالآخر اس نے نام لے ہی لیا۔ اب میں اوپر دیکھ سکتی تھی۔ "میں اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں۔ میں ابھی شادی نہیں کروں گی" میں نے تیزی سے کہا۔

میرا خیال تھا تب تک رانجھا رشتے کے لئے آ جائے گا اور ماں اُن کے بجائے اس کو منتخب کرے گی، لیکن ماں تو غصے میں پاگل ہو گئی۔

"لڑکی، تم اتنی خود غرض کیسے ہو سکتی ہو، تمہیں اپنے بھائی اور بہنوں کے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو نبھانا چاہیئے تم اب پندرہ سال کی ہو گئی ہو، ہمیشہ کے لئے یوں ہی گھر میں تو بیٹھی نہیں رہ سکتی۔ نوجوان لڑکیوں کو منسوب ہوئے بنا نہیں رکھا جا سکتا۔ میں ہاں کر رہی ہوں پھر میرے پاس تمہیں تعلیم دلانے کے لئے کوئی پیسے نہیں۔" باب بند کر دیا گیا۔

ماں نے میرے لئے جیون بھر کی راہ کا حتمی انتخاب کر لیا تھا۔

"کپڑے پہنو اور اپنے بُجھے سے چہرے کو دھو ڈالو۔ اس حالت میں تم عمر رسیدہ نظر آ رہی ہو" ماں نے کہا اور مجھے خبردار کیا "اگر تم حسین دکھائی نہ دیں تو وہ تمہیں اور تمہارے ساتھ ہمیں بھی مسترد کر دیں گے۔"

میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ الماری کی طرف آئی۔ چاندی کو اطلاع دینے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ پہلے ہی بہت دیر ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو باتھ روم میں مقفل کر کے رانجھا کی تصویر نکالی۔ میں اس کے تصور کو دھندلا جانے سے بچانا چاہتی تھی۔ جب وہ میرے ذہن پر اچھی طرح نقش ہو گیا تو میں نے خط اور تصویر دونوں کے پرزے پرزے کر ڈالے۔ میرے سپنے فلش کے گرداب میں ابھرتے ڈوبتے بہہ گئے۔ ہمارا پیار پہلے ہی روز مر جانے کے لئے وجود میں آیا تھا۔ مقدر مجھے کہیں اور سے آواز دے رہا تھا۔

چونکہ لڑکیوں کو ایسے مواقع پہ سر اُٹھانے کی اجازت نہیں ہوتی، میں پیر سائیں کے گھر والوں کو نہیں دیکھ سکی، ہاں کسی کو یہ کہتے ہوئے ضرور سنا "اسے سخت پردہ کرنا ہو گا۔ ہماری خاندانی روایات پرانی ہیں وہ بدل نہیں سکتیں۔ اُسے اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھالنا ہو گا۔" کسی اور نے کہا۔ "ہیر بڑے مقدروں والی ہے، تم بہرحال ایک غریب بیوہ ہو۔ تمہاری بیٹی کی بہت سی نوکرانیاں ہوں گی جو اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھیں گی۔"

اس وقت ماں کو کوئی توہین محسوس نہ ہوئی جب ایک اور آواز آئی۔ "پیر سائیں کی پہلی دونوں بیویاں ہمارے اپنے خاندان میں سے تھیں۔ یہ اللہ کی منشاء تھی کہ ہم یہاں پہنچے۔ ورنہ ہم تو اپنے خاندان سے باہر بیاہ نہیں کرتے۔ یہ بڑا غیر معمولی واقعہ ہے۔"

مجھے تیسری بیوی ہونے کے صدمے کا احساس کرتے ہوئے ماں نے فوراً میرے کان میں سرگوشی کی، "دونوں مر کھپ چکی ہیں۔"

باورچی خانے میں ماں نے منھی کو چپت رسید کی۔ وہ سموسوں سے نچڑتے ان کے

فالتو تیل کو الگ نہ کر سکی تھی، پھر پُر جوش انداز میں وہ میری طرف پلٹی، "سناتم نے ..... اب تو تمہیں احساس ہوا ہو گا یہ کتنے بڑے لوگ ہیں۔ تمہاری شادی ایک ایسے گھرانے میں ہو رہی ہے جس پہ اللہ کا بے پایاں فضل و کرم ہے۔ کیا اعزاز کی بات ہے۔ ہم اس قابل کہاں تھے، ہمارے نصیب بدل گئے۔ اب ہم چند بڑے خاص لوگوں میں سے ہیں۔"

ماں کے لئے اپنے جذبات پہ قابو پانا مشکل ہو رہا تھا، لیکن اس کیفیت نے اس کی چائے کی ٹرالی سجانے کی تشویش پہ کوئی اثر نہ ڈالا۔ وہ بدستور برقرار رہی۔ اپنے ہاتھوں گرے دودھ کے لئے منّی کو ملامت اور پھلکی کو کوسنے کے درمیان تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

"میں اس کے قریب کیسے بیٹھوں گی؟ میں اسے کیا کہوں گی؟ میرا پیر اب میرا داماد بن رہا ہے۔ یا اللہ! میں تو اس کی موجودگی میں کرسی پہ بیٹھنے کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

مہمانوں کی رخصتی تک میری بے دم ماں نے میرے مقدر پہ اپنی مہر ثبت کر دی تھی۔ اب صرف شادی کی تاریخ طے کرنا باقی تھا اور وہ ہمیں ہفتے بھر کے اندر کر کے انہیں اطلاع دینا تھی۔

اگلے روز میں نے اسکول جانے کے لئے ہزار جتن کئے، لیکن ماں نے سُنی ان سُنی کرتے ہوئے کہا، ہمارے پاس اب اسکول کے لئے کوئی وقت نہیں، ہمارے کندھوں پہ پہاڑ اُتر آیا ہے۔ میرے دولہا کے رتبے اور مقام نے ہمارے لئے بہت سے مسائل کھڑے کر دیئے تھے۔ اپنی غربت کو چھپانا تو مشکل تھا ہی اس کے معیار پہ اتر سکنا تو بالکل ہی ناممکن تھا۔

ماں کی جمع کردہ سب ہی پونجی میری شادی پہ خرچ ہونا تھی جس کے بعد اس کے پاس کچھ بھی نہ بچتا، سب سے اہم اور سب سے زیادہ اخراجات پیر سائیں کے اہل خانہ کے لئے تحفے تحائف پہ اُٹھنا تھے۔ وہ وسیع الاعیال خاندان تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ میرے جہیز کے مقابلے میں ماں کو ان پہ زیادہ خرچ کرنا تھا۔

وہ پریشانی کے عالم میں بولی "ہیر کی قدر و قیمت اس کے جہیز کے برابر ہو گی۔ سسرال میں کسی لڑکی کی عزت اتنی ہی ہوتی ہے جتنا کچھ وہ اپنے باپ کے گھر سے اپنے ساتھ لاتی ہے۔"

اگرچہ میں کم یا زیادہ کے چکر میں نہیں اُلجھی لیکن ماں دیوار کے ساتھ بلند ہوتے میرے جہیز کے ڈھیر کو دیکھتی تو اس کا بلڈ پریشر شرمندگی سے گر جاتا اور یہ ہر وقت، مسلسل ہو رہا تھا۔

جب پیر سائیں کے گھر والے بیاہ کی تاریخ پکی کرنے آئے تو وہ اپنے ساتھ اس کی تصویر بھی لائے۔ کھی کھی کرتی اس کی ایک بھتیجی نے میرے کان میں سرگوشی کی "یہ انہوں نے صرف تمہارے لئے بھیجی ہے۔" اب میرا زیادہ وقت اس کو دیکھنے میں صرف ہونے لگا، اگرچہ پیر سائیں تصویر میں ہینڈسم لگتا تھا۔ میرے لئے یہ تعجب کی بات تھی کہ جب ہم ملے تو اس نے ایسا کوئی تاثر مجھ پہ نہ چھوڑا تھا۔

میں یہ بھی سوچتی تھی کہ اس کی دونوں بیویاں کیسے مرگئیں، چند روز بعد پیر سائیں بنا اطلاع ہمارے دروازے پہ آ پہنچا اور ماں تو خوشی سے پاگل ہو گئی۔

دروازے میں چابی کے سوراخ سے میں نے اپنے منگیتر کو دیکھا۔ وہ تیر کی طرح سیدھا کھڑا تھا کسی درخت کی طرح لمبا۔ کلف دار سیاہ عمامہ اس کے سر پہ بکھرا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرمے کی گہری لکیریں تھیں۔ اور ان کی پتلیوں میں عجیب و غریب سی روشنی جل بجھ رہی تھی۔ دونوں آنکھوں کے ڈھیلے بنا احساس ہلتے اور بڑے ڈراؤنے انداز میں کھلتے اور بند ہوتے تھے۔

دو سیاہ ابروؤں کے درمیان پیشانی کی طرف عمودی کھڑی تیوری کی گہری لائنیں مجھے دکھائی دیں۔ ایک عقابی ناک چہرے پر بڑی رعونت کے ساتھ ایستادہ تھی اس کے لب مشکل سے ہی دکھائی دے رہے تھے اور باقی چہرہ جس پہ خوشی اور مسرت کا کوئی نشان نہ تھا سیاہ بالوں میں چھپا ہوا تھا۔

اس اثناء میں ماں باورچی خانے کے اندر باہر بھاگتی اس کے لئے اور اس کے درجن بھر ساتھیوں کے لئے مشروبات تیار کرنے میں لگی رہی۔ اس کے ساتھی باہر ہی کھڑے رہے کیونکہ گھر میں اُن کے حسب حال کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں انہیں بٹھایا جاتا۔

میرے منگیتر کی واپسی تک ماں تھک ہار کے بدحال ہو چکی تھی۔ "میرے کندھے دباؤ اگر تمہارے والد زندہ ہوتے تو یہ بوجھ مجھے اکیلے برداشت نہ کرنا پڑتا، اوہ خدایا! مجھے یہ سب کچھ نبٹانے کے لئے تمہارے باپ کی کتنی ضرورت ہے، وہ کتنے مناسب طریقے سے یہ

امور سنبھالتے۔"

مجھے اپنے ہونے والے خاوند کی یہ ادا بڑی پسند آئی کہ اس نے میری دونوں بہنوں کی پیشانیوں پہ بوسے دیئے تھے اور بھائی سے بھی خوش اخلاقی سے پیش آیا، اگرچہ ان کے بقول اس کی حس مزاح بڑی خشک سی تھی لیکن میں نے کوشش کی کہ میں اسے باوقار قرار دیتے ہوئے پسند کروں۔ مجھے کسی نہ کسی شے کے لئے تو اسے پسند کرنا ہی تھا۔ پھر جب ان سب نے مجھے یہ کہتے ہوئے چھیڑنا شروع کیا کہ "ایک ماہ کے اندر تم شہزادی بن جاؤ گی" تو پھر تو مجھے اس کے سخت رویئے کو بُھلا دینے کے لئے ہر جواز مل گیا۔

شادی سے سات روز پہلے میری سہیلیاں اور گھر والے مجھے، مایوں، بٹھانے کے لئے اکٹھے ہوئے۔ یہ میرے حسن کو مزید نکھارنے کا دن تھا اگرچہ یہ مہنگی عیاشی تھی، لیکن اس کے باوجود انہوں نے میرے بدن پہ دودھ، بادام، ہلدی اور عطر گلاب پر مشتمل ابٹن ملا۔ میرے بدن پہ اس وقت تک مالش کی گئی جب تک وہ سارا مرکب جذب ہو کر میری جلد کو بالکل ملائم نہ کر گیا۔ ایک اور بڑے قیمتی گندھے ہوئے ملغوبے سے میرے چہرے پہ مالش کی گئی۔ بعد میں اسے دودھ سے دھویا گیا اور یوں میں اور بھی گوری دکھائی دینے لگی۔ مایوں کے بعد شادی کے دن تک میری جاننے والی تمام لڑکیاں سرشام ڈھولک کے اردگرد اکٹھی ہو کے بیاہ کے گیت گاتی رہیں۔ اس دوران میں فرش پہ آلتی پالتی مارے پیچ و تاب کھاتی رہتی۔

چاندی بھی آئی لیکن رانجھا کا کوئی ذکر نہ ہوا۔ وہ اس دولہا کے متعلق بھی اتنا ہی خوش نظر آئی جتنا وہ اس کے لئے تھی جو اس کا اپنا تجویز کردہ تھا۔

زندگی کے اسی اچانک موڑ کے بارے میں ہنسی مذاق کرتے ہوئے ہر صبح چھٹکی میرے سر میں مالش کرتی اور ننھی اس کے لئے تیل کی پلیٹ اٹھائے ساتھ ہی کھڑی ہوتی۔ بے ساختہ قہقہوں کا مرکز بہر حال ماں کی ذات تھی جس نے پہلے سے ہی کسی بڑی اہم شخصیت کی طرح اُٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ باقی وقت ہم ان سب لوگوں کی نقلیں اتارنے میں لگا دیتے جنہوں نے ہماری غربت کی وجہ سے ہمیں ذلیل کیا تھا۔

ماں ٹھیک ہی تو محسوس کر رہی تھی۔ وہ تمام رشتہ دار جن کے حالات ہم سے بہتر تھے ہم سے ہمیشہ غیروں کی طرح توہین آمیز برتاؤ کیا کرتے تھے۔ اب وہی لوگ ہم سے اپنے نسلی تعلق کے گیت گا رہے تھے۔ میری مغرور پھوپھی نے جس کا میاں فلور مل کا مالک تھا

میرے جہیز کے بارے میں پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے جڑاؤ زیور کا ایک سیٹ یہ کہتے ہوئے دیا کہ "میرے بھائی کی عزت اور وقار کو ہمیں ہر قیمت پہ قائم رکھنا ہوگا۔"

اب ہم کوئی مسترد شدہ رشتہ دار نہ تھے۔ وہ چھپائے نہ چھپنے والے حسد سے مجھے دیکھتی کی دیکھتی رہ جاتیں۔ کئی ایک سرگوشیاں کرتے ہوئے اپنے "خفیہ" نسخے میرے کانوں میں پھونکتیں "کسی اور کو نہ بتانا، یہ تو صرف ہماری شہزادی کے لئے ہے۔"

یہ ان کے ماضی کے رویوں کے اتنا متضاد تھا کہ میں ماں کی عقل و دانش کی داد دیئے بنا نہ رہ سکی۔

"اپنے آپ کو مت تھکاؤ۔" میری ہر حرکت پہ اِدھر اُدھر چھلانگیں مارتی میری کزن، رشتے کی بہنیں کہتیں "تم اب میری مہمان ہو، کام تو ہم کریں گی۔"

بابا کے انتقال پہ یہ لوگ مہمانوں کی طرح آئے اور جلدی سے چل دیئے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے ہمیں شادی بیاہ پہ بلانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ میرا ہونے والا خاوند میرے تصورات میں خوبصورت تر ہوتا چلا جا رہا تھا اور میں جس طرف بھی مڑ کے دیکھتی قسمت کی دیوی مجھ پہ مُسکرا اٹھتی۔

بوڑھی نائن جو رشتے کرواتی تھی اب ہمیں مبارک باد دینے آئی۔ اس سے پیشتر وہ ہمیشہ ماں سے یہ کہہ کر مزید رقم بٹور لیا کرتی تھی کہ لڑکے کے گھر والے اتنی آسانی سے تو رضامند ہونے کے نہیں۔ انہیں ایک غریب لڑکی بیاہ لے جانے پہ تیار کرنے کے لئے مجھے بہت محنت کرنا پڑے گی، اب ماں کی باری تھی کہ وہ اسے بتاتی "میری دوسری لڑکیوں کے لئے اب مجھے بہترین رشتے ملیں گے۔ تمہاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں اللہ نے بنا خرچ مجھے ایک ایسا داماد دیا ہے۔ ہمیں یقین تھا کہ بڑھیا اب بھی میری شادی کا سہرا اپنے ہی سر باندھے گی۔" ماں نے قہقہہ لگایا "ہماری قسمت کے صدقے اسے کئی اور اچھے گاہک ملیں گے۔"

دولہا نے ہمیں رسم حنا کے لئے اپنے گاؤں آنے سے منع کر دیا۔ ہم سب مایوس تو ہوئے لیکن اس کی خواہش کا احترام کیا گیا۔ اس کی بجائے پیر سائیں کے خاندان کی درجنوں برقعہ پوش عورتیں ہمارے دروازے پہ آ پہنچیں۔ موم بتیوں کی بھڑکتی روشنیوں سے سجی مہندی کی سینیاں اور طباق ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ مٹھائیوں کے ٹوکرے اور کمخواب میں لپٹے سوٹ کیس اس کے مزید عقب میں تھے جنہیں ملازمائیں اٹھائے ہوئے تھیں۔ بالاخانے کی

چھت سفید شٹل کاک برقعوں سے بھر گئی۔ جب مردوں کی آمد و رفت کا خطرہ ٹل گیا تو برقعے اتار دیئے گئے۔ یہاں تک کہ بھائی کو بھی اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔

مجھے صحن کے درمیان پیڑھی پہ بٹھا دیا گیا۔ بھاری کشیدہ کاری والے سرخ دوپٹے سے جھانکتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میں نے زندگی میں کبھی اتنے بھڑکیلے ملبوسات اور اتنے زیورات یوں نہ دیکھے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ اگرچہ مادی حوالوں سے اب ہم اپنی برادری والوں سے تو کہیں بڑھ گئے تھے، لیکن ان لوگوں سے پھر بھی بے حساب کمتر تھے۔ میں نے ماں کے کان میں سرگوشی کی، "تمہیں میری بہنوں کے لئے جہیز نہیں بنانا پڑے گا، میری نئی چیزیں ان کے لئے بھی کافی ہوں گی۔" ماں نے میرے سر کا بوسہ لیا اور بڑبڑائی "میں جانتی ہوں مجھے خبر ہے۔" رسم حنا کے دوران جہیز رسم کے طور پر دکھایا جاتا ہے۔ میری ماں نے اس کا بہتر تاثر دینے کے لئے اسے کمرے میں چاروں طرف پھیلا دیا۔ مہمان عورتیں اسے دیکھنے اندر گئیں تو چھٹکی میری طرف دوڑی آئی "وہ وہاں بہت وقت لگا رہی ہیں۔ اماں دعا کر رہی ہے کہ اللہ اسے انہیں دُگنا کر دکھائے" جب پیر سائیں کی گھر والیاں کوئی تبصرہ کئے بغیر باہر نکل آئیں تو ماں نے اس خاموشی پہ بھی سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا "یہ فراخ دل لوگ ہیں ان کے دل بھرے ہوئے ہیں۔"

میرے ہونے والے میاں کے خاندان کی عورتوں نے ناچ گانے میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ایسا وہ صرف اپنے گھروں میں ہی کر سکتی تھیں۔ یہاں تو صرف ان کی خاندانی میراثنوں نے ہی ڈھولکی پہ گیت گائے اور وہ ان پر کڑکتے نوٹ پھینکنے تک محدود رہیں۔ شادی شدہ عورتوں نے خشک میووں کی مٹھیاں بھر بھر کے میری گود میں ڈالیں۔ کسی بیوہ یا کنواری کو اس رسم میں شامل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ میرے سامنے کھڑی پیر سائیں کی بہن نے دعا پڑھی اور پھر سبز دھاگے والی سوئی پہ پھونک مارتے ہوئے اُسے بڑی مہارت سے میرے نتھنے کے سوراخ میں پرو دیا۔ جب وہ اُسے گانٹھ لگا رہی تھی میں نے آنکھیں جھپکیں۔ میں منسوب تو ہو ہی چکی تھی، اب مجھ پہ مہر بھی لگ گئی تھی۔

دوسری بہن نے میری ایڑی کے نیچے پانچ سو کا نوٹ رکھا۔ جب میں اپنے کمرے میں جانے کے لئے اُٹھی تو اس نے وہ رقم بوڑھے نائی کی بیوی کو دے دی۔ میرے عقب میں کسی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا "شادیوں سے متعلقہ سب ہی پیغام، سندیسے نائنیں ہی لاتی لے

جاتی ہیں۔ دلہن پہ نچھاور کئے جانے والے تمام پیسے اس کی بلاؤں کے صدقے انہیں ہی ملتے ہیں۔"

شادی سے پہلے کے بقایا کئی دن دعوت کے کھانے سے متعلق تشویش کی نذر ہو گئے۔ "صرف چھوٹی عمر کے بکرے ذبح ہوں گے۔ وہ مہنگے ہوتے ہیں، لیکن اپنی قیمت دے جاتے ہیں۔ ہر چیز دیسی گھی میں پکانا ورنہ میری ناک کٹ جائے گی۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔" ماں نے حکم دیا۔

ہماری غربت ہر شے میں عیاں تھی لیکن اس کے باوجود ماں اُسے بری طرح چھپانے کی کوشش میں تھی "قورمے کے لئے ہر بادام کو چکھنا ضروری ہوگا ورنہ سالن کڑوا اور ہمارا نام برباد ہو جائے گا۔"

بادام بہت مہنگے تھے۔ کسی نے سادہ گوشت سالن کی تجویز دی، لیکن ماں جو کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھی فوراً بولی "بادام بادشاہوں کے طعام میں ڈالے جاتے تھے۔ وہ ہر اس کمی کو پورا کر دیں گے جو باقی چیزوں میں دکھائی دے سکتی ہے۔"

میرے سپنے ان حدود کو پار کر چکے تھے۔ میں اپنے گھر کی مالکن بننے کو تھی اور میرے ساتھ میرے خاوند کا نام ہونا تھا۔ ہماری دنیا میں یہ احساس ہر اس شے سے اعلیٰ اور قیمتی تھا جو کوئی عورت حاصل کر سکتی تھی۔

گھر میں آخری دو دن آنے جانے والیوں اور سب کو بغل گیر ہونے اور پیار کرنے میں گذرے۔ میرے گھر والے میرے اچھے مقدر پہ اتنے شاداں و فرحاں تھے کہ میں انہیں ان کی غربت میں چھوڑ کر چلے جانے کے غم پہ اُمڈتے آنسوؤں کو مسلسل پیتی رہی۔

ان کے ساتھ میری آخری رات گویا زمین پہ میری آخری رات تھی۔ ہر کوئی رو رہا تھا۔ دکھ اور خوشیاں گڈمڈ تھیں۔ یہ جنت میں داخلے لیکن دنیا سے رخصتی کی طرح تھا۔ موقع ملنے پر ماں نے مجھے ہر لحظہ سبق سکھائے۔

"اچھی نسل اور اچھی تربیت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے باپ کی لاج رکھنا، ہمیشہ اپنے میاں کی تابعدار رہنا۔ اپنے آپ کو کبھی کسی ایسے معاملے میں نہ اُلجھانا جہاں تمہیں وضاحتیں دینا پڑیں یا شکایتیں لگانا ہوں۔" یہ سب کچھ اتنا مشکل دکھائی نہ دے رہا تھا اور میں نے بار بار اس سے وعدہ کیا کہ میں اسے مایوس نہ کروں گی۔ بابا کی غیر حاضری ہم سب کو بہت

کھلی اور سب ہی روتے رہے۔

اس رات نیند مجھ سے کوسوں دور رہی۔ تھکاوٹ کی وجہ سے میرا چہرہ بُجھا بُجھا رہا۔ میں اس کے بارے میں جتنا سوچتی نیند اتنا ہی دور چلی جاتی۔ ان لمحات میں میں بچپن کی بہت سی یادوں سے گذری، اگرچہ ہم ہمیشہ غربت میں ہی رہے لیکن بابا کی زندگی میں کبھی ایسا محسوس نہ ہوا تھا، چونکہ ہمارا واسطہ اپنے ہی جیسے یا کچھ بہتر لوگوں سے پڑتا تھا اس لئے خواہشیں محدود تھیں۔

مجھے یاد آیا جب قصائی ہمارے لئے گوشت کاٹ رہا تھا جو ماں نے رات کو پکانا تھا، میں کس طرح بابا کا ہاتھ اپنی گرفت میں لئے کھڑی تھی۔ مجھے فروٹ اور سبزی کا کھوکھا یاد آیا جہاں بابا ہر چیز کو دبا کے یہ یقین کر رہے تھے کہ وہ پکی ہوئی تھی۔

چھٹیاں تو ہمیشہ بڑی خاص چیز ہوتی تھیں۔ میں یہ یاد کرتے ہوئے مُسکرا دی کہ اگلی صُبح بابا کے ساتھ کھیل تماشے پہ جانے سے پہلے رات بھر میں اور بھائی کس طرح کروٹیں بدل بدل کے گزارا کرتے تھے۔

پارک میں بھاگ دوڑ کی خوشگوار یادیں، میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہوئے بابا کو کم از کم ایک بار اور کِشتی کی سیر کے لئے کرایہ دینے پر رضامند کرنا جو ہمیشہ اتنی جلد ختم ہو جایا کرتی تھی۔ میلہ، سینما اور سامان سے بھری سینکڑوں دُکانیں جہاں ماں گھنٹوں سودا بازی کے بعد کچھ نہ کچھ طے کر ہی لیا کرتی تھی۔ یہ سب مجھے افسُردہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ میں بابا کو یاد کرتے ہوئے رو دی۔ میں جانتی تھی اگر وہ زندہ ہوتے تو مجھے ضرور کالج بھیجتے۔

وہ کہا کرتے تھے "اگر ہیر نے کہیں اور جنم لیا ہوتا تو بجائے حُسن کے اس کی اعلیٰ ذہانت اس کی پہچان بنتی۔" بابا میرے اسکول کے پراگرس کارڈوں سے اتنا متاثر تھے کہ وہ انہیں ہمیشہ اپنے تھیلے میں رکھتے اور جس سے بھی ملتے اسے ضرور دکھاتے۔

ہم سب ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ بھائی تو سب ہی کا چہیتا تھا، خصوصاً میرا۔ اس سے بچھڑنے کے تصور سے میری آنکھیں بھر آئیں اور مجھے خیال آیا کہ میرا نیا خاندان بھی مجھے اتنی محبت دے سکے گا۔

میں ان کی عظمت اور شاندار ماحول میں کیسے سما سکوں گی؟ میں نے یہ فرض کر لیا کہ مجھے سوائے خوبصورت نظر آنے کے اور کچھ نہیں کرنا ہو گا۔ پیر کی بیوی ہونے کے

فرائض پہلے ہی مجھے مسحور کیے ہوئے تھے۔ میں نے سُنا کہ میرے پاس آنے والے ہر فرد کو میرے پاؤں چھونے ہوں گے۔ مجھے اپنے اور پیر کے درمیان عمر کے فرق کا بھی خیال آیا۔ میں بمشکل پندرہ برس کی ہوئی تھی اور وہ چھتیس کا تھا، بلکہ افواہ تھی کہ وہ چوالیس کا ہو چکا تھا۔ میں نے تصور ہی تصور میں اپنے میاں کو تنہائی میں اپنے قریب دیکھا اور خود ہی سے شرما گئی۔ میں دور ہٹ رہی تھی ..... رانجھا کیوں شعلے کی طرح بجھتا جا رہا تھا؟

اگلی صُبح میرے لئے ایک نئی زندگی کا پیغام لائی جس کے متعلق اس روز میں اتنا کچھ ہی جانتی تھی جتنا ماں کے پیٹ سے نکلنے کے روز۔ پیر سائیں کے گھرانے کی طرف سے شادی کے جوڑے کا سوٹ کیس ہمارے ہاں پہنچا تو ماں نے اسے عزت و احترام سے اپنے بستر پہ رکھا اور باقی سب اُسے دیکھنے ایک ساتھ کھڑے ہو گئے۔ ململ کا بنڈل کُھلا تو سب حیرت زدہ سے رہ گئے۔ جوڑا انتہائی عامیانہ سا تھا۔ ماں نے ہماری توجہ بٹاتے ہوئے کہا "یہ اس خاندان کی عظیم مذہبی روایات کے عین مطابق ہے، اس معاملے میں وہ ہمیشہ سادگی اختیار کیا کرتے ہیں۔" میرے دل میں ایک اور دھڑکے نے سوال اٹھایا، کیا ہر چیز ایسی ہی مایوس کُن ہو گی؟

استقبالیہ کی انتظامی تیاریوں نے میرے گھر والوں کو مجھ سے دور اور مصروف رکھا۔ اس شام میری چھوٹی سی دنیا ایک جادوئی خواب میں بدل گئی۔ سرخ اور پیلے رنگ کے روایتی شامیانے بلند ہو گئے۔ پھلجھڑیاں، پٹاخے اور رنگ برنگی روشنیاں فضا میں پھٹنے اور پھیلنے لگیں۔ درختوں کے پتوں میں اٹکی ہوئی رنگ برنگی مرچیں یوں لگ رہی تھیں جیسے آسمان سے تارے اُتر آئے ہوں۔ میں نے ایسی روشنیاں پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں اور نہ ہی کبھی یہ سوچا تھا کہ میرے لئے یہ سب کچھ ہو سکتا تھا۔

بارات کے آنے سے تھوڑی دیر قبل مجھے غسل دے کر عطریات میں ڈبو دیا گیا۔ مُنھی نے جو چمکتی ہوئی گلابی پشواز پہنے کہانیوں کی شہزادی لگ رہی تھی میرے لمبے سرمئی بال بیلے کی کلیوں کے ساتھ ڈھیلے ڈھالے انداز میں استوار کر دیے۔ فلورل والی میری خالہ نے میرے رنگ روپ کو پالش کر کے مجھے آئیوری کے کسی مجسمے کی طرح تراش ڈالا، پھر تالی بجاتے ہوئے وہ جوشیلے انداز میں بولی "میں نے آج تک جتنی بھی دلہنیں دیکھیں تم اُن سب میں خوبصورت ترین ہو۔ میں نے آئینے میں دیکھا۔ میری آنکھوں کی جواہراتی سفیدی اور ان کا عنابی مرکز میرے چہرے پر ہیروں کی طرح چمک رہا تھا۔ رخساروں کی مدہم سرخی پہ سونے

کے جھاڑ نے انہیں گالوں کے ہلکے ہلکے گڑھوں پر اوپر اٹھا دیا۔ میرے ارغوانی ہونٹوں پہ یہ عکس دیکھتے ہوئے مسکراہٹ پھیل گئی۔

کیا یہ میں ہی ہوں؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

تیز سُرخ رنگ کی فراک کے برعکس جو میرے دبلے پتلے بدن پہ ڈھیلی ڈھالی لگ رہی تھی میری ٹانگوں پہ سفید سوتی چوڑی دار چست پاجامہ تھا۔ رنگ برنگے موتیوں کے جڑاؤ والے گلوبند پر مشتمل بھاری بھرکم سینہ بند نے میرے کندھے جھکا ڈالے تھے۔ پانچ طلائی گلوبند اس پر اضافی تھے، میری پیشانی کے عین درمیان ایک طلائی ٹیکا تھا، اس کے دائیں ایک جھومر، کوٹے ہوئے طلائی موتیوں پہ مشتمل ایک نتھ، سونے کی چوڑیاں اور دونوں بازوؤں پہ سونے ہی کے بازوبند۔ میری انگلیاں ہیروں سے اٹی ہوئی تھیں۔ میں بے ہوش ہونے کو تھی کہ میری خالہ زاد نے مجھے پینے کو پانی لا دیا۔

میں نے نیچے مہندی لگی اپنی ایڑیوں کی طرف دیکھا اور ایک پاؤں اوپر اٹھایا لیکن بھاری طلائی پازیب کے بوجھ سے وہ پھر گر گیا۔ نتھ، پازیب اور درجنوں چوڑیاں مجھے طوق و سلاسل کی طرح لگ رہی تھیں۔ میں یوں ہی گم سُم تھی کہ کسی نے میرے پاؤں پہ اونچی ایڑی والے جوتے چڑھائے، بینڈ دس منٹ کے قریب بجتا رہا۔ اتنے میں بھائی بھاگتے ہوئے مجھے یہ بتانے اندر آیا کہ بارات کے آنے سے کیا زبردست سماں پیدا ہوا تھا۔

"آپا وہ سرخ پھولوں اور نقرئی لڑیوں سے سجی ایک کار کے آگے ڈھول کی تھاپ پہ بھنگڑا ڈال رہے ہیں۔ جلوس اتنا لمبا ہے کہ تمام مہمانوں کے یہاں پہنچنے میں ابھی بہت وقت لگے گا" بگل اور شہنائیوں نے پیر سائیں کی آمد کا اعلان کیا۔

چُھٹکی جو نقرئی زربفت میں ملبوس اُڑی اُڑی پھر رہی تھی۔ ہوا کے تازہ جھونکے کی طرح مجھے یہ بتانے آئی، "آپا صحن شاندار ملبوسات والے لوگوں کی بدولت جنت میں ڈھل گیا ہے، ہر کوئی اپنے بہترین جوڑے میں ہے۔"

مہمانوں کے لئے جگہ بنانے کی خاطر ہم نے عقب میں ایک پلاٹ کرائے پہ لے لیا تھا۔ ہم نے دولہا کے لئے ایک غسل خانہ بھی تیار کیا تھا جہاں اسے ہمارا سلوایا ہوا لباس پہننا تھا، یہ بات عام نہ تھی۔ دولہا سہرے سمیت مکمل لباس میں ہی آتا ہے، لیکن میرا نہیں۔ بھائی دوبارہ بھاگتا ہوا اندر آیا "پیر سائیں اپنے عمامے میں غضب کا لگ رہا ہے لیکن انہوں نے اپنے

کپڑے پہنے ہیں ہمارے والے تو انہوں نے لئے ہی نہیں۔" میں نے پوچھا "کیوں؟" تو بھائی نے صرف کندھے جھٹک دیئے۔ "تم جانتی ہو وہ وہی کچھ کرتے ہیں جو اُن کا دل چاہے اور پھر وہ کوئی وضاحتیں دینا بھی پسند نہیں کرتے۔"

کمرے میں ہجوم کے ساتھ گرمی بھی بڑھ گئی۔ "کیا تم پیر سائیں ابن فلاں ابن فلاں کو اپنے خاوند کے طور پر قبول کرتی ہو؟" مولوی نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے گھونگھٹ کے اندر سے تین دفعہ "ہاں" میں جواب دیا۔ ایک کاغذ، ایک قلم، دستخط اور میں پیر سائیں کی ہو گئی۔ چُھٹکی، منھی اور میری ایک کزن تنگ سیڑھیوں سے مجھے تقریباً اٹھائے نیچے عورتوں والے شامیانے میں لے آئیں۔ میرے بیٹھنے کی دیر تھی کہ عورتیں اور بچے ایک دوسرے کو دھکیلتے بلکہ کچلتے ہوئے مجھے دیکھنے کو لپکے۔ آپس میں جھگڑتے، جھڑکتے اور بحث کرتے وہ اپنی اپنی جگہیں سنبھالتے اور بدلتے میرے قریب تر ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ شور اور ہنگامہ اچانک مکمل سکون میں بدل گیا۔ پیر سائیں اندر پہنچ گیا۔

جب وہ میرے پہلو میں بیٹھ گیا تو میری بہنیں اور کزن جوتی کی رسم ادا کرنے آگے بڑھیں۔ دولہا کی جوتی چرانے، کے بعد اس وقت تک واپس نہیں کی جاتی جب تک وہ لڑکیوں کو منہ مانگی قیمت نہ دے، لیکن پیر سائیں کے ساتھ یہ مشکل تھا۔ وہ سب جھجکتی ہوئی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئیں اور پھر کچھ کہے بنا واپس مُڑنے لگیں۔ چھیڑ چھاڑ نہ کرنے کے معاوضے میں اس نے انہیں نوٹوں کی ایک گڈی دی اور خود واپس لوٹ گیا۔ اس کے جاتے ہی ہنگامہ پھر سے شروع ہو گیا۔ ہر کوئی دوسری کو دھکے دے کے میرے قریب تر آنے کی کوشش میں تھی۔ کسی کو دیکھے بنا بلکہ سر اٹھائے بنا مجھے میرے کمرے میں واپس پہنچا دیا گیا۔

ماں نے شادی کا جوڑا دوبارہ فٹ کروا کے پہنا ہوا تھا۔ اپنی شادی کے روز وہ بالکل میرے جیسی لگ رہی ہو گی۔ اب وہ میرے لئے رو رہی تھی جیسے اس کی ماں اس کے لئے روئی ہو گی۔

"جیسے وقت کا کوئی لمحہ ماضی کو مستقبل سے جدا کرتا ہے۔ اسی طرح جونہی کوئی لڑکی اپنے باپ کی دہلیز پار کرتی ہے اس کا بچپنا ختم ہو جاتا ہے۔" اس نے کہا۔ معاملات کی غیر یقینی صورتِ حال اچانک مجھ پہ آشکار ہو گئی۔ مجھے ڈر لگا کہ جوں جوں اسرار کھلے شاید میں شادی

کے بندھن میں رہنا پسند نہ کروں گی، ماں نے بات جاری رکھی، "کبھی تو اسے فاش ہونے میں وقت لگتا ہے، کبھی تیزی سے لیکن دونوں صورتوں میں کہانی کھل کے ہی رہتی ہے۔"

پاؤڈر اور عطریات کے کچھ مزید چھڑکاؤ کے بعد ململ کی ایک سرخ نقاب میرے اوپر ڈال دی گئی جس پہ بڑے تیز پیلے پھولوں کا پرنٹ تھا سامنے کی طرف وہ میرے گھٹنوں تک گری ہوئی تھی۔ جب انہوں نے مجھے دوبارہ بٹھایا تو مجھے یقین تھا کہ یہ وقت بھی اب ختم ہونے کو تھا۔ گھر سے بچھڑنے کا وقت آ گیا۔ جگر کے پار ہوتی شہنائی کی اُداس دھن ملاپ اور دچھوڑے کی بیک وقت کیسی تلخ اور میٹھی صدا تھی۔

چھوڑ بابل کا گھر، موہے پی کے نگر، آج جانا پڑا

گیت کی دھن اور بول اتنے دردناک تھے کہ انہوں نے مجھے مغلوب کر ڈالا۔ وہ اس لمحے کو قیامت تک طول دے رہے تھے۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"تم اکیلی نہیں جا رہی ہو، میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں، وہ تمہاری خوشیوں کی ضامن ہوں گی۔" ماں نے مجھے یقین دہانی کروائی لیکن اندر ہی اندر وہ میرے لئے خوفزدہ تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں یہی کچھ دیکھا تھا چھٹکی اور ننھی کی بہترین سہیلی رخصت ہو رہی تھی۔ بھائی یوں رو رہا تھا جیسے اس کا سب کچھ چھن گیا تھا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے اب تک مجھ سمیت کسی نے بھی میری جدائی کی حقیقت کو دل سے تسلیم نہ کیا تھا۔ مجھے بابا کے جنازے کے جلوس کی یاد آئی۔

ہر ایک سے گلے لگتے اور جیسے کٹ کٹ کے الگ ہونے کے بعد مجھے قرآن کے سائے کے نیچے سے گذار کے کسی گٹھڑی کی طرح کار میں ڈال دیا گیا۔ میرا سر جھکا ہوا تھا۔ نقاب کے اندر سے مجھے کچھ بھی تو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے یہ فرض ہی کیا کہ یہ وہی کار تھی جو سرخ گلابوں اور طلائی اور نقرئی جھنڈیوں جھالروں سے سجی ہوئی تھی۔ پیر سائیں میرے ساتھ بیٹھا تو میرے بدن میں تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی کار چل دی۔

مجھے ایک بار پھر، آخری بار پیچھے دیکھنا تھا اور میں مڑی۔ پریوں کے دیس کی روشنیاں گل ہو چکی تھیں ..... اب وہاں گھُپ اندھیرا تھا۔ میں نے نقاب اپنے چہرے پہ گرا دی۔ اندھیرے پہ اندھیرا۔ کار دائیں اور بائیں مڑتی رہی۔ بار بار۔ شہر کی پر شور ٹریفک کی آوازیں دور ہوتی گئیں۔

کار مستقبل میں دوڑ رہی تھی۔

نظارہ بدل گیا۔

میری زندگی بدل گئی۔

میرا خاوند میری طرف جھکا۔ اس کے الفاظ ختم نہ ہونے والے سفر کی بھاری خاموشی میں تھرتھرائے۔ کپڑوں کی کئی تہیں ہونے کے باوجود اس کا بدن مجھے چھوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"رو مت، اللہ کے فضل سے سب اچھا ہے" میں نہیں سمجھ سکی یہ حکم تھا یا تسلی۔

اچانک مجھے ٹائیلٹ جانے کی حاجت محسوس ہوئی۔ یہ بہت ضروری تھا ساتھ ہی مجھے اسکول میں اپنے پہلے دن کی یاد آئی اس روز بھی مجھے اتھارٹی کا ایسا ہی ڈر محسوس ہوا تھا۔ آج مجھے پھر سب سے بنیادی حاجت نمٹانے کے لئے اجازت کی ضرورت درپیش تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ کار بالآخر رک گئی لیکن ہم اندر ہی رہے۔ اسی اثناء میں ایک مردانہ آواز آئی، پردہ، پردہ، کوئی راستے سے ہٹ جانے کو کہہ رہا تھا۔ آخر کار میری نند آگے بڑھی اور اس نے مجھے بازو سے پکڑتے ہوئے گاڑی سے باہر نکالا۔

میرا خیال ہے ہم کسی دروازے سے گذرے تھے۔ عورتوں کے پرے ہمیں گھیرے ہوئے تھے۔ وہ سب اسے مبارکباد دے رہی تھیں۔ میرے پاؤں چھوئے جا رہے تھے اور پیر سائیں کے لئے خوشحالی کی دعائیں۔ وہ ہمارے عقب اور اطراف میں چل رہی تھیں لیکن کوئی بھی آگے نہ آئی۔

دوسرے دروازے سے گذرنے تک مجھے اپنے پاؤں تلے نرم مٹی کا فرش محسوس ہوا تھا اب نیچے کوئی قالین تھا۔ مجھے بیٹھنے کو کہا گیا لیکن میں ٹائیلٹ جانے کی حاجت میں شدت سے بے حال ہو رہی تھی۔ ماں یقیناً اسے پسند نہ کرتی۔ اس کی خاطر میں نے پیشاب روکنے کی کوشش کی لیکن پھر مجھے یہ احساس ہوا کہ اس عمل کے ساتھ ماں کا کیا تعلق تھا۔ شور اور ہنگامے کے درمیان میں نے ساتھ والی عورت سے سرگوشی کی، لیکن میری شرمندگی کی انتہا نہ رہی جب اس نے با آواز بلند اس سلسلے میں ہدایات دینا شروع کر دیں عورتوں نے مجھے کسی معذور کی طرح بازوؤں سے اٹھایا اور ہجوم کے درمیان سے لے کر چلیں۔ میں ایک دروازے سے گذری جو پیچھے سے بند ہو گیا۔

فراغت کے بعد میں نے آئینے میں دیکھا، آنسوؤں کے ساتھ بہہ جانے والی کاجل کی لکیروں کو صاف کرتے کرتے مجھے خیال آیا میں اتنی پیاری اور حسین کیسے ہو گئی تھی۔ اس روشنی کا ماخذ کیا تھا جو میری جلد سے پھوٹے چلی جارہی تھی۔ اپنے خاوند سے ہونے والی قربت کے تصور سے میرا دل دَھک دَھک کر اٹھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو عورتوں نے ایک بار پھر مجھے اٹھالیا اور صوفے پہ لا بٹھایا۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ کسی نے سرگوشی کرتے ہوئے بتایا کہ میرا خاوند وہاں آچکا تھا، پھر کوئی اور اندر آیا۔

پیر سائیں کی آواز آئی، وہ مجھے حکم دے رہا تھا کہ میں اس کی والدہ کا دایاں پاؤں اپنے دائیں ہاتھ سے چھوؤں۔ میں کھڑی ہو کر اماں سائیں کے حضور جھک گئی۔ انہوں نے مجھے اپنے گھٹنوں کے پاس روکتے ہوئے میری کہنیوں سے مجھے واپس اٹھایا، گھونگھٹ ہٹاتے ہوئے انہوں نے میری ٹھوڑی اوپر کی۔ بند آنکھوں سے میں نے انہیں اپنے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے محسوس کیا۔ ”اللہ تمہارے قدم اس گھر میں مبارک کرے، اللہ تمہیں سات بیٹے عطا کرے۔“ میری طرف سے ایک بار پھر ان کے پاؤں چھونے کی رسم کے ساتھ ہی وہ سب کو لئے رخصت ہو گئیں۔

چٹخنی کی آواز آئی۔

گھونگھٹ تلے میں سوائے اپنی ہتھیلیوں کے کچھ بھی نہ دیکھ سکتی تھی۔ اپنے خاوند کی موجودگی سے اپنی توجہ ہٹانے کے لئے میں نے مہندی کی پیچیدہ لکیروں کے جال میں اپنی قسمت کی اس لکیر کو ڈھونڈنا چاہا جسے کمالِ ہوشیاری سے اس خاکے میں چھپادیا گیا تھا۔

پیر سائیں میرے پہلو میں بیٹھ گیا، میرے دل کی دھڑکن جیسے رک گئی، اس کا ہاتھ گھونگھٹ کے اندر اترا اور پھر میری گود میں کچھ ٹٹولنے لگا۔ حنا کا خاکہ اور میری قسمت کی لکیریں ہمیشہ کے لئے اس کے ہاتھوں کے نیچے گم ہو گئیں۔

باب ۳

سُسرال

مسہری پر پڑے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے گوشت کا کوئی پہاڑ میرے اوپر اتر آیا تھا۔

ملاح ایک روشن صبح اپنی سلامتی اور نفع کی امیدیں لئے سمندر میں نکلا۔ بادل اچانک گمبھیر ہوتے ہوئے آپس میں ٹکرائے۔ غضب ناک کالی گھٹائیں برس اُٹھیں۔ بجلی کی چمک اور طوفانی کڑک نے وسیع و عریض حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے پانی کو جیسے وحشی کر دیا۔ اُس کا جوش اور حجم بڑھ گیا۔ اوپر والا شور تو تھا ہی نیچے اس سے بھی زیادہ ہنگامہ تھا، ہوا میں پختگی تھی۔ فرار اور نجات کی راہیں مسدود، کوئی نہیں، کہیں نہیں، قوتِ ارادی نے بمشکل مجھے زندہ رکھا۔

صبح کے الارم کی کوک اور گھنٹیوں کی آواز سنتے ہی میں کسی خوفزدہ پرندے کی مانند چھلانگ مارتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اُس رات کیا یہ نیند کا عالم تھا یا ایک طرح کی موت تھی جو مجھ پہ طاری ہوئی؟ وہ ایک تقریب تھی جسے سب نے مل جل کر منایا تھا۔ میرے چاہنے والوں اور پیاروں نے اس کے انتظار میں گیت گائے اور رقص کئے۔ مجھے کئی روز پہلے سے اس کے لئے بنایا سنوارا اور ہر انداز میں چمکایا، بھڑکایا گیا تھا۔ کیوں؟ کسی جادوگرنی کی طرح دل موہ لینے کے لئے اور اپنے اوپر اس وحشت، دیوانگی اور بربریت کو دعوت دینے کے لئے؟ اب یہ سب کچھ شیطانی کھیل دکھائی دے رہا تھا۔

تیاریاں، رسومات، تقریب اور قربانی! مجھے زمین کے ایک دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا۔ معاہدے میں میری زندگی لکھ کر دے دی گئی۔ مذہب کی نشان زدہ شرائط پہ خاندانی اور سماجی روایات کی مہر لگ گئی۔ سہاگ رات اس معاہدے کی پہلی صبح تھی۔ کیا اسے دنیا کے ہر کونے میں یوں ہی بار بار دہرایا جاتا تھا؟ کیا ماں پہ بھی یہی سب کچھ گذرا تھا؟ میں اندر ہی اندر سسک رہی تھی کہ اُس نے پوچھا ”تم نماز ادا کرتی ہو؟“

میں دُبک گئی۔

میں دکھی اور خوفزدہ تھی۔

ان دونوں میں کون سی کیفیت بدتر تھی، میں نہیں جانتی ”کبھی کبھی“ میرے اس

اعتراف نے خود مجھے شرمندہ کر دیا۔

"نماز سے غفلت کا کبھی کوئی جواز نہیں ہو سکتا، ہمبستری کے بعد غسل کیا کرو اور بال بال دھو لیا کرو۔ خواب گاہ سے ناپاک حالت میں باہر نکلنا حرام ہے۔ اس حالت میں تم جس چیز کو چھوؤ گی، اسے پاک کرنا پڑے گا" اس نے تنبیہہ کی۔ میں لڑکھڑاتی ہوئی غسل خانے میں گئی۔ شاور کے نیچے کھڑے کھڑے میری ہچکی بندھ گئی۔ ماں کی یاد میں سسکیاں بھرتے ہوئے میں نے اپنے دکھتے ہوئے بدن کو ٹٹولا اور اسے تھپتھپایا، اس پہ کیا کچھ بیت گیا تھا!

"ماں، پیاری ماں کیا تم جانتی ہو تم نے مجھے کہاں بھیجا ہے؟" میں چلائی وحشت کے عالم میں غسل کے دوران بدن رگڑتے ہوئے مجھے کبھی دیوانہ وار اپنے اوپر پیار آتا اور کبھی افسردگی ملی نفرت اس کی جگہ لے لیتی۔

بھاری بھرکم بروکیڈ کا وہ جوڑا جو میرے لئے تیار کیا گیا میرے لئے اپنی زیبائش اور شان کھو چکا تھا۔ جواہرات پتھر دکھائی دے رہے تھے بدن خشک کرتے ہوئے بھی میں رو دی۔

جوڑے اور بناؤ سنگھار نے مجھے ایک بار پھر دلہن بنا دیا۔

وہ کمرے سے جا چکا تھا۔

اس کی بہن اندر داخل ہوئی اس نے خون کے دھبّوں والی بستر کی چادر اٹھائی اور چل دی۔ یہ میرے کنوارپن کا ثبوت تھا۔ شرمندہ سی ہو کر میں وہیں بیٹھ گئی۔

میرے سامنے دودھ کا گلاس، فرائی انڈہ، مرغ کا سالن اور پراٹھا پڑا تھا لیکن میں کچھ بھی نہ کھا سکی۔

میں نے نیم تاریک منحوس کمرے پر نگاہ دوڑائی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہاں بستر کی جگہ ایک چوڑی سی قبر تھی۔ مسہری کا بلند سرہانہ لوحِ مزار کی طرح تھا۔ اس کی نازک کشیدہ کاری ایسے تھی جیسے میرا کتبہ لکھا ہو۔ چوپایوں کے نقش والا قالین مذبح خانہ لگ رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ سرخ رنگ کے صوفے اور کرسیاں تھیں ان کے سامنے رکھے میز پہ گلاب کے ہار پڑے پڑے مرجھا رہے تھے جیسے ایک روز پرانا کوئی مردہ ہو، میری نند طوفان کی طرح اندر آئی۔

"آؤ چلو اماں سائیں تمہاری منتظر ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے یوں گھیرا جیسے کسی گٹھڑی کو اٹھاتے ہیں۔ مجھے چلتے ہوئے بڑی دقت محسوس ہو رہی تھی۔ رانیں ایک دوسری

سے رگڑ کھاتیں تو میرے پورے بدن میں درد کی لہریں دوڑ جاتیں۔ میں نے دور سے اماں سائیں کو دیکھا جو صحن میں براجمان تھیں۔ اُن کے اردگرد ایک کھلے دائرے میں بچھی چارپائیوں پہ زرق برق ملبوسات زیب تن کئے معزز خواتین بیٹھی تھیں۔ دائرے کے درمیان مٹیالے چیتھڑوں میں ملبوس چوکڑی مارے سینکڑوں اور تھیں، میری آمد بڑی ڈرامائی تھی۔

پلک جھپکتے میں سب ہی عورتیں خواہ وہ طبقہ امراء سے تھیں یا غرباء اور عوام الناس سے میرے پاؤں چھونے کو دوڑ اٹھیں۔ جب تک میں ان کے درمیان سے گذرتی اماں سائیں کے پاس پہنچتی مجھے اپنے نئے مقام اور مرتبے کا بخوبی احساس ہو چکا تھا۔

اماں سائیں نے مجھے شفقت بھرے انداز میں خوش آمدید کہا اور اپنے پاس بٹھا لیا اگرچہ میرے لئے بیٹھنا خاصا دشوار ہو رہا تھا۔ مراثنیں ڈھولکی کی تھاپ پہ گا رہی تھیں، چارپائیوں پہ بیٹھی عورتیں ان کی طرف روپے پیسے پھینک رہی تھیں اور میں خاموش بیٹھی اذیت سہے جا رہی تھی۔

اماں سائیں کے وجود سے طاقت پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ ان کی آواز بھی ویسی ہی بارُعب تھی جیسا ان کا لمبا چوڑا قد بت، سفید دودھیا چٹری والی خاتون کے شفون کے دوپٹے سے اس کے روپہلے بال بجلی کی طرح لشکارے مار رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے معنی خیز اشارہ کیا اور عورتیں باری باری میرا چہرہ دیکھنے کے لئے آنا شروع ہو گئیں۔ کرارے کرارے فقرے چست کرتی میرے اردگرد طواف کرتے ہوئے وہ مجھے سات بیٹوں کی دعائیں دے رہی تھیں۔ گھونگھٹ میں جب بھی میرا سر زیادہ نیچے جھک جاتا میری نند اُسے اوپر اٹھا دیتی۔

میری نظریں ایک عقاب سی شکل والی عورت پہ پڑیں جو دروازے میں کھڑی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے اُن عورتوں پہ نگاہ رکھنے کا فریضہ سونپا گیا تھا، جن میں سے گویا ہر کوئی کسی جرم کی مرتکب تھی۔ اُدھر ایک مہمان نے اماں سائیں سے میرے جہیز کی بات کی تو انہوں نے اُسے جھاڑ دیا۔ یوں میری توجہ اس عجیب سے نظارے سے ہٹ گئی۔

آخر میں فرش پہ بیٹھی عورتوں کو اٹھنے اور چہرہ نمائی کا اذن ہوا۔

پیر سائیں بہت بعد ظہرانے کے لئے آیا تو عقابی عورت کے علاوہ سب منتشر ہو

گئیں۔ اماں سائیں نے خادماؤں کو ہلکا سا اشارہ کیا اور کھانے کی لمبی میز لگ گئی۔ چند منٹوں میں وہ انواع و اقسام کے کھانوں سے بھر دی گئی۔ میرے خاوند نے میرے ساتھ بیٹھتے ہوئے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے جب کہ میں نے روٹی کا لقمہ لیا اور اسے سالن میں ڈبویا۔ وہ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا تھا اس کی نگاہ کشش ثقل کی مانند میرے سر کو پلیٹ کی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ مجھے کیوں گھور رہا تھا؟

"کھانے سے پہلے ہمیشہ اپنے ہاتھ دھوؤ۔" اُس نے حکم دیا اور اسی لمحے دھڑکتے دل کے ساتھ احاطے کی دیوار کے ساتھ لگے نلکے کی طرف بھاگی۔ کھانے کا اذیت ناک امتحان ختم ہوا تو اُس نے مجھے اندر آنے کو کہا۔ خوف نے یک دم صُبح کی تازگی اور ولولے کی جگہ لے لی۔ سر جھکائے میں اس کے پیچھے چل پڑی، میں اماں سائیں کے پاس جانا چاہتی تھی، میں ماں کے پاس جانا چاہتی تھی، میں مرنا چاہتی تھی میں کہیں کسی اور جگہ ہونا چاہتی تھی لیکن اس کے بجائے میں اسی کے پیچھے چل رہی تھی۔

ایک بار پھر ڈراؤنے خواب کی زد میں میں اپنے وجود کو بھلا بیٹھی۔ میرے بدن کا کون سا حصہ کیا تھا؟ اس کے بوجھ تلے دبے دبے مجھے جھرجھری سی آئی۔ میں سوچ رہی تھی اگر سب ہی عورتیں اس عذاب سے گزرتی تھیں تو پھر وہ اپنی بیٹیاں کاہے کو بیاہتی تھیں۔ اس موضوع پہ میرے ساتھ کبھی کسی نے بھی گفتگو نہ کی لیکن کوئی یوں بُری طرح خوف زدہ بھی تو دکھائی نہ دی تھی۔

عورتیں اس جسمانی اذیت سے گذرنے کے بعد اپنے معمول کو کیسے بحال کرتی تھیں؟ ایسا خوف مجھے ماں کے چہرے پہ کبھی کیوں نہ نظر آیا تھا؟

یہ ہر روز ہوتا رہا اور پھر پورا ہفتہ گزر گیا، مجھے احساس ہوا کہ پیار کے متعلق میری سوچ اور نظریہ غلط تھا۔ حقیقی زندگی کتنی مختلف تھی۔ میں سوچا کرتی تھی دو چاہنے والے ایک دوسرے سے ڈھیروں باتیں کرتے ہوں گے، ہنستے اور گاتے ہوں گے، بالکل ان فلمی کہانیوں کی طرح جو میں دیکھ چکی تھی۔ میں نے اسکول میں جو کچھ بھی پڑھا اور سیکھا وہ بھی غلط نکلا تھا۔ شعر و شاعری، جذبات، محبت بھرے خطوط سب جھوٹ تھا جھوٹے! میں نے دل ہی دل میں لعنت بھیجی۔ نو عمر نسلوں کو کیسے کیسے سبز باغ دکھائے جاتے ہیں؟ کیا ہونا چاہیئے تھا اور کیا ہو رہا تھا قول اور فعل کا تضاد کتنا بھیانک تھا، راہ فرار کہاں تھی؟

میں اپنے اندر ہی کی طرف بھاگ نکلی۔ میں ماں کو پکارنا چاہتی تھی۔

جب فلور مل والی خالہ کی بیٹی اپنے چھ سالہ بیٹے کے ساتھ مجھے ملنے آئی تو عقابی شکل عورت کی منحوس موجودگی کے باوجود میں اتنا خوش ہوئی کہ میرا چہرہ دمک اٹھا۔ بازو اپنے سینے پہ باندھے کمر کبڑوں کی طرح پیچھے اور گردن آگے کو نکالے وہ کسی دیو قامت گدھ کی طرح لگ رہی تھی جو مجھ پہ جھپٹنے کو تیار تھا۔

میں نے محسوس کیا وہ ہر اس جگہ موجود ہوتی جہاں میں تھی، لیکن جب میری کزن نے بے ساختہ کہا "ہیر تم کتنا خوش نظر آ رہی ہو" تو میری مسکراہٹ گم ہو گئی، پھر ماں کی خاطر تیزی سے موڈ بدلتے ہوئے میں ہنس دی۔ میری ہنسی میں تصنع تھا اور خوشی اور مسرت کا وہ اظہار جو میں اس کے لائے تحائف کھلتے دیکھ کے ظاہر کر رہی تھی سراسر بناوٹی تھا۔ ریشمی سوٹ، کانچ کی چوڑیوں اور ایش ٹرے کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میں نے اسے گلے لگایا اور چوما، لیکن یہ سب دکھاوے کے لئے تھا۔

احاطے کی بیرونی دیوار کے ساتھ واقع نلکے پہ بیٹھی میں اپنی کلائیوں پہ صابن مل رہی تھی۔ میری چوڑیاں کھنک رہی تھیں کہ اچانک پیر سائیں اندر آ گیا۔ میری کزن اور اس کے بیٹے نے اس کے پاؤں چھوئے، وہ دونوں چند لمحے ہچکچاہٹ اور گومگو کے عالم میں وہاں کھڑے رہے اور پھر اس کی طرف خاموشی سے دیکھتے ہوئے تیزی سے چل دیئے۔ میں ابھی مسرت اور افسردگی کے عالم میں اس دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جس سے گزرتے ہوئے وہ غائب ہو گئے تھے کہ پیر سائیں نے مجھے اپنے ہاتھ میز پہ رکھنے کا حکم دیا۔

پلک جھپکتے میں میرے دونوں بازو میز پر تھے، دوسرے ہی لمحے اس کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور پھر کلہاڑے کی طرح میری کلائیوں میں اتر گیا۔ مجھے شیر کے دھاڑنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی ذلتوں کے مارے میرے خاندان کے بارے میں کسے گئے فقرے کی بازگشت۔ میرا سر چکرا رہا تھا اور بدھیاں گلابی پڑ رہی تھیں۔

میری پہلی پٹائی سب کے سامنے شروع ہو کے اندر کمرے میں جا ختم ہوئی۔ میں نے ایک ایسے نامحرم مرد کے سامنے آ کر اللہ کی بھی نافرمانی کی تھی جس سے میرا نکاح ہو سکتا تھا، لیکن وہ تو صرف چھ سال کا تھا۔ ماں نے ایش ٹرے میرے پاس پہنچنے سے پہلے وہیں کیوں نہ رکھ لیا؟ اسے تو اندازہ ہونا چاہیئے تھا کہ اس قسم کے جدید، تحائف بھیجنے کا نتیجہ کیا ہو سکتا تھا۔

فوارے کے نیچے روتے ہوئے نہاتے نہاتے مجھے ماں کا وہ ڈراؤنا انداز یاد آیا جب بابا اس سے ناراض ہوا کرتے تھے۔ گھر کی صفائی کرنے والی بڑھیا خاوند کے ہاتھوں اپنی روزانہ پٹائی کے خلاف ماں سے شکایت کیا کرتی اور ماں بابا سے کہا کرتیں کہ وہ اس کے میاں کو سمجھائیں۔ ہم میں سے کسی نے بھی کبھی یہ احساس نہ کیا کہ بابا کا اپنا طرزِ عمل بھی تو ایسا ہی تھا۔

ماں کے پاس بابا کا دفاع کرنے کے لئے بہر حال ڈھیروں جواز تھے۔ ملازمت کے مسائل، معاشی دشواریاں، سماجی دباؤ اور غلط فہمیاں ان کے غصیلے پن اور اس کے دوروں کا باعث تھیں اگرچہ اللہ کے حضور وہ رورو کے بابا کے رویئے کے خلاف فریادیں کیا کرتیں۔ لیکن اس وجہ سے بابا سے کوئی بھی نفرت نہیں کرتا تھا۔

ہم سوچا کرتے خدا نے انہیں مرد بنایا تھا اور مردانہ اختیارات کو استعمال کرنے کا انہیں حق حاصل تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے، اپنی عزت کے تحفظ کے لئے ہر کوئی اپنا اختیار اور قوت استعمال کرنے میں حق بجانب ہوتا ہے، لیکن میرے والدین تو آپس میں باتیں بھی کرتے تھے اور ہنسی مذاق بھی، میرے معاملے میں ایسا کیوں نہ تھا؟

ٹوٹی چوڑیاں میری کلائیوں پہ زخموں کے نشانات چھوڑ گئیں لیکن اُن سے بھی گہرے نشان دور میرے وجود میں کہیں پیر سائیں کے خوف نے کندہ کر ڈالے تھے مجھ میں اتنی جرأت بھی نہ رہی تھی کہ میں اسے جھلک بھر دیکھ ہی سکتی۔ اس وقت بھی نہیں جب اس کی توجہ میرے بجائے کسی اور کی طرف مبذول ہوتی۔ مجھے بس اتنی خبر تھی کہ اس کے ہاتھ بھاری اور شانوں کی طرح چوڑے، لیکن اس کی انگلیاں مخروطی تھیں۔ پتھر کی مہر نما انگوٹھیوں سے جن پہ آیات قرآنی کندہ تھیں صرف اس کے انگوٹھے آزاد تھے۔ اس کی ایک کلائی میں پیتل کا کڑا ہوتا جس پہ کوئی دعا نقش تھی اور دوسری پہ ایک پیچیدہ شکل گھڑی۔ اس کے ایک ہاتھ میں کاٹن کا سفید رومال ہوتا جو باقی لباس کے ساتھ شام کو بدل دیا جاتا اور دوسرے میں مقدس مٹی سے گھڑے ہوئے پکے دانوں والی تسبیح چل رہی ہوتی۔ کہتے تھے کہ ماتم کے دنوں میں تسبیح کے دانوں سے لہو ٹپکتا تھا، وہ انہیں مسلسل گردش میں رکھتا۔ ناراضگی کے عالم میں تسبیح کی گردش تیز ہو جاتی اور اس دوران وہ غلیظ ترین گالیاں اور وحشیانہ دھمکیاں بک رہا ہوتا۔ رات کو یا کسی کی پٹائی اور کھانے کے دوران تسبیح اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتی تھی۔

کلف لگی شلوار قمیص کے ساتھ اس کے کندھوں پہ ہمیشہ وہ سبز چادر ہوتی جس پہ

اللہ کے ننانوے نام نقش تھے۔ سرما میں وہ اس کے نیچے ایک اونی شال اوڑھتا تھا۔ دادا پردادا سے چلے آرہے تعویز کالے دھاگوں میں پروئے اس کے بازوؤں سے بندھے اور گردن سے لٹکے ہوئے ہوتے۔ اس کے پاؤں میں کھسہ ہوتا جو باہر کو جھانکتی سفید جرابوں کی وجہ سے ہمیشہ تنگ دکھائی دیتا۔

اس کے استعمال کا عطر خصوصی طور پہ بنایا جاتا تھا۔ اُس نے اُسے کبھی تبدیل نہیں کیا۔ مخصوص خوشبو اس کی آمد سے بہت پہلے اس کا اعلان کرتی اور اس کے چلے جانے کے بعد دیر تک اس کی گواہ رہتی۔ وہاں ہر شے سے اس کی بو آتی تھی۔

جونہی وہ سیاہ پگڑی اپنے سر پہ رکھتا اس کا شیطانی وجود پھیل جاتا یہ ایک بادشاہ کی ہر روز تاج پوشی کی طرح تھا۔ اس کی کمر اتنی ستواں تھی کہ وہ اپنے قد سے لمبا نظر آتا جیسے وہ دوسروں کی نسبت خدا کے زیادہ قریب تھا۔ وہ ہمیشہ آہستہ آہستہ چلتا تھا کہ مجھے یاد نہیں وہ کسی وجہ سے کبھی تیز چلا ہو۔

ضعیف دائی، اس کی آیا ہماری خواب گاہ کی صفائی کیا کرتی تھی۔ اس کمرے میں اس کی اجازت کے بنا کوئی بھی نہیں آسکتا تھا۔ پردے کبھی اٹھائے نہ گئے تھے، کھڑکیاں کبھی نہ کھلی تھیں کمرہ ہمیشہ نیم تاریک ہی رہتا۔ وہاں دن کا کوئی نشان نہ ہوتا تھا صُبح کے الارم کے ساتھ ہی روشنیاں جل اٹھتیں ورنہ یہاں ہمیشہ رات ہی رہتی۔

میرے خاوند کے روزمرہ کے ساتھ گھڑیاں ملائی جاسکتی تھیں۔ وہ عشروں سے متعین لمحے پہ کمرے سے برآمد ہوتا، سپیدہ سحر کے ساتھ وہ باہر نکل جاتا۔ ظہرانے کے لئے واپسی ہوتی اور پھر وہ میرے ساتھ بستر میں ہوتا۔ سورج ڈوبنے سے ایک گھنٹہ قبل وہ صحن میں نکل کے بسکٹوں وغیرہ کے ساتھ چائے کا ایک کپ لیتا۔ مردانے میں عشائیے کے بعد وہ مجھے نوچنے لوٹ آتا اور آدھی رات کے قریب وہ خراٹے بھر رہا ہوتا۔

چوکور جگہ جہاں رہنے کی مجھے سزا ملی تھی آسمان سے باتیں کرتی دیواروں میں گھری ہوئی تھی۔ احاطے کی دیوار کے ساتھ پھولوں کی ویران کیاریاں تھیں اور درمیان میں ایک درخت جیسے کنکریٹ کو پھاڑتے ہوئے فضا میں چھا گیا تھا۔ میں نے سُن رکھا تھا کہ پچھلے تین پیروں نے اسے جڑ سے اکھڑوانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ہر بار فطرت کی انسانی تصرف کے خلاف مزاحمت کے نشان کے طور پہ اُبھر اُبھر آتا۔

بیرونی دروازے کے علاوہ باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اس دروازے کے سامنے بھی ایک چھوٹی سی دیوار چُن دی گئی تھی۔ مالک کی خواب گاہ، اماں سائیں کی رہائش گاہ اور دو خالی کمرے مرکزی احاطے کے پار برآمدے میں کُھلتے تھے۔ دالان کے بائیں جالیوں سے ڈھکا باورچی خانہ تھا جس کی چھت کچی تھی۔ گودام اور کئی دوسرے خالی کمرے دور دائیں طرف ایک چوکور صحن میں کُھلتے تھے۔ عقبی دروازہ مقفل رہتا تھا، اس کا بغلی دروازہ کہیں اور نہیں سیدھا قبرستان میں کُھلتا تھا۔

میں گارا لپے چوکور احاطے میں چکر لگانے میں لگی رہی۔

بار بار دُہراتے ہوئے، اپنی سوچ پہ قائم اور اس کی تصدیق کرتے ہوئے، میری دنیا اسی طرح گول ہے جیسے خدا نے اُسے تخلیق کیا۔ میں اسے اسی طرح گول رکھوں گی جیسے دوسرے کے لئے ہے، دائرے پہ دائرہ، میں ہر روز گھومتی رہی یہاں تک کہ میری ٹانگیں گھڑی کی سوئیوں کی طرح چلنے لگیں۔ جیسے وقت بیتا جائے۔

میں جلد ہی حویلی کی دوسری مالکن بن گئی، پہلی تو ہمیشہ اماں سائیں کو ہی رہنا تھا۔ اس کے احکامات پر صرف میرے خاوند کی ہدایات کو ترجیح دی جا سکتی تھی اگرچہ ایسا کم ہی ہوتا تھا۔

اماں سائیں کی تمام ہدایات پیر سائیں کی خواہشات کے مدِنظر ہی ہوتی تھیں۔ ”عورت بیوہ ہو جائے تو اس کے میاں کا مقام ورثے میں اس کے بیٹے کو ہی ملتا ہے۔“ اس نے مجھے بتایا تھا۔ ”اب یہاں تمہاری حکومت ہو گی اور میں تو تمہیں محض مشورہ دینے کے لئے ہی ہوں۔ خاوند اپنی عورتوں کی صلاحیتوں کو دیکھنے کے مشتاق ہوتے ہیں نہ کہ اپنی ماؤں کی۔“

مجھے اپنی ماں کے ضبط اور جنون کا خیال آیا۔ یہ تو کوئی عالمی مرض لگتا تھا۔ عورت امیر ہو یا غریب اس کا مقام مرد کی رضا سے منسلک تھا۔ وہ ہمیشہ باپ سے خاوند اور اس سے بیٹے کو منتقل ہوتی چلی آئی تھی۔ میں اس سفر کے دوسرے مرحلے پہ تھی۔

اماں سائیں نے مجھے ناشتے کے اختتام تک باورچی خانے میں رہنے کی تلقین کی۔ ہر صُبح میں اپنے کمرے سے نکلتی تو عقاب کی شکل والی عورت کو اپنا منتظر پاتی۔ اس کا پورا دن جیسے ایک ہی پاؤں پہ گزرتا، نہ وہ کبھی آنکھ جھپکتی نظر آتی نہ میری نگاہوں سے دور ہوتی۔ میں رات کو واپس ہو رہی ہوتی تو اُسے اسی عالم میں دیکھتی۔

میرے صُبح کے فرائض میں پانچ دس اہم مہمانوں کے لئے متعین خاصے کے ٹرے لگوانا اور ان کی نگرانی کرنا ہوتا تھا۔ ایک تلا ہوا انڈہ، دو پراٹھے گوشت یا مرغ کا سالن اور چائے نفیس چینی کے برتنوں اور ایک ایسی ٹرے میں بھیجے جاتے جس پہ چاندی کا کور بچھا ہوتا۔ عام کھانے کی مانگ یقیناً بہت زیادہ ہوتی تھی۔ ساٹھ ستر ان ڈھکی ٹرے جن میں سے ہر ایک میں ایک ابلا ہوا انڈہ، ایک چپاتی اور چائے کا کپ ہوتا عام لوگوں کے ناشتے کے لئے بھیجے جاتے۔

زنان خانے کے بیرونی دروازے کی پردہ دیوار پہ بیٹھی ایک عورت باورچی خانے اور مہمان خانے کے درمیان جاری عمل کی مرکزی کڑی ہوتی۔ ”دو خاص دو عام“ وہ پوری قوت سے کہتی اور صحن کے درمیان کھڑی ایک خادمہ گلا پھاڑتے ہوئے اس کا اعادہ کرتی۔ باورچی خانے کے دروازے پہ کھڑی ایک اور ملازمہ یہی آرڈر دہراتی، اور پلک جھپکتے میں دو عورتیں ٹرے پہ ٹرے سجائے بھاگ پڑتیں۔ بیرونی دروازے کے باہر کھڑے مرد ٹرے پہ جھپٹ پڑتے ادھر کوئی دوسرا اگلے آرڈر کے لئے چلا اُٹھتا۔

اگرچہ نوک جھوک کرتی بُڑبڑاتی ہوئی عورتیں منڈی میں کھڑے تاجروں کی طرح آپس میں لڑتیں لیکن پھر بھی یہ شور شرابا اس بھیانک خاموشی سے کہیں پُرسکون تھا جو میرے خاوند کی موجودگی میں ہر ایک پہ وارد ہوا کرتی تھی۔ میں اگرچہ طے شدہ روزمرہ کا حصہ ہو گئی لیکن مجھے اس کی یکسانیت کے ساتھ ساتھ غیر یقینی نوعیت سے خوف بھی آنے لگا۔ یہاں ہر شے مستقل تھی، کچھ بھی تغیر پذیر نہ تھا۔ انہیں کسی نئے طور طریقے کی ضرورت نہ تھی، صرف ایک اور انسان کی جو تسلسل کو برقرار رکھ سکتا۔

اسی چھوٹے سے سٹول پہ بیٹھے بیٹھے مجھے کئی ماہ گذر گئے۔ یہاں تک کہ نوکرانیوں کی چیختی چلاتی آوازیں شب و روز مسلسل بارود کے دھماکوں کی طرح میرے سر میں پھٹنا شروع ہو گئیں۔ اُدھر میری دکھتی ہوئی کمر کا درد مجھے بیٹھنے نہ دیتا۔ تھک ہار کے میں باورچی خانے سے نکل کے غسل خانے میں شاور کے نیچے آ کھڑی ہوئی تاکہ بدن ٹھنڈا کروں۔ عقابی عورت جسے لوگ چیل کہتے تھے اپنی نگاہیں میری ایڑیوں پر جمائے ہوئے تھی۔ میں اپنے بال سنوار رہی تھی کہ پیر سائیں غیر متوقع طور پر اندر داخل ہوا ”تم اپنی ڈیوٹی کے مقام سے غیر حاضر تھیں۔“ اس نے کہا میں تھرا گئی ”سائیں مجھے بہت گرمی لگ رہی تھی۔ مجھے غسل کی ضرورت تھی سائیں۔“ بازو سے پکڑتے ہوئے اس نے مجھے صحن میں لا پٹخا، وہ اس وقت تک مجھے

ٹھوکریں مارتا رہا جب تک میں کھڑی نہ ہو گئی اور پھر مجھے اس وقت تک دھکیلتا رہا جب تک گر نہ گئی۔ یونہی دھکے اور ٹھڈے کھاتے ہوئے میں باورچی خانے کے دروازے تک پہنچی۔

"آٹا گوندھو، پکاؤ اور دوپہر اور رات کا کھانا تیار کرو، دودھ ابالو اور کسی کی مدد لیے بغیر کل ناشتہ بھی تیار کرو ....." اس نے حکم دیا۔ دو عورتیں مجھ پہ نگرانی کر رہی تھیں۔ شام ڈھلے مزید دو نے اُن کی جگہ لے لی۔ چیل تو مستقلاً حاضر تھی۔

ذلت کے احساس نے مجھے مار ہی ڈالا۔ وہ سب جو ہر روز میرے پاؤں چھوا کرتی تھیں آج میری عقوبت گاہ سے تمسخر آمیز انداز میں گزرتی رہیں، کتنی ہی سچائیاں آج عیاں ہوئیں، کتنے سپنے ٹوٹے اور کتنے تصور کھو گئے۔ آنسو میرے زخمی رخساروں پہ گرتے رہے۔ اُن کا منبع ماں تھی۔ میں اس کے بدن کی تہوں میں چھپ جانا چاہتی تھی، مجھے پناہ چاہیے تھی۔

وہ کہاں چلی گئی؟

وہ مجھے ملنے کیوں نہیں آئی؟

اُس نے مجھے خط بھی نہ لکھا تھا؟؟

میں نے بھائی کو مدد کے لئے پکارا، ہر طرف سے ناامیدی کے عالم میں میں بابا کے پاس جا پہنچی، بابا کو میرے پاس ہونا چاہیے تھا۔ "بابا مجھے بچالو، مجھے اُس سے بچالو بابا" میں نے انہیں پکارا۔

اتنا لمبا چوڑا کھانا وقت پر پکانے کی فکر مجھ پہ غالب آ گئی۔ دوپہر کا کھانا ختم ہوا۔ رات کا بھی تمام ہوا۔ آج رات پیر سائیں نے میری دعوت نہیں اُڑائی تھی۔ میں خوش تھی لیکن پھر افسردہ ہو گئی۔

ماں نے خط کیوں نہیں لکھا؟

وہ مجھے ملنے کیوں نہیں آئی؟

کئی ماہ ہوئے میں نے اماں سائیں سے پوچھا تھا "میں اپنی ماں کو بلانے کے لئے انہیں سندیسہ کب بھیج سکوں گی؟ ....." "جب تم یہاں اچھی طرح رچ بس جاؤ گی تو تمہارا میاں خود پیغام بھیجے گا۔" انھوں نے جواب دیا۔

میں نے بارہا اس سے پوچھا "کیا اب آپ میری ماں کے متعلق ان سے بات کریں گی" "قطعاً نہیں۔" اماں سائیں نے جواباً کہا "تمہارا خاوند ہی یہ فیصلہ کرے گا کہ وہ کب آ سکے

گی۔"

باورچی خانہ تپ رہا تھا، تنہائی بھرپور تھی۔ میرے پاس اس زندگی سے توقع کرنے کے لئے کچھ نہ بچا تھا اور یہ تو اس کا آغاز تھا۔ کیا یہ سب ہمیشہ اسی طرح رہے گا؟ ہاں! ہاں!! میں روتے ہوئے خود کلامی کر رہی تھی۔ میرے سامنے ایک ٹن آٹا گندھا رکھا تھا۔ ہر شے اس کی گواہ تھی کہ یہ ہمیشہ کے لئے تھا۔ یہ کوئی گذشتہ رات نہ تھی جو گذر گئی۔

نماز فجر کے لئے میں باورچی خانے سے نکلی اور پھر تیزی سے لوٹ آئی۔ وہ اٹھنے ہی کو تھا اور یقیناً وہ کمال درجے کا کام دیکھنا چاہتا۔ میری سزا اس کی بدمزاجی کا پرتو ہی تو تھی۔ خاموشی موت کے خوف کی مانند گلے آ رہی تھی۔

اچانک مجھے یوں لگا وہ میرے عقب میں کھڑا تھا۔ "آج تمہیں کوئی مدد نہیں دی جائے گی، اور غلطی کی کوئی گنجائش نہیں۔" میں تڑپ اٹھی جیسے بجلی کی ننگی تار کو چھو لیا ہو۔

خاص اور عام ٹرے کی مانگ شروع ہوئی۔ زندگی میں پہلے کبھی دو سے زیادہ ہاتھوں کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ میں وقت کے خلاف مصروف پیکار تھی۔ پوّے کے ساتھ چائے انڈیلتے انڈیلتے، ڈوئی کے ساتھ سالن ڈالتے اور چیختے ہوئے۔ میں یا انڈے تل رہی تھی یا ابلتے ہوئے پانی سے انہیں نکال رہی تھی۔ جلتی ہوئی میری انگلیاں اور دبی دبی چیخیں اور سسکیاں۔

"کسی شے کو ٹھنڈا نہیں ہونا، ہر شے تازہ، گرما گرم اور مزیدار ہو۔"

کیا وہ ہر شے کا ذائقہ چکھ رہا تھا؟ کیا میری ایک آدھ غلطی معاف ہو سکتی تھی؟ نہیں! نہیں اس کی گنجائش نہ تھی۔

آسمان پہ سورج بلند ہو رہا تھا۔ وہ میرے منہ کے آگے اور نیچے جلتی آگ کی طرح اوپر سے مجھے جلائے، پگھلائے جا رہا تھا۔ کیا یہی جہنم تھا؟ کیا یہ فریضہ اسے خدا نے سونپا تھا کہ وہ مجھے ایک گندی گلی سے اٹھا کے اعلیٰ مقام تک لے آئے اور پھر مجھے نالی کا کیڑا بنا ڈالے؟ کیا وہ خدا تھا؟ جس کے متعلق کوئی بات یقینی نہ ہو، جس کا کوئی حساب نہ ہو سکے۔ دن بالآخر ختم ہوا، پیر سائیں نے مجھے اپنے حضور بلایا۔

میں اندر داخل ہوئی تو اُس نے منہ سکیڑا۔ ایک اور گناہ؟ میرے پسینے کی بو اس کے لئے نفرت آمیز تھی۔ میں کھچاؤ کا شکار ہو گئی۔ میرے پاس اگرچہ اس کا جواز تھا لیکن میں وہ

پیش تو نہ کر سکتی تھی۔ جب اس نے کہا "پرواہ مت کرو" تو میں ممنونیت سے دوہری ہو گئی۔ دیوتا آج رحمدل، شفیق اور کریم النفس دکھائی دے رہا تھا۔

لیکن اس کا میری طرف بڑھنا انہی زلزلوں کا آغاز ثابت ہوا، جو سہاگ رات کو آئے تھے، اچھا ہوا مشک کی تیز خوشبو نے میری سب ہی حسیں مار ڈالیں۔ گھنے سیاہ جنگل میں دبے ہوئے جہاں سانس لینا بھی دشوار تھا میرے لئے وقت کی سوئیاں رک گئیں۔

اس کے بدن سے مردار کی سی سڑاند قے کی طرح اٹھ رہی تھی۔

نوکرانیاں بھی مجھ سے کہیں زیادہ بھاگ والی خوش بخت تھیں۔ وہ اپنے گھروں کو لوٹ سکتی تھیں۔ وہ پانچ بلیاں بھی جو میری طرح اسیر نظر آتی تھیں خوش نصیب تھیں کہ وہ پیر سائیں کے راستے سے دم دبا کے غائب ہو جایا کرتی تھیں جو میرے بس میں نہ تھا۔ اس کے بجائے وہ بچوں کے ہاتھ لگ جاتیں جو انہیں دموں سے پکڑے صحن میں بھاگتے پھرتے کھلونوں کی کمی کو پورا کر لیتے تھے۔ مجھے جب یہ پتہ چلا کہ ان کے گروہ میں کبھی کوئی بِلّا نہ تھا تو میں دم بخود رہ گئی۔

دائی میرے اس احساس پہ ہنس دی اور اس نے بتایا آخری دفعہ ایک بِلّا جرأت کر کے چمنی کے راستے زنان خانے میں داخل ہوا اُسے پکڑ کر وہیں جلا ڈالا گیا۔ اس کی راکھ بعد میں لیٹرینوں میں ڈال دی گئی۔

اگرچہ حویلی میں عورتوں کی اکثریت تھی لیکن یہ اکثریت اس معروف کہاوت کے مطابق نصف میں بدل جاتی تھی جس کے مطابق دو عورتیں ایک مرد کے برابر ہوتی ہیں، ہزار مزید وجوہات سے یہ وزن بھی صفر کے مترادف قرار دیا جاتا تھا۔

اماں سائیں نے مجھ پہ واضح کر دیا تھا کہ حویلی کی مالکن کے لئے دوسری عورتوں سے فاصلہ رکھنا لازمی تھا۔ مالک ہر دو کی آپس میں بےتکلفی کو کبھی پسند نہ کرتا۔ خادمائیں بہر حال آپس میں گپ شپ اور نوک جھوک کر سکتی تھیں۔ ان کا گھٹیا مقام اور سماجی درجہ اس کی اجازت دیتا تھا۔

اماں سائیں ہی میرے لئے مثال اور نمونہ تھیں اور یوں میرے لئے کسی اور سے بات کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ یہ اطلاع حویلی میں صُبح سویرے داخل ہونے والی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کے مانند پھیل گئی۔ چونکہ میں کسی سے بات نہ کر سکتی تھی ابھرنے والی ہر سوچ

میرے دماغ میں جہاں کوئی پابندی نہ تھی مُسلسل چرچرانے لگی۔

مجھے پتہ چلا کہ پیر سائیں کی پہلی بیوی کمزور دل تھی اور سہاگ رات کو ہی چل بسی۔ دوسری نے سہاگ رات تو جیسے تیسے گزار ہی لی لیکن اگلی شام اس کا ایسا نروس بریک ڈاؤن ہوا کہ جس سے نکلنا اسے گوارا نہ ہوا۔ دو روز بعد وہ تھر تھراتے اور کانپتے ہوئے موت کا شکار ہو گئی۔ میں نے یہ بھی سُنا کہ میرے خاوند کو اس وقت تک تیسرے نکاح کا خیال نہ آیا جب تک اس نے مجھے میری بیقرار ماں کے زیر سایہ دیکھ نہ لیا۔

کیا میرے اور اس کی بیویوں کے درمیان کوئی اور عورتیں نہ تھیں؟ کیا یہ محض ایک اور ایسا سوال تھا جسے ہمیشہ کے لئے میرے دماغ میں گونجتے رہنا تھا ..... ایک ایسی جست جس میں میرا کوئی اور حصہ دار نہ تھا؟ ایک ایسی فضا میں سوچ کی یہ آزادی جہاں ہر چیز ممنوع تھی باعثِ حیرت تھی، لیکن یہ سب کچھ جلد ہی مایوسیوں اور ناامیدیوں کے جنگل میں بدل گیا۔ عمل کے اور بنا سوچ کے سب ہی محل چکنا چور ہوتے گئے۔

نئی نئی سوچیں پرانی سوچوں کے اوپر ڈھیر ہوتی گئیں اور میرے سر کا بوجھ میری زبان پہ آگرا۔ میری زبان بند ہو گئی زبان بندی کے کئی ادوار گزر گئے۔ مجھے اپنے ہونٹوں پہ فالج زدہ الفاظ کا کھچاؤ محسوس ہوا۔

اماں سائیں نے مجھے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا "تم یہاں کسی پہ بھروسہ نہیں کر سکتیں، یہاں کوئی بھی ایسا نہیں جو پیر سائیں کو تمہارے متعلق نہ بتائے، اور میں تو خود بھی تم پہ نگاہ رکھوں گی۔" میری ساس کے جاسوس کسی کی معمولی غلطی یا حادثے کی اطلاع بھی اس تک پہنچا دیتے تھے، وہ بلا تاخیر ملزم کو طلب کرتی اور اسے سزا سناتی۔ "یوں ہر غلط کار کو ابتداء میں ہی پکڑ لیا جاتا ہے، میرے بیٹے کے پاس تو صرف بڑے بڑے معاملات ہی پہنچنے چاہئیں۔" انھوں نے مجھ سے کہا۔

میری تمام خامیاں بڑی خامیاں تھیں۔ وہ میرے متعلق اس سے کوئی بات بھی نہ چھپاتی تھی اور مجھے کہتیں "تم اس کی منکوحہ ہو، اپنے معاملات وہ خود نپٹائے گا۔ اگر تم اس کی خواہشات کو اپنے دل میں اولیت دو گی تو تم خود بخود وہ کچھ بن جاؤ گی جو وہ چاہتا ہے۔" اس دنیا میں جہاں کوئی دوست نہ تھا، کوئی بخشش نہ تھی۔ نوکرانیاں بھی میری دشمن ہو گئیں۔

یہ واقعاتی معاملہ تھا گو کہ ہم مصائب میں حصہ دار تھیں پھر بھی انہیں جھیلنے میں ہم

ایک دوسرے کی ساتھی نہ تھیں۔ بقاء کا راز مالک کی ناراضگی سے بچنے میں تھا۔ ہر ایک کی وفا کا مرکز صرف وہی تھا۔ خصوصاً چیل کا وہ بے حس و حرکت تنہا کسی سائے میں پڑی ہوتی۔ صحن کی نقل و حرکت پہ نگاہ رکھنے کے علاوہ اُسے دنیا جہان کا کوئی کام نہ تھا۔ وہ کسی سے کبھی بات کرتے نہ دیکھی گئی، نہ ہی اماں سائیں سے۔ اس کا وجود اُن مُردوں کی مانند تھا جنہیں صرف روزِ قیامت کو ہی زبان کھولنا تھی۔

پیر سائیں کو وہ سب کچھ بتاتی عین اس کے گھر واپسی کے وقت وہ بیرونی دروازے کے پردہ دیوار کے پاس پوزیشن لئے کھڑی ہوتی۔ جوں ہی وہ اندر داخل ہوتا اس کے ہونٹ ہلنا شروع ہو جاتے۔ مار پیٹ اس کا یقینی نتیجہ ہوتی میں نے محسوس کیا کہ پسے ہوئے لوگ دوسروں کو دبانے میں اپنے لئے تقویت محسوس کرتے تھے۔ یہ عمل ان کے اپنے قید و بند کو اُن کے لئے قابلِ قبول کر دیتا تھا خود پھنسے ہوؤں کے لئے یہ محفوظ اور آسان ترین مصروفیت تھی۔

تحفظ کے لئے میں اپنے اندر ہی اندر چھپتی گئی لیکن بے حد احتیاط کے باوجود روز مرّہ کے کام تشدد کو دعوت دینے کی بڑی زرخیز کھیتی تھی۔

میرے خاوند کو ان باتوں کے متعلق بھی بتایا جاتا جن سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہ ہوتا۔ ہر سادہ اور عام فہم بات کو توڑ مروڑ کے ایک مسئلہ بنا دیا جاتا۔ جھوٹ گھڑے جاتے اور شرارتیں اور سازشیں عام تھیں۔ معمولی معمولی باتیں، گرا ہوا دودھ، لباس پہ کوئی معمولی دھبہ، زیادہ پک گئی سبزیاں یا کم گلا ہوا گوشت اور کوئی بھی ایسی چیز جو بروقت میسر نہ آ سکے جرائم میں شمار ہوتی تھیں۔

دُکھ اور درد کے عملی وجود سے کہیں جان لیوا ان کا تصور تھا۔ ایک طوفان اُمڈتا اور گہرا ہوتا جاتا۔ کھجور کی بھگوئی ہوئی چھڑیوں کا گٹھا اندر لایا جاتا۔ جونہی گٹھے کی رسی اتاری جاتی ملزمہ خوف سے جیسے جان سے ہی گذر جاتی۔ سانس کے لئے تڑپتے اور بلکتے ہوئے وہ جنون کے دوروں کا شکار دکھائی دیتی۔

حالات کس وقت کیا موڑ لیں گے اس غیر یقینی کے عالم میں ہر کوئی تیز دھار کنارے پہ کھڑا دکھائی دیتا، اگرچہ فاحشہ عورتوں کی یہاں کوئی کمی نہ تھی اور جنسی کھیل شد و مد سے جاری رہتا تھا لیکن اس کا کھلا مظاہرہ برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہت سی شامیں کسی

ختم ہوتیں۔

پیر سائیں کی سیاہ آنکھیں اپنی عجیب و غریب چمک کے ساتھ باہر کو ابل پڑتیں "اس سے پیشتر کہ میں تمہیں اُلٹا لٹکا کے تمہاری کھال اتاروں مجھے سب کچھ بتا دو ....." "اس کے دھمکی دینے کی دیر ہوتی کہ ملزمہ عورت دوسری کو مذبح خانے میں دھکیلنا شروع کر دیتی۔ چابک کی شڑاپ اُن سے سب کچھ اگلوا سکتی تھی۔ "موتی اپنے خاوند کے بھانجے سے عشق لڑا رہی ہے سائیں۔ اس کے خاوند کو پتہ چلا تو اس نے اس کی خوب پٹائی کی۔" چھڑی کی آواز پہ اوپر نیچے چھلانگیں مارتی عورت پیر سائیں کے عفو و درگذر کی توقع لئے اس کی توجہ موتی کی طرف مبذول کرنے کے لئے چلائی "سائیں وہ کہاں پرواہ کرتی ہے، اُس کا اُس کے ساتھ بھاگ جانے کا ارادہ ہے۔ سائیں میرا تو اس سے کوئی تعلق نہیں میں اللہ اور اس کے رسول کی قسم کھاتی ہوں۔" ایک اور کوڑا برسا "میں جانتی ہوں بیچ میں دلالی کس نے کی، سائیں مجھے یہ سب کچھ جاننے کی معافی دے دو۔" پھر جس نے دلالی کی اُسے اندر لایا جاتا۔ سوکھے پتے کی طرح کانپتے ہوئے اگلا شکار ایک اور گواہ بن جاتا "سائیں، صرف میں اکیلی نہیں، تندور والی سوکھی بھی موتی کی مدد کرتی ہے تاکہ وہ حضور کے ہر نوکر کے ساتھ سو سکے۔"

دونوں لڑکیوں کو اندر گھسیٹ کر لایا جا رہا ہوتا رحم کی بھیک کے لئے ان کی پکار موت کی تمنا میں بدل جاتی جو ان کے دکھوں اور اذیتوں کا خاتمہ کر سکتی۔ اماں سائیں نے مجھے بتایا کہ بنا سوچے سمجھے تشدد ملزم کو ضدی، نڈر اور لچکدار بنا دیتا ہے۔ میرے بیٹے کا عمل تو اصلاح کے لئے ہوتا ہے، وہ اصلاح کے نئے نئے راستے تلاش کرنے والا عبقری تھا، اگرچہ میں اس نتیجے پہ پہنچ چکی تھی کہ دنیا میں کوئی راستہ ایسا نہ تھا جسے اختیار کر کے اس کے غضب سے بچا جا سکتا۔ اسے راضی رکھنے کے لئے میں جھکتی چلی گئی۔ ہر کوئی اسی امید پہ جی رہا تھا کہ کبھی تو وہ اپنے شکار پہ رحم کھائے گا لیکن ایسا کبھی نہ ہوا۔

میرے حاملہ ہونے کے باوجود چیزیں ویسی کی ویسی ہی رہیں سوائے میرے وجود کے جو بھاری ہو گیا، تشدد کے خوف کے جو بڑھ گیا اور میرے فرائض جو وسیع تر ہو گئے۔ مجھے بہت سی دعاؤں کی ضرورت تھی لیکن میرے ارد گرد لوگ صرف ایک ہی دعا مانگتے سنائی دیتے، مولا مالک کو بیٹا دے اور پہلے کے بعد چھ اور بیٹے، میں جہاں سے بھی گذرتی یہی آواز سنائی دیتی۔

ایک روز جب میرا ذہن وحشتوں اور قلب افسردگیوں سے بھرا ہوا تھا ایک لڑکی جسے میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا بل کھاتی ہوئی باورچی خانے میں داخل ہوئی۔ گندے برتن اکٹھے کرتے ہوئے اُس نے میری طرف دیکھا اور جیسے بنا آواز ہنس دی۔ اس نے مجھے آنکھ ماری جیسے کہہ رہی ہو، تمہارے پلک جھپکنے سے پہلے میرا کام ہو جائے گا، یقیناً کسی نے اُسے یہ کہتے ہوئے نہیں سنا ہو گا لیکن میں نے ضرور سنا۔

اس کی سیاہ رنگت کی وجہ سے لوگ اسے کالی کہتے تھے اماں سائیں نے اسے باورچی کی مددگار کیا بنایا وہ اتنی باصلاحیت اور کام کی تیز نکلی کہ ہر طرف چھا گئی۔ اگرچہ میں نگران کے طور پر سونپی گئی اپنی ذمہ داریوں سے بڑی بیزار تھی لیکن اب تو میں دوڑ دوڑ کے اس کے قریب پہنچتی۔ میں نے ماں کے لئے چیخنا تڑپنا چھوڑ دیا۔

ہم دونوں جب بھی اکٹھی ہوتیں ہمارے درمیان بجلی کے شعلے سے بھڑکتے رہتے۔ کالی کی ہرنی جیسی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ مسکراہٹوں کے بجائے جیسے پھلجھڑیاں پھوٹ پڑتیں۔ اس کے رخسار بے ترتیب بالوں سے ڈھکے رہتے اور لمبی چوٹی اس کی کمر پر دائیں بائیں یوں لہراتی جیسے کوئی سانپ، کالی کی نقل و حرکت پارے کی طرح ہوتی۔ اس کے افعال میں احتیاط کا کوئی عنصر تھا نہ اس کے ردِعمل میں کوئی بندشیں۔

اماں سائیں نے اسے کسی اور کام پہ لگا دیا تو مجھے اس بڑھیا سے نفرت سی ہو گئی۔ لیکن جب میں دور دور سے کالی کی ہنسی سنتی تو میری بے چارگی اور افسردگی گھنٹیوں جیسی اس کی آواز سے دور ہو جاتی۔

کام کھیل میں بدل گیا،
کالی کسی خوبصورت میٹھے سروں والے ساز کی طرح اُسے کھیل رہی تھی۔

وہ غریب
لیکن دولت مند تھی

میں امیر لیکن تہی دست تھی۔ میں وہ کچھ بننا چاہتی تھی جو کالی تھی، یہ احساس ہوتے ہی کہ وہ تمام چیزیں جو ہمارے دلوں کو بھاتی تھیں ہماری آنکھوں سے پھوٹنا شروع ہو گئی تھیں کالی اور میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بولنا شروع کر دیا۔ یہ سب کچھ چیل کی نگرانی کے باوجود ہو رہا تھا۔ جب میں کالی کی طرف دیکھتے ہوئے دل میں یہ سوال اٹھاتی "رُک جاؤ!

میرے قریب آؤ" وہ اپنے ابرو کمان کی طرح اٹھاتے ہوئے گویا جواب دیتی "اس سے بہتر کام اور کیا ہو سکتا ہے۔" "میں آنکھوں ہی آنکھوں میں ہنس دیتی "اُسے خبر ہو جائے گی" ساتھ ہی پیر سائیں کا خیال مجھے خوفزدہ کر دیتا۔ کالی مجھے تسلی دیتی "ایک مرد جو تمہارے دل میں داخل نہیں ہو سکتا، وہ تمہاری آنکھوں میں کیسے اتر سکتا ہے؟" اور میں سکھ کا سانس لیتی۔

کبھی کبھی کالی میرے قیمتی کپڑوں کی طرف یوں دیکھتی کہ میرا دل چاہتا ابھی اور اسی وقت انہیں اتار کے اُسے دے دوں، لیکن وہ اپنے بازو باہر کی طرف اوپر اور نیچے پھیلاتے ہوئے مجھے روک دیتی اور گویا کہتی "تم مور ہو اور میں تو بس فضول سی بھوری مورنی" ہم نے اپنے کاموں کی اس زبان میں اتنی مہارت حاصل کر لی تھی کہ جب میں دیگ میں کفگیر زور زور سے رگڑتے ہوئے بلا رہی ہوتی مجھے یقین ہوتا کہ میرا پیغام اس تک پہنچ رہا تھا۔ چیل کو یہ سب کہاں سمجھ آتی۔ وہ بے خبر تھی۔

ہر دفعہ جب کالی کسی اور کام کے لئے جاتی تو میں اس کے انتظار میں جلتی بھنتی رہتی، اگر کبھی اس کا موڈ خراب ہوتا تو وہ برتنوں کی پالی اپنے سر پہ اٹھائے میری پرواہ کئے بنا چل دیتی۔ جب وہ مجھ سے صلح کی غرض سے بڑھتی تو میں اڑ جاتی اور اس وقت تک اسے نظرانداز کئے رہتی جب تک وہ برتنوں کے ڈھیر کو پاؤں کی ٹھوکر سے گرا کے شور نہ مچاتی۔ اماں سائیں کی طرف اس کی طلبی ہوتی جہاں اس بدتمیزی پہ اُسے کوئی کرارا سا تھپڑ پڑتا اور پھر وہ لوٹ آتی۔ منہ پُھلائے اس مصیبت کے لئے وہ مجھے ذمہ دار گردانتی۔ یوں ہی ہم آپس میں کھیل بھی لیتیں۔

ایک روز جب وہ نل کے نیچے گاگر بھر رہی تھی میں اس کے پاس سے گذری۔ بہتے ہوئے پانی کو دیکھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اس گاؤں میں کوئی دریا نہیں جہاں ہم دونوں نہائیں اور کھیل سکیں؟

جواباً کالی نے گاگر ایک نوکرانی کے اوپر انڈیل دی، اوپر سے قہقہے لگاتے ہوئے وہ پُھنکارتی عورت کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ گرمی بہت ہے، تم دریا میں نہا رہی ہو۔ میں بھی ہنس رہی تھی کہ وہ کالی کو گھسیٹ کے اماں سائیں کے سامنے لے گئے۔ اس سہ پہر کو میرے خاوند نے اس کی پٹائی کی۔ اِس کے باوجود اُس نے مجھ سے آنکھیں لڑاتے ہوئے کہا، کیا دریا کو تمہارے پاس لانے کا صرف یہی ایک طریقہ نہ تھا؟

کالی میرے زنداں خانے سے اچانک غائب ہو گئی۔

ہفتہ بھر بعد مجھے خبر ہوئی کہ اسے خانقاہ کے خاکروب کے بیٹے سے بیاہ دیا گیا تھا۔

میں نے اس کے خلاف اماں سائیں سے شکایت کی جنہوں نے مجھے ہی جھاڑ پلاتے ہوئے جواب دیا "یہ برابر کا جوڑ ہے، تم ان سے کیسے یہ توقع رکھتی ہو کہ وہ اس کی عزت کریں۔" کالی کی یاد نے اتنا ستایا کہ مجھے باقی سب ہی لوگوں سے دلی نفرت ہو گئی۔ خصوصاً چیل کے خلاف جو شاید جانتی تھی کہ جدائی کا میرا زخم کتنا گہرا تھا۔

اپنے خاوند کے طرزِ عمل کے باوجود میں ان گدھوں کے درمیان زندہ سلامت تھی۔ بلکہ اس کی مشکور کہ اس نے اُن کے بجائے میرا انتخاب کیا تھا۔ میری جدوجہد، میرا مقابلہ اب ان ہی نوکرانیوں سے تھا۔ مکمل بربادی سے بچاؤ صرف اس وجہ سے ممکن ہو سکا تھا کہ میں اس کی منکوحہ تھی۔ اماں سائیں نے مجھے بتایا تھا، جب ایک عورت اپنے خاوند کے بستر پہ قابو پالیتی ہے تو وہ اس قوت کو جہاں جس پہ چاہے استعمال کر سکتی ہے یہی تو آرٹ تھا۔

پسی ہوئی عورتیں اس آرٹ میں مشاق ہوتیں، اماں سائیں بھی ایسی ہی تھی۔ یہ بات سرگوشیوں میں سُنی جاتی تھی کہ وہ اپنے خاوند کی خواہشات کو دلفریب انداز والی کسی پیشہ ور عورت کی طرح پوری کیا کرتی تھی۔ اس کی مقناطیسی شہوانی قوت دن کے وقت انتظامی قوت میں بدل جاتی تھی۔

اماں سائیں نے اس وقت اس افواہ کی تصدیق کر دی جب ایک روز انھوں نے مجھ سے کہا کہ "سب ہی عورتیں جانتی ہیں کہ مرد کو جنس کے علاوہ کوئی طاقت زیر نہیں کر سکتی لیکن پھر بھی ان کی اکثریت اسے قابو رکھنے میں ناکام رہتی ہے۔"

یہ سوچتے ہوئے پیر سائیں کی خوفناک چپ اُسے کبھی بھی میرا اسیر نہ ہونے دے گی میں نے جرأت کر کے اُن سے پوچھ ہی لیا کہ "میرا خاوند تو مجھ سے ایسی کوئی بات ہی نہیں کرتا تھا۔" اماں سائیں نے میری شکایت مسترد کر دی۔ "اس کا انداز اس کے مرتبے کے مطابق ہے۔ وہ کوئی عام آدمی تھوڑا ہی ہے وہ گلی محلے والے عام لوگوں کی طرح ٹر ٹر تو نہیں کر سکتا۔ اس کو باتوں اور الفاظ سے نہیں عمل سے اپنے ساتھ جوڑنا ہے۔"

اس بستر کو استعمال کرنا میرے لئے ممکن نہ رہا تھا جس پہ میری کوئی حیثیت ہی نہ ہوتی تھی۔ بہر حال اس پہ ہونا بھی میری قبر میں دراڑ کے برابر تھا اور کالی کے جانے کے بعد

میں اس دراڑ کو وسیع تر کرنا چاہتی تھی۔ یہ ان کو جلانے کے لئے ضروری تھا جو اس کا تمسخر اڑایا کرتی تھیں۔

اپنا سر بلند رکھے، اپنی دشمنوں کو کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے ہونٹوں پہ زبردستی کی مسکراہٹیں لئے میں پیر سائیں کے قدموں پہ خواب گاہ میں داخل ہوتی، لیکن جونہی عقبی دروازہ بند ہوتا میرا سر جُھک جاتا اور ہاتھ گود میں دست بستہ ہو جاتے۔ جب وہ میری طرف بڑھتا تو میں غارت گری کا ایک اور مظاہرہ دیکھنے کے بجائے اپنی آنکھیں بند کر لیتی۔

ایک سہ پہر میں جائے نماز پہ تھی کہ "کالی! کالی" کی آوازیں آئیں۔ میں نماز چھوڑ کے سُننے لگی۔ میں جانتی تھی وہ صرف مجھے ملنے آسکتی تھی۔ میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ قریب آتی گئی اور اس کے اردگرد کھڑی عورتیں پس منظر میں دھندلاتی گئیں۔

کالی کی آنکھیں میری آنکھوں کی طرح بجھی ہوئی تھیں۔

اُس نے میرے چہرے کے تاثرات کو ایک نظر میں جانچا اور ہنس دی، لیکن کیوں؟ ایسے ہی۔ اس ہنسی کی جگہ جو کبھی معمولی معمولی باتوں پہ دل کی گہرائیوں سے ابل ابل پڑا کرتی تھی ایک محض تاثر نے لے لی تھی جسے میں جان گئی، اگر اس کا خاوند نامرد تھا تو پھر وہ اتنا خوف زدہ کیوں دکھائی دے رہی تھی؟ اس کی خاموشی اتنی بلند آہنگ تھی کہ اس نے میری زندگی کے سب ہی خلا پُر کر ڈالے تھے۔ وہ دبلی پتلی لاغر نظر آ رہی تھی۔ اس کے بال الجھے ہوئے جلد خشک اور پھٹی ہوئی تھی۔ وہ لنگڑا رہی تھی اور پاؤں بھی گھسیٹ رہی تھی۔ اس کا ستواں وجود جھک گیا تھا جیسے کشش ثقل نے کھینچ ڈالا ہو۔

وہ ہر روز دوپہر کو آتی اور سورج غروب ہونے پہ چلی جاتی اس کی آنکھیں روز بروز جھکتی گئیں یہاں تک کہ انہوں نے اُٹھنا چھوڑ دیا۔ نوکرانیوں نے اس کا تمسخر اڑانا جاری رکھا۔ لیکن کالی اب کوئی ردِعمل نہ دکھاتی تھی۔ ان میں سے ہر کوئی اس کی مشکلات کے بارے میں جانتی تھی اگر کوئی بے خبر تھا تو وہ میں تھی۔ میں نے ہر جگہ ہر بات سننے کی کوشش کی لیکن کالی کا راز مجھ پہ نہ کھل سکا۔ میں صرف اتنا جان سکی کہ کالی کا سُسر یتیم ہو جانے کے بعد مزار پہ قبریں دھونے کے کام پہ لگ گیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ میرے خاوند کے خاصا قریب تھا۔

میں نے بہت کوشش کی کہ کالی میری بے زبانی کا جواب دے لیکن میرے خاموش سوالوں کا کوئی جواب نہ آیا۔ تمہاری زندگی میں یہ کیا ہو رہا ہے؟ میری آنکھوں نے پوچھا

لیکن وہ چپ رہی۔ ایک روز وہ آئی تو اس کی ایک آنکھ سیاہ تھی دوسرے روز دوسری بھی۔ دن بھر میں جاسوسوں سے چھپتی اُسے اشارے کرتی رہی، یہ کس نے کیا؟ ہر بار وہ سر دوسری طرف کر لیتی۔ اس امید میں کہ شاید وہ بولے میں نے چیل کی موجودگی میں بڑی بے باکانہ نظروں سے دیکھا لیکن کالی اپنا چہرہ گندے کپڑوں میں چھپائے چل دی۔

میں نے اپنی روح سے ماورائی ہوتے ہوئے اس کی روح میں بسنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن اب کالی بھی میری طرح بُجھ رہی تھی۔ ایک سہ پہر چیل اور اس جیسی کئی دوسری تیز نگاہوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میں سیدھی سرکش درخت کے نیچے ڈھیر ہوئی کالی کے پاس جا پہنچی۔ زندگی میں پہلی دفعہ میں اپنی آواز میں اس سے مخاطب ہوئی "تجھے کیا مشکل درپیش ہے، مجھے بتا میں پیر سائیں کو کہوں گی کہ وہ تیری مدد کریں۔"

کالی اُس کا نام سنتے ہی جیسے منجمد ہو گئی۔

میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔

نگاہیں ہمیں جلائے جا رہی تھیں۔

کالی چل دی۔

بے خودی کے عالم سے زخم خوردہ حالت میں نکلتے ہوئے میں دوسری سمت چلی گئی۔

اس روز کے بعد سے عورتوں نے کالی کا جینا مزید دوبھر کر دیا۔ اُن کے طنز کے تیر اور ظالمانہ الزامات بدترین ہوتے چلے گئے۔ اس کا نام بھی بدل دیا گیا، اب وہ سب اُسے کالی کتیا کہنے لگیں۔

مجھے خیال آیا کیا اماں سائیں کو میرے اُس سے بات کرنے کی خبر تھی؟ کیا چیل پیر سائیں کو بتائے گی؟ اماں سائیں مجھے پہلے ہی تنبیہ کر چکی تھیں کہ "تمہارا کسی گھٹیا لڑکی سے تعلق نہیں ہونا چاہیے تمہارا خاوند اسے کبھی نظرانداز نہ کرے گا۔" لیکن خیریت رہی کچھ بھی نہ ہوا۔

ایک اور روز جب کالی آسمان کے پار نظریں جمائے بیٹھی تھی میں دنیا جہان کو بھلائے ایک بار پھر اس سے وعدہ کر رہی تھی "کچھ مجھے ہی بتاؤ تم کس مسئلے کا شکار ہو، میں وعدہ کرتی ہوں اپنے میاں کو نہ بتاؤں گی۔"

اس کے چند الفاظ نے میرے دل کے ہزار ٹکڑے کر ڈالے۔

میں نے اُسے اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کا سر جہاں ٹِکا تھا میری قمیص وہاں سے بھیگ گئی۔ کالی کا جہنم میرے جہنم سے کہیں بھیانک تھا۔ عورتیں ہر طرف سے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ چیل تو ہم دونوں پہ جھپٹا مارنے کو تھی، پھر ہم تیزی سے ایک دوسری سے الگ ہوئیں اور مختلف کاموں کے لئے کھسک گئیں۔

رات ہوئی، صبح آئی شب و روز ایک دوسرے کو بہالے جاتے رہے یہاں تک کہ بہت دن بیت گئے۔ میں کسی اگلے قتلِ عام کے روح فرسا تصور سے لرزتی کانپتی رہی لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

اب تک کسی نے اسے بتایا کیوں نہیں؟ کیا اسے بتا دیا گیا ہے؟ مجھے سخت تشویش تھی اور میں خوف سے کانپتی رہی، اسے کالی اور میرے متعلق خبر کیوں نہ تھی، وہ تو سب کچھ جانتا تھا۔ وہ اپنا ردِعمل ظاہر کیوں نہیں کر رہا تھا؟

چیل تو کچھ چھپانے والی نہ تھی۔

کالی کی کہانی اور میرے خوف کا گہرا امتزاج میری آنکھوں میں تندور کی خشک لکڑیوں کی طرح جل اٹھا۔ میرے بستر میں خرّاٹے بھرتی بلا اور یہ سب کچھ میری نیند کو بھگا دینے کے لئے کافی تھا۔ کالی پھر غائب ہو گئی۔

پہلے خبر اُڑی کہ وہ علیل تھی ساتھ ہی یہ کہ وہ حاملہ تھی۔ بچے کا باپ کون تھا؟ لوگ یہ جاننا چاہتے تھے۔ کوئی فرشتہ تو ہو نہیں سکتا، فرشتے کب اس کام کے لئے اترتے تھے۔ وہ ٹھی ٹھی کر کے ہنستے اور قہقہے لگاتے ہوئے اس کا تمسخر اُڑاتے اور میں دل ہی دل میں جلتی رہتی۔ میں نے پھر ماں کے لئے رونا شروع کر دیا۔

اس نے خط تک نہ لکھا تھا یا اس نے لکھا تھا؟ کالی کی کہانی سے میں اتنا ڈری کہ میں ماں کے وجود اور شفقت کے لئے تڑپنے لگی۔ پھر ایک روز اس نے خود ہی مجھے کہا "میں تمہاری ماں کو آنے کے لئے کہہ رہا ہوں۔" کیا اماں سائیں نے اسے کچھ کہا تھا یا اس نے میرے دل کی بات بوجھ لی؟ میں حیران تھی۔ ماں کی اطلاع ملے ہفتوں گزر گئے تو میں نے اسے پوچھنے کی جرأت کی۔ میں سمجھی وہ اپنا وعدہ بھول گیا ہو گا اس لئے میں نے اسے یاد دہانی کروائی "میں اس کے لئے پیغام بھیجوں گا" اس نے دُہرایا، ایک اور مہینہ گزر گیا، کچھ بھی نہ ہو رہا تھا۔ کیوں؟ مجھے دوبارہ پوچھنا چاہیے کہ نہیں؟ پہلی دفعہ بھی یہ خاصا مشکل لگا تھا، پھر مشکل تر

ہوتا چلا گیا اس کا طریق کار اذیت ناک تھا، وہ میرا گلا گھونٹ رہا تھا۔

یہ احساس کہ یہاں مجھے کسی قسم کے استفسار کی بھی اجازت نہ تھی مجھے دمے کا مریض بنانے کے لئے کافی تھا۔ میں نے پھر پوچھنے کی ہمت کی تو اس نے پھر جواب دیا "میں اسے بلاؤں گا۔" یوں مجھ پہ منکشف ہوا کہ وہ تو محض کھیل رہا تھا۔ پہلے وہ مجھے تسلی دے کے پُرسکون کرتا اور پھر مجھے انتظار کی دیوانگی اور وحشت کی طرف دھکیل دیتا۔

کالی کی حالت زار کا دکھ ماں کی میری جان کھاتی ہوئی غیر حاضری سے مل کے میرے دل میں رستا ہوا پھوڑا بن گیا۔ صبح سویرے جب میں الماری کھولتی تو میرے دل میں اپنے ملبوسات کے ڈھیر کے خلاف نفرت امڈتی ہوئی محسوس ہوئی، لیکن حکم تھا کہ میں انہیں پہن کے بنی سنوری رہوں۔ دن بھر وہ مجھے کچوکے لگاتے رہتے کہ ماں نے مجھے انہی کے بدلے بیچ ڈالا تھا۔ انہیں دیکھتے ہوئے مجھے کالی کی یاد اور بھی شدت سے ستاتی۔ کاش میں وہ سب کچھ اسے دے سکتی۔

باب ۴

جہنم

خانقاہ کے ارد گرد آوارہ کتوں کا پڑاؤ تھا جو دن بھر زبانیں لٹکائے ٹکڑوں کی تلاش میں مارے مارے پھرا کرتے۔ آبادی کی گلیاں کتوں اور ایسے بھکاریوں سے بھری رہتی تھیں جو انہی جیسے حالات میں زندہ رہتے ہوئے بھی انہیں حقارت کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ ہر دو لاغر اور مریل ذی روحوں کی صبح شام کا آغاز اور اختتام گالیوں، ڈنڈوں اور پتھروں کی زبان میں ہوا کرتا۔

یہاں بے گھر بھک منگوں کو بار بار مزار سے باہر دھکیلے جانے اور کتوں کو گلیوں سے بھگائے رکھنے میں یک گونہ مماثلت تھی۔

چند لمحوں کی بے دخلی کے بعد کتے دُمیں دبائے اور بھکاری گودڑیاں سنبھالے ڈبکتے سرکتے ہوئے ایک بار پھر اپنی مخصوص نشست گاہوں اور ٹھکانوں پہ جا پہنچتے۔ گانجا، افیون یا ہیروئین کے نشے میں ڈوبے ہوئے اُن لوگوں کے نزدیک مزار کا وسیع و عریض احاطہ گویا ماں کی گود تھا۔ تبرک، نیاز اور لنگر میں بٹتے ہوئے نان کے ٹکڑے نگلتے نگلتے وہ وہیں ڈھیر ہو رہتے۔ نشے اور پیٹ پوجا کے علاوہ اُن کا سارا وقت خانقاہ کے صدر دروازے پہ آتے جاتے زائرین کے سامنے کالے پیلے کشکول پھیلائے رکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ خانقاہ کی زندگی اسی چکر کا نام تھا۔

پیر سائیں کی کتیا نے جھول بھر بچے دیئے اگرچہ وہ اپنی پود سے اتنا ہی مختلف تھی جتنا اس کا مالک اپنی اولاد سے۔ وہ اس کتے کے پس ماندگان میں سے تھی جسے اُس نے بچپن میں پالا تھا اور پھر اس کی نسل کا یوں تحفظ کیا جیسے کوئی اپنے حسب نسب کا کرتا ہے۔

جھلسا دینے والی تپش اور گرمی کے بعد آنے والی شدید سردی کا مقابلہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ میرے خاوند نے پلوں کو سٹور کے عقب میں ایک گرم اور آرام دہ کمرے میں منتقل کر دیا۔ ہر شام خواب گاہ میں واپسی سے پہلے ہر پلے کو ٹٹولنا، دیکھنا، بھالنا، چومنا اور چاٹنا اس کا معمول ہو گیا۔ وہ اکثر انہیں پیار کے ساتھ اپنے بدن سے لگائے ہوئے نظر آتا۔ کمرے کی روشنیاں گل کئے کھڑکی کے پردوں میں سے جھانکتے ہوئے میں سوچا کرتی وہ مجھ پہ تو کبھی

ایسا مہربان نہ ہوا تھا، اس نے میری کوتاہیوں اور بھول چوک سے تو کبھی چشم پوشی نہ کی تھی۔ یہ سوچتے سوچتے میں چکرا جاتی۔ آخر وہ کون سی ایسی نادیدہ قوت تھی جس نے کتیا کے ان بچوں کے لئے اس کے دل میں بے کراں شفقت اور میرے لئے اتنی ہی حقارت بھر دی تھی۔

بوڑھی دائی اماں جس نے میرے میاں کو پالا پوسا تھا اب ماضی کے قصے کہانیاں دہرانے کے سوا کسی کام کی نہ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس نے مجھے پیر گھرانے کی وہ داستانیں سنانا شروع کر دیں جن کا انکشاف بظاہر بے ضرر تھا۔ "وہ کتری چیل تو ہر وقت ٹوہ میں رہتی ہے، کہیں وہ تم پہ مخبری تو نہ کرے گی؟" ایک روز میں نے اس سے پوچھا۔

دائی نے میرے خدشات کو جھٹک دیا "اس لم ڈھینگی کے پاس اور بہت کچھ ہے بتانے کو، مجھ کھوسٹ کی اب کسی کو کیا پرواہ، گزرے زمانے کی میری باتیں بھلا کسی کو کیا نقصان دیں گی، مالک کو تو بالکل نہیں۔"

لیکن اس تجاہلِ عارفانہ کے باوجود میرے سوجے ہوئے بھاری پاؤں پہ تیل ملتے ہوئے یا بڑھتے ہوئے حمل کے بوجھ تلے دُکھتی میری کمر دباتے ہوئے وہ جو کچھ بھی کہتی نیم سرگوشیوں میں ہی کہتی۔

"پیر سائیں کو بچپنے سے ہی خانقاہ کے آوارہ کتوں سے پیار تھا" اس نے ایک روز مجھے بتایا، "لیکن آوارہ کتے پلید ہوتے ہیں اسے اُن سے کھیلنے کی اجازت کون دیتا۔ اس کے بابا، مخلوق کے آٹھویں پیر کو یقین تھا کہ اُن کا وارث اس بُرے شوق اور لت کی بدولت اُن کے کسی کام کا نہ رہتا۔" بات کرتے کرتے وہ اچانک اُٹھی، اس نے اپنی جالا لگی بوڑھی آنکھیں چاروں طرف دوڑائیں اور پھر میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولی "اس امید میں کہ ایک روز وہ اپنے باپ کی امیدوں پر پورا اتر سکے۔ اماں سائیں اسے بے دردی سے پیٹا کرتی تھی، لیکن لڑکا اس کے باوجود نہ آیا۔ وہ بار بار کتوں سے کھیلتے پکڑا جاتا۔ بالآخر بڑے پیر نے اُسے سبق سکھانے کا تہیہ کر لیا ..... ۔"

دائی نے اس سے آگے کچھ بھی کہنے سے انکار کر دیا۔ اس کی سانس خشک ہو رہی تھی۔ میرے کئی روز کے اصرار اور منت سماجت کے نتیجے میں ایک سہ پہر اس نے ٹوٹے ہوئے سلسلے کو دوبارہ جوڑنے کی ہمت کی۔ اشاروں کنائیوں میں وہ مجھے چیل کی تیز اور شاطر نگاہوں سے دور ایک محفوظ گوشے میں لے آئی۔ "جنت مکانی بڑے پیر نے چھوٹے میاں کو

دو چار نہیں سترہ آوارہ خارش زدہ کتوں کے ساتھ ایک اندھیری حبس زدہ کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ وہ اٹھارہ، سترہ کتے اور ایک بچہ تین دن اور تین راتیں وہیں مقید رہے۔ میرا مُنہ کُھلے کا کُھلا رہ گیا، یہ کیسا ہولناک انکشاف تھا۔

میرے گھر پہ جو قیامت مسلط تھی اس کے ڈانڈے پکڑے گئے۔ میرا میاں جو کچھ بھی تھا انہی شب و روز کی پیداوار تھا۔ بڑے پیر کی موت کے بعد شہرت، دولت طاقت اور عزت میرے میاں کی لونڈی ہوئیں، لیکن اس واقعہ کا اس کے ذہن پہ اتنا بھاری بوجھ رہا کہ اپنے شوق کی طرف پلٹتے ہوئے اُسے کئی سال لگے، پھر جلد ہی وہ وقت آ گیا جب کسی اعلیٰ نسل کتے کو دیکھتے ہی وہ دیوانہ ہو جاتا۔ کون سا کتا کون سی کتیا کے ساتھ جفت ہو گا اب دنیا میں اس کے سوا کسی کو اس فیصلے کا حق نہ رہا تھا۔

پچھلے آٹھ ماہ سے میری ماں نے نہ تو مجھے کوئی خط لکھا نہ ہی وہ ملنے ہی آئی۔ میرے دل میں اپنے میکے کے بارے میں لاتعداد تفکرات جنم لیتے رہے جنہیں دور رکھنے کے لئے جب بھی موقع ملتا میں دائی کو ڈھونڈ نکالتی۔ اس کا سامنا ہوتے ہی میں اس پہ اُلٹے سیدھے سوالوں کی بھرمار کر دیتی اور وہ اُن کا جواب دیتے ہوئے پرانے قصے کہانیوں میں کبھی سلسلہ دار کبھی بے ربط سندھی رلی کی طرح کے رنگ برنگے پیوند ٹانکتی رہتی۔

حویلی کی نوجوان نوکرانیوں کی چٹ پٹی باتوں کے مقابلے میں مجھے جاگیرداروں کے قصے ہمیشہ زیادہ دلچسپ اور دلفریب لگے۔ دائی یادوں کی بارات میں مگن رہتی اور میں کان اس کی طرف لگائے حلوے کے لئے گندم کے چوکر کو خشک کرنے کی نگرانی کرتی۔ وہ کہہ رہی تھی "ایک روز گورے حکمران درشن کے لئے بڑے پیر کے قلعے میں آئے۔ پیر بابا کو دیوتاؤں کی طاقت حاصل تھی اس روز خانقاہ کے حفاظتی انتظامات بڑے سخت تھے۔ قلعے کی فصیل پہ ہر چھ فٹ بعد ایک لمبا تڑنگا مسلح محافظ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ فرنگی پیر کو اپنا قرب بخشنے سے پہلے اس کی تصرف کا احاطہ کرنا چاہتے تھے۔ پیر نے اپنی پُر جلال نگاہ فصیل پہ متعین بت نما ایک محافظ پہ ڈالی اور ساتھ ہی اُسے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ محافظ نے پلک جھپکتے میں بلند فصیل سے نیچے چھلانگ لگائی اور آواز نکالے بغیر زمین پہ ڈھیر ہو گیا۔ شاہی سرپرستی میں پیر خانے نے وہ جڑیں پکڑیں کہ سو سال بعد اب بھی لوگ اس پیر کے سجادہ نشینوں کے ہاتھ کی ایک جنبش پہ جان دے دیتے ہیں۔"

ایک دوسرے پیر کی کہانی سکتے سکتے میں لرز گئی۔ وہ بانجھ عورتوں کو بیٹے دیا کرتا تھا۔ پیر گودیں تو ہری کرتا تھا لیکن نگوڑی ماؤں کو اپنی اولادِ نرینہ اس کی خانقاہ کو ہی دان کرنا ہوتی تھی۔ نذر کے ان نو مولود بچوں کے سروں پہ لوہے کے ٹوپ چڑھا دیئے جاتے تھے۔ ان کا جسم تو بڑھتا لیکن سر ہمیشہ کے لئے پیدائش کے روز جیسا ہی رہ جاتا۔ اسی مناسبت سے یہ بچے چوہے کہلاتے۔ چوہوں کی یہ کھیپ گلی گلی کوچہ کوچہ بھیک مانگنے کے لئے استعمال ہوتی۔

ان لرزہ خیز کہانیوں سے مجھے کم از کم یہ احساس ضرور ہوا کہ حالات کے اس خوفناک گرداب میں میں تنہا نہ تھی، وہاں اور بھی بہت تھے۔ میں سوچا کرتی دوسرے پیر گھرانوں کی بے نام، بے چہرہ مجھ جیسی عورتوں پہ کیا کچھ نہ گزرتی ہوگی۔ یقیناً وہ میری ہی طرح گرفتارِ بلا ہوں گی۔ پیر سائیں اپنے مریدوں کا بلا شرکتِ غیرے حکمران تھا۔ مرد و زن کی مجال تھی کہ وہ اس کی خواہشات کے آگے چوں چراں کرتے۔ خدا اور اس کے محروم و مقہور بندوں کے درمیان وہ فوری اور براہ راست وسیلہ سمجھا جاتا تھا، بلکہ وہ چاہتا تو لوحِ محفوظ کا لکھا بھی ٹل سکتا تھا۔

لوگ اس کے عقیدت مند نہیں پجاری تھے۔ اماں سائیں کا دعویٰ تھا کہ وہ اولادِ پیغمبر تھے اور یہ کہ پیر خانے کی چودہ سو سالہ طاقت کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔

لنگر کی مفت دال روٹی اور بھنڈارہ ان گنت غریب غرباء کی خانقاہ سے وفاداری کا ضامن تھا۔ لوگ خالی ہاتھ برہنہ پا، بیل اور گدھا گاڑیوں پہ دنوں، ہفتوں اور مہینوں کی یاترا پہ نکلتے تھے۔ قسمت سے پیر سائیں کا اذنِ دیدار ہو جاتا تو گروہ کے گروہ اس کے قدموں پر گر پڑتے۔ وہ خانقاہ کے کتوں کی طرح لمبی زبانیں نکالے اس وقت تک اس کے پاؤں چومتے رہتے جب تک کوئی خلیفہ انہیں پرے نہ دھکیل دیتا۔

اُن کے لئے اُس کے الفاظ مہلک ہتھیاروں سے زیادہ کاٹ دار تھے۔ وہ عاجزی اور لجاجت سے اسے اپنے دشمنوں کے زیر ہونے کی دعاؤں کے لئے کہتے، روزگار، صحت، شادی، زندگی اور موت کون سا ایسا انسانی مسئلہ تھا جس کے حل کے لئے انہیں اس کی رہنمائی، پشت پناہی اور دعا کی ضرورت نہ ہوتی۔ معاوضے میں تن، من اور دھن جو بن پڑتا وہ اس کی نذر کرتے۔

اپنے لاغر اور بے جان بیمار بچوں کے واسطے دیتے ہوئے زائرین پیر سائیں سے اس کے وضو میں استعمال ہوئے پانی کے تبرک کی التجائیں کرتے۔ اس کی پھینکی ہوئی ہڈیوں

کے حصول کی خاطر وہ ایک دوسرے پہ پل پڑتے۔ چوسی ہوئی متبرک ہڈیاں شفا بخش سفوف اور بینائی افروز سرمہ بنانے کے کام آتی تھیں۔ وہ اس کے جوتوں تلے آئی مٹی اٹھا لے جایا کرتے۔ یہ خاکِ شفاء جھونپڑیوں اور مکانوں کے در دروازوں پہ چھڑکی جاتی کہ اس میں ہر بلا سے نجات تھی۔ اسے گھول کے پیا جاتا کہ یہی آبِ حیات تھا۔

میرے میاں نے ان لوگوں کے لئے کبھی کسی قسم کے جذبات کا اظہار نہ کیا لیکن کسی کو یہ سوچنے کی ضرورت نہ تھی کہ ایسا کیوں تھا، لوگوں سے اس کی دوری کو خدائی صفت قرار دیا جاتا تھا۔ کوئی یہ تصور کرنے کی جرأت بھی نہ کر سکتا تھا کہ یہ تو محض ایک ڈھونگ تھا۔ اس کی موجودگی اتنی بھرپور ہوا کرتی کہ اگر کوئی دیدار کے لئے براہِ راست اس کے چہرے پہ نگاہ ڈال لیتا تو مدہوش اور مسحور ہو کے رہ جاتا۔ مُرشد کی آنکھوں میں بڑی عجیب سی چمک تھی جسے مرید خدا کے نور سے تعبیر کرتے تھے۔

حُجرے میں اس کی کھاٹ کے ساتھ وہ میز ہوتی جس پہ ہر افتاد، پتا، خواب اور تمنا کے حل اور حصول کے لئے سامان رکھا ہوتا کاغذ، قلم، زعفران کی سیاہی، دم کئے چاول اور دانے، ریٹھے اور کھجور کی گٹھلیاں اور سب کچھ ..... کھاٹ پہ براجمان وہ اپنا قلم زعفران میں ڈبو ڈبو کر کاغذ کے پُرزوں پر لکیریں کھینچتا رہتا۔ تعویزوں کو تہہ کرنے کے بعد مزید خیر و برکت کے لئے وہ ان پہ پھونکیں مارتا۔

"تعویز کو رات بھر پانی میں بھگو رکھنا۔ اگلی صبح وہ پانی اپنے مخالف کو پلا دینا، یہ ممکن نہ ہو تو اس کے صحن میں چھڑکاؤ کر دینا۔ بس دشمن دوست ہو جائے گا" دشمن دار سائل مالک کے پاؤں چاٹتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ سلامی کے لئے پیشانی پہ رکھے اُلٹے قدموں بارگاہ سے نکل جاتا۔ چینی پہ پھونک مارتے ہوئے پیر سائیں دوسرے سائل کو کہتا "آج رات اپنے مالک کی چائے میں یہ چینی پہ ڈالنا۔ صُبح کو تمہاری تنخواہ بڑھ جائے گی۔" اگلے سائل کے چہرے پہ وہ تھو تھو کرتے تھوکتے ہوئے اسے سرطان سے شفا کی خوشخبری دے رہا ہوتا۔

میرے میاں کی ناکام دعاؤں کا بھی جواز ہوتا تھا۔ مثلاً یہ کہ "تمنا فوری پوری نہ ہونے میں اس سے کہیں بڑی بہتری پوشیدہ ہوگی۔" کبھی جب امید بر آنے کا انتظار طویل تر ہو جاتا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سائل پہ خدا کی اس ناراضگی کا راز کھول دیتا۔ خدا کو راضی کرنے کا طریقہ اکثر لمبا اور بہت مہنگا ہوتا۔ اگر اُس سے گزرنے کے باوجود کوئی صورت نہ بنتی

تو وہ حتمی فتویٰ دیتا کہ "خدا تمہارے صبر اور ہمت کا امتحان لے رہا ہے، تمہیں اگلے جہان اس کا انعام ملے گا۔" اگر وہ کسی مرید سے ناخوشی کا اظہار کر دیتا تو اس کی دنیا جہان اندھیر ہو جاتی اور وہ اس کی رضا تک اس کے در کا ہی ہو رہتا۔ پیر سائیں کے مائل بہ کرم ہونے میں ہفتے، مہینے اور سال لگ سکتے تھے۔

خدا کی رضا اس کی رضا اور ناراضگی اس کی ناراضگی میں تھی۔

اثر و رسوخ والے امراء بھی عوام ہی کی طرح اس کی چوکھٹ پہ بیٹھنا باعث سعادت سمجھتے تھے۔ فرطِ عقیدت میں اس کے پاؤں اور پنڈلیاں دباتے ہوئے وہ بڑے بڑے تجارتی سودوں، کروڑوں کے ٹھیکوں اور بھاری مالیت کے لائسنس اور پرمٹوں کے حصول کے لئے اس کی روحانی منظوری کے طالب رہا کرتے۔ اپنے شب و روز کی حاضری میں وہ اُسے ان معاملات کی تازہ ترین صورتِ حال سے باخبر رکھتے تاکہ اس کی نظرِ کرم ہر لمحے ان کی حاجتوں کا احاطہ کئے رکھے۔ تمنائیں پوری ہونے پہ وہ اس کے لئے گراں قدر تحائف اور سیم و زر سے بھرے بریف کیس لئے آ پہنچتے۔

ابھرتے ہوئے بہت سے سیاستدان انتخابات میں اپنی فتح اور وزارتوں کے حصول کے لئے اس کے در کے سوالی ہوتے۔ پیر سائیں کا اثر و رسوخ اپنے علاقے تک محدود نہ تھا بلکہ ملک کے کونے کونے میں اس کے حلقے تھے۔ مریدوں کا سلسلہ دور افتادہ جنگلوں، پہاڑی اور صحرائی علاقوں تک پھیلا ہوا تھا۔ ان علاقوں سے دیدار کے لئے حاضری کو وہ امر ربی اور بلاوا سمجھتے تھے۔ ان کی آل اولاد اور ڈھور ڈنگروں کی طرح ان کی رائے اور ووٹ بھی اسی کی امانت تھا۔ یہ امر دار الحکومت میں اس کے مستقل اور ہمیشہ بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ اور مقام کا باعث تھا۔

دائی نے مجھے بتایا تھا کہ پیروں نے پورے ملک کو اپنی اپنی قلمرو میں بانٹ رکھا تھا۔ ہر انتخابی حلقے میں وہ آپس کے متعلقہ امیدواروں کی ہی تائید و حمایت کرتے تھے۔ پیروں کی غیر اعلانیہ یونین ملک کی سب سے بڑی سیاسی قوت کہی جا سکتی تھی۔

جب بھی کوئی ہمسایہ پیر ہمارے علاقے میں اپنے مریدوں کو درشن کروانے کا ارادہ کرتا تو یہ یونین اور یہ رشتہ کھل کے سامنے آ جاتا۔ حویلی کے باہر کھلے پڑاؤ میں شامیانے نصب ہو جاتے۔ گاؤں کی گلیوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں پہ چگتی مرغیاں یوں غائب

ہونا شروع ہوتیں جیسے وہاں بلاؤں کا گزر ہو رہا ہو۔ ہر ڈربہ خالی ہو جاتا، ہر کھیت چھان مارا جاتا یہاں تک کہ حویلی کے دالان میں بھی نوکرانیاں مرغیوں پہ پل پڑتیں اور اللہ اکبر، کے نعرے کے ساتھ قابو آئے ہر پرندے کی گردن کٹ جاتی۔ چڑھاووں کے بکرے دھڑا دھڑ ذبح ہوتے اور کئی گائے بھینسوں کی کھال غریب غرباء کے کھاجے کے لئے اتر جاتی۔ فضا میں ایک طرف گوشت اور لہو کی بو رچی بسی ہوتی تو دوسری طرف بادام اور کشمش کے دم دیئے ہوئے زردے کے تھالوں کے تھال اتر رہے ہوتے۔

معزز مہمان کی آمد سے ذرا پہلے پیر سائیں اللہ پاک کے ننانوے اسمائے حسنیٰ کی کڑھائی والی چادر اپنے چوڑے چکلے شانوں پہ ڈالے نمودار ہوتا۔ کسی شہنشاہ کی طرح اس کے سر پہ کالی پگڑی کا تاج سجا ہوتا۔ بے تابی، تجسس اور شوق کے اس عالم میں یوں لگتا جیسے کوئی دیوتا کسی دوسرے دیوتا کے استقبال کو نکل رہا تھا۔ ہجوم مزار کی سمت یلغار کرتے۔

ہر دیہاتی پیر سائیں کے تقدس مآب مہمان پہ عقیدت کے پھول نچھاور کرنے کے لیے اپنی باری کا منتظر ہوتا۔ خادمائیں حویلی کے جان لیوا کام کاج سے چند لمحے نکال کے ایک اور بابرکت ہستی کے پاؤں چھونے کو لپک آتیں۔ پوجا پاٹ کا روپ دھار کے اظہارِ عقیدت سے فراغت کے بعد مہمان پیر انواع و اقسام کے مرغن کھانوں پہ پل پڑتا۔ خورد و نوش کے بعد حجرے میں قدم رنجہ فرمایا جاتا جہاں بستر پہ نیم دراز ہو کے اپنی بزرگی کے بوجھ تلے دبے خاص خاص مریدوں کے دُکھ سکھ سُنے جاتے۔

یہ مریدانِ خاص اپنے پیر کی دعاؤں اور اس کے تحریر کردہ تیر بہدف تعویزوں کے طالب تو ہوتے ہی وہ اس کے وسیلے سے میرے میاں کی نگاہِ کرم کے بھی خواستگار ہوتے۔ رسہ گیروں کے ہاتھ چڑھی کسی غریب کسان کی گائے کی واپسی، اجناس کے سود میں پھنسی ہوئی رقوم کی بازیابی، جہیز لینے دینے کے جھگڑے اور تنازع اور چھوکریوں کے اغوا اور زنا کی فریادیں۔ حجرے کی کچہری میں سال بھر کے سب ہی مسائل پیش ہوتے اور مہمان پیر اُن کے حل کے لئے، دعا اور دوا دارو کرتا۔ دورے کے اختتام پہ گلوگیر دہقانوں کے ہجوم مہمان پیر کی تحائف سے لدی پھندی ان گاڑیوں کے قافلے کو الوداع کہہ رہے ہوتے جو اپنے عقب میں سوائے گرد و غبار اور بڑھتی ہوئی غربت اور جہالت کے اور کچھ نہ چھوڑتا۔

پیر سائیں بلا تفریق ہر دوسرے پیر کو عزت اور احترام سے یاد کرتا تھا اور یہی

دوسروں کا وطیرہ تھا۔ ان میں سے کسی کو کسی دوسرے سے نہ کبھی کوئی گلہ ہوا نہ شکایت۔ وہ سب اس نظام کے ستون تھے جو ان کے بقول دنیا کو تھامے ہوئے ہیں۔ پیروں کا گروہ صدیوں سے اس احساس سے سرشار چلا آرہا تھا کہ اس نظام کی بقا اور مضبوطی اُن کے آپس کے اتحاد، اتفاق اور باہمی عزت و احترام میں ہی تھی۔

صاحبانِ اقتدار پیر سائیں سے تیتروں اور جنگلی سور کے شکار کی فرمائشیں اکثر کیا کرتے جس کے دوران وہ خانقاہ کے مہمان ہوتے۔ ان مواقع پر بھی گاؤں میں مرغیوں اور بکریوں کی نسل کشی ہو جاتی۔ فضا میں ایک بار پھر گوشت اور لہو کی بو رچ بس جاتی بندوقچیوں سے بھری جیپیں اس شکار کی تلاش میں ہر سو فراٹے بھرنے لگتیں جو فضا اور زمین میں فرار اور پناہ کی راہیں ڈھونڈ رہا ہوتا۔ بہت سے مفت خور طفیلئے اس پہ پل رہے تھے بہت سوں کا خون وہ چوس رہا تھا۔

ہمارے ہاں جو بھی مال و متاع تھا وہ ہمیں اللہ کے لئے اور اس کے نام پہ دیا گیا تھا۔ کس کی مجال تھی کہ وہ اسے بخشش یا خیرات سمجھتا۔ کسان، مزارعے اور مزدور اپنا خون پسینہ بہا کے جو بھی کماتے اس میں ہمارا ربی حق تھا۔ فصل اٹھانے سے پہلے وہ اس دانے دانے کو ہمارے حوالے کر دیتے جس پہ ہماری مہر ہوتی تھی۔ مویشی اور مرغ اس تقسیم سے مبرا نہ تھے، ہمارا ان میں بھی سالانہ حصہ مقرر تھا۔ پیر خانے کے گودام ہر جنس سے ہمہ وقت لبالب بھرے رہتے تھے۔ کپڑوں کے تھان، انواع و اقسام کے برتن اور کٹلری اور بجلی کے چولہے کیتلیاں اور تنور، انفرادی اور کارخانوں کی طرف سے تحفے تحائف یہاں کسی شے کی کمی نہ تھی۔ کسی نے پیر سائیں کو لینڈ کروزر تحفے میں پیش کی تھی، کسی نے مٹسوبشی لانسر اور ایک معتقد نے تو تین چمکیلی پجارو جیپوں کا بیڑہ اس کے حجرے کے باہر لا کھڑا کیا تھا۔ غریب غرباء کے لئے مزار میں خام لوہے کا بکس رکھا تھا جس کی ٹانگیں فرش میں گڑی ہوئی تھیں۔ وہ دل کھول کے اپنی جیبیں خالی کرتے ہوئے اسے بھرتے رہتے۔ خزانہ دن میں دو دفعہ خالی کئے جانے کے باوجود ہمیشہ ہی بھرا رہتا۔ جن کے پاس دینے کو کچھ نہ تھا وہ اپنی جانیں وقف کئے رہتے۔ بے دام کے یہ غلام پیر خانے کے اندر اور باہر کے سب ہی بکھیڑوں کو سنبھالتے۔

میری طلائی پازیب ان انسانوں کے خون پسینے کا نچوڑ تھیں جنھیں میں نے کبھی نہ دیکھا۔ میرے کمخواب کے جوڑے ان ٹھٹھرتے ہوئے ننگے برہنہ پا بچوں کے گھروں سے آئے

تھے، جن کے تن ڈھانپنے کے لئے صرف میرے میاں کی دعائیں تھیں۔

کیا پیر سائیں مخفی روحانی قوتوں کا مالک تھا؟ یا یہ محض ان جاہل لوگوں کے ورثے میں ملے عقیدے کا کرشمہ تھا کہ وہ اُسے ایسا سمجھتے تھے؟

کیا لوگ اس کی درونِ حویلی زندگی اور کردار سے لاعلم تھے؟ کیا میری خواب گاہ کے اس کردار کو صرف میں ہی جانتی تھی؟

ایسے بے شمار سوال میرے ذہن میں اُٹھتے اور بنا جواب گم ہوتے رہتے، لیکن ایک روز جب میں چاروں شانے چت اس کے گھنے کالے کھردرے بالوں تلے پڑی ہوئی تھی مجھے اُن میں سے ایک سوال کا جواب ضرور مل گیا۔

عریاں ہوتے ہی اس کی بھرپور شخصیت کا سحر ختم ہو جایا کرتا تھا۔

جھوٹ اور سچ کے درمیان سوت کا ایک ہلکا سا پردہ تھا۔

وہ بھی کچھ تھا۔

آگہی کے درد کی ایک نہ ختم ہونے والی سرد لہر نے مجھے آلیا۔

اماں سائیں دن کا ایک حصہ سرکش درخت کے سائے تلے براجمان رہا کرتی جہاں دکھیا عورتیں جوق در جوق پہنچ کے اپنے درد و الم بیان کرتیں۔ مجھے اس کی حاضری اور قرب میں بیٹھے رہنے کا حکم تو تھا لیکن میں غیر ہونے کی وجہ سے تعویز دھاگہ کرنے کا اختیار نہ رکھتی تھی۔ یہ اعزاز تو پیروں کی مُقدس نسل کے کسی خاص فرد کو ہی وراثت میں ملتا تھا۔ اماں سائیں کاغذ کے پرزوں پہ زعفران کی سیاہی کے ساتھ ناقابل شناخت حروف اور لکیریں کھینچتی رہتی اور میں ان سوچوں میں کھوئی رہتی کہ کیا اللہ کی توجہ صرف انہی لکیروں کی وساطت سے مل سکتی تھی۔

وہ دعائیں جو پوری نہ ہوتیں بُھلا دی جاتیں، لیکن جو تمنائیں کسی بھی وجہ سے بر آتیں وہ نہ صرف پیر خانے کے معجزوں اور کرامات سے تعبیر ہوتیں بلکہ اندر ہی اندر اُن کی وسیع تشہیر بھی کی جاتی۔ ہجوم کبھی کم نہ ہوتا۔

بھوکی، بانجھ اور فاقہ زدہ بچوں والی عورتیں انہی وجوہات سے اپنے اپنے انداز میں واویلا کرتیں۔

جس بندے سے مجھے پیار تھا اس نے میرے ساتھ بیاہ سے انکار کر دیا ہے، جس

سے مجھے پیار ہے وہ کسی اور سے محبت کرتا ہے، پہلے وہ مجھے پیار کرتا تھا اب کسی اور کے عشق کا اسیر ہے، بیاہ سے پہلے وہ مجھے بہت چاہتا تھا اب ہر روز پیٹتا ہے۔"

بوڑھی عورتیں فریادی ہوتیں کہ بہوؤں کے کہنے میں آ کے اُن کے بیٹوں نے انہیں گھروں سے نکال دیا تھا بہویں اپنی دادرسی چاہتیں کہ ساسوں کے کہنے پہ اُن کے شوہروں نے انہیں دھکے دے کے گھروں سے بے دخل کر دیا تھا۔"

کالے جادو کا چلن اتنا عام تھا کہ ہر عورت اپنے مصائب کا باعث اُسے ہی سمجھتی۔ سوئیوں سے اَٹے پتلوں کو جو عاملوں کی نشاندہی پہ عموماً زمین سے برآمد ہوتے دل کے دوروں، مرگی اور سرطان جیسے مہلک امراض کا باعث سمجھا جاتا۔ گھروں کی دیواروں میں نصب کیل ان کے رزق روزگار کی بندش کا سبب گنے جاتے۔ گھروں کے دروازوں میں اڑسے سیہہ کے تکلوں کی بدولت خاوند اپنی بیویوں پر اتنا تشدد کرتے کہ وہ ہسپتالوں میں پہنچ جاتیں۔ مرغوں کی کٹی ہوئی گردنیں کسی تکیے سے برآمد ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اس گھر کے بچے ہلاک ہونے کو تھے۔

اماں سائیں ان شیطانی اعمال کے تدارک کی تدابیر بتاتیں اور ان کا شکار اس عمل کے لئے اپنی بساط سے بہت بڑھ چڑھ کے دان کرتا۔ میں ان لوگوں کے ہاتھ روکنا چاہتی تھی لیکن مجھ میں اتنی جرأت کہاں تھی۔ ہاں میں یہ ضرور محسوس کرتی تھی کہ ان میں سے ہر عورت دوسری سے مشابہہ تھی اور وہ سب ہی مجھ سے ملتی جلتی تھیں۔

انہی دنوں یہ سُن کے میں حیران و ششدر رہ گئی کہ پیر سائیں کی اس مملکت میں کوئی باغی بھی تھا اور وہ بھی ایک عورت، عورتیں اکثر ایک دوسری کو تارا کے نام سے طعن و تشنیع کیا کرتیں۔

"تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو؟"

"تارا ....."

ایک دوسری کو ڈانٹتی اور دوسری تڑاخ سے جواب دیتی "اگر میں تارا ہوتی تو تمہارا کلیجہ کتوں کو نہ ڈال دیتی۔"

ہر کوئی تارا ہونا چاہتی تھی لیکن کسی میں بھی اتنی جرأت نہ تھی۔ دائی نے مجھے اس کی کہانی سنائی "اگرچہ تارا بچپن میں گونگی ہو گئی تھی لیکن جوانی اس کی قیامت کی ہوئی۔ وہ ملائم

ترین سنگِ مرمر کی طرح زردی مائل تھی، اس کا بدن کسی ناگن کی طرح لچکیلا گویا ہڈیوں کے بغیر تھا۔ جب وہ بل کھاتی لہراتی چلتی تو مرد بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح اُس کا پیچھا کرتے وہ موڑ کاٹتی تو وہ جھول جھول جاتے جب وہ رُکتی تو ہجوم رُک جاتے۔ وہ مستانے اور دل پھینک انداز میں ہر ایک پر نگاہوں کی بجلیاں گراتی لیکن کسی میں کبھی اتنی جرأت نہ ہوئی کہ آگے بڑھ کے اُسے تھام لیتا ......"

میرا تجسس بڑھتا گیا، اللہ کا شکر ہے اس نے داستان جاری رکھی "جب تارا کا سامنا ایک چھوٹے زمیندار سے ہوا تو پیار پھوٹ پڑا۔ یہ معجزہ ہی تو تھا کہ اس کی گود بھی ہری ہوئی اور گنگ زبان بھی چل پڑی، لیکن اس کا محبوب اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا اس کی اپنی چچا زاد سے منگنی ہو چکی تھی۔ پیار بالآخر ذلت میں بدل گیا۔ مغرور تارا نے ہر شناسا کی منت سماجت کی کہ وہ اس کے محبوب کو منا لائے مگر بے سود"

"اُسے کہنا میں اس کی دوسری بیوی بننے کو تیار ہوں۔

اُسے کہنا میں اس کی دلہن کی باندی بن کے اس کی چاکری کروں گی۔

اُسے بتانا وہ میری نظروں سے اوجھل نہ ہو، میں اس کے بغیر جی نہ سکوں گی۔"

لیکن اس کے محبوب نے جو اپنے بیاہ پہ مسرور شاداں تھا اُسے کسی پرانی کہانی کی طرح بھلا دیا۔ دائی نے میرے قریب سرکتے ہوئے کہا، ایسے ہی کسی پیغام اور التجا کے جواب میں اُس نے قہقہہ لگاتے ہوئے بڑی بے شرمی سے جواب دیا "اب باقی عورتوں کو دوسرے مردوں کے لئے چھوڑ دینے کا وقت ہے۔" جب تارا نے یہ بات سُنی تو وہ زار و قطار روئی اور اس وقت تک بلبلاتی رہی جب تک اس کے آنسوؤں نے اُس کے دل میں بھرے پیار کے ذخیرے کو آگ نہیں لگا دی۔ آنسو انتقام کے لاوے کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ اپنے مشترکہ گناہ کا بوجھ اپنا حمل گروانے کے بعد وہ بدلہ لینے کو اُٹھ کھڑی ہوئی۔ گاؤں والے اپنے کام کاج چھوڑ کے بپھری ہوئی شیرنی کے تعاقب میں اس کے گھر تک جا پہنچے۔

بے وفا محبوب کے دروازے پہ کھڑے کھڑے تارا نے اسے للکارا دائی کی آواز بُلند ہو گئی "چوہے! مرد بنو اور باہر نکلو، آؤ آج میرا اسی طرح سامنا کرو جیسے میرے بستر میں کیا کرتے تھے۔" دروازہ چرچرایا اور دولہا باہر نکلا مجمع نے اپنی سانسیں روک لیں۔ اس کی جھلک پاتے ہوئے تارا کو دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لئے رُکتی ہوئی محسوس ہوئی لیکن ساتھ ہی درد

کی ایک ظالم لہر نے اس کے پورے وجود کو جکڑ لیا۔ اب وہ کسی اور عورت کا مرد تھا۔ اس کے بھائیوں نے اسے ڈرا کر بھگانے کے لئے اس کے گرد گھیرا ڈالا، لیکن ٹانگیں پسارے پاؤں سختی سے زمین پر جمائے ایک ہاتھ کولہے اور دوسرا اپنی پتلی کمر کے گرد بندھی پوٹلی پہ رکھے کھڑی نڈر شیرنی آج سارے ادھار چکانے آئی تھی۔ مردوں کا ایک گروہ بزدل بھگوڑے کو تحفظ دینے آگے بڑھا۔ تارا کے گرد مجمع بڑھتا گیا۔

"اللہ کے نزدیک تو اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ میں تجھے اس کی یاد دہانی اور اپنا حساب بے باق کرنے آئی ہوں" ایک طاقتور مرد کمزور پڑ گیا تھا لیکن ایک کمزور عورت طاقت پکڑ گئی تھی وہ دونوں اسی طرح آمنے سامنے کھڑے تھے جیسے سیاہی اور سفیدی اور حق اور باطل متحارب ہوتے ہیں۔

"رشتے آسمانوں پہ طے ہوتے ہیں، میں اب شادی شدہ ہوں مجھے چھوڑ، جا کسی اور کو ڈھونڈ لے" جفاکار محبوب نے حقارت سے تھوکا، لوگوں کی نظریں اُسے چھوڑ تارا پہ جم گئیں۔

دائی نے میرے تجسس کی آگ کو تیز کرنے کے لئے لمحہ بھر کو توقف کیا اور پھر گویا ہوئی۔ غصے میں تارا نے کمر میں اُڑسی ہوئی پوٹلی میں ہاتھ ڈالا۔

اس کا بازو ایک لمحے کو گٹھڑی میں گُم ہوا پھر بلند ہوا اور ساتھ ہی سرخ گوشت کے لوتھڑے بجلی کی طرح فضا میں لہرائے۔ لہو کی گاڑھی غلاظت اس کے بے وفا محبوب اور اس کے بھائیوں کے چہروں پہ تھپے جانے کے بعد پھسلنا شروع ہو گئی۔ تھو تھو کرتے وہ کیڑوں کے گروہ کی طرح آگے پیچھے ہوئے، وہ پاگلوں کی طرح ہاتھ چلاتے حمل کے ابتدائی دنوں کے بے شکل مواد کے لوتھڑوں کو اپنے چہروں سے نوچ پھینکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

خوف اور حیرت سے میں نے اپنے ہاتھ منہ پہ رکھ لئے۔ تارا گرج رہی تھی "تم نے ایک عورت کے پیٹ میں بچہ پیدا کیا اور پھر بھول گئے، یہ میرا ہے صرف اس لئے کہ یہ میرے اندر چھپا ہوا تھا۔ آؤ اب اس کے حصہ دار بنو۔ اسی طرح جیسے تم نے اس کی تخلیق میں ساجھے داری کی تھی" اس کے بے وفا محبوب کا بھائی اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولا "اس پاگل عورت نے ہماری بہت بے عزتی کر دی، آؤ چلو، اس کے لہجے میں شدت کی سختی تھی۔ تارا نے ایک قدم آگے اٹھایا "یہ ذلت اور رسوائی تمہارے بھائی کے اپنے نطفے سے تھی۔ جو اس کا ہے

میں وہی اسے لوٹا رہی ہوں، اگر اسی کا نام بے عزتی ہے تو پھر یہ ہم دونوں کی اکٹھے کیوں نہ ہو۔ اس گاؤں کے لوگوں کو یہ کہانی ہر مسافر کو سنانا ہو گی۔ اس کا جرم ہمیشہ کے لئے اس کے ماتھے پہ لکھا رہے گا۔" تارا یہ کہتے ہوئے لوک گیتوں کی دھنوں میں اتر گئی۔

میں بہت متاثر تھی اور بے تاب کہ اس عورت سے ملوں جو انصاف کے اجلے تصور میں یوں گُندھی ہوئی تھی، لیکن دائی نے بتایا کہ اماں سائیں نہ کسی کو اس سے ملنے جلنے دیتی تھی اور نہ ہی تارا کو حویلی یا مزار کے اندر آنے کا اذن تھا۔

میں نے سوچا کہ کاش کالی میرے بجائے تارا جیسی ہوتی۔ تارا کے برعکس کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کی مالک تک خصوصی رسائی تھی۔ کالی کا سسر بقول اُس کے اُس کا رازداں تھا۔ علاقے کا جاگیردار بھی جو بڑا نامی بدمعاش، رسہ گیر اور ظالم تھا اُسے بڑا عزیز تھا۔ جب بھی کوئی جوان عورت اچانک سراغ نہ چھوڑتے ہوئے غائب ہو جاتی تو جاگیردار کا نام ضرور سننے میں آتا لیکن موت کا خوف ایسی بلا تھی کہ ایسے واقعات چند ہی دنوں میں بُھلا دیئے جاتے۔

اگرچہ ان وقوعوں میں میرے خاوند کی شرکت کا کوئی تذکرہ نہ ہوتا تھا لیکن مجھے ایسے ہر واقعے میں ہلکے زلزلے کی طرح اس کے وجود کی تھرتھراہٹ محسوس ہوتی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ حویلی میں آنے والی ہر نئی لڑکی بہت جلد غائب ہو جاتی۔ اُدھر میرے پوچھنے پہ کوئی جواب دینے کو تیار نہ ہوتا۔ نہ کبھی چیل ایسے معاملوں میں مالک کی اطلاع کے لئے دلچسپی لیتی دکھائی دیتی۔ خوف اور دہشت کی ماری کوئی لڑکی اگر واپس لوٹتی تو اس سے کوئی سوال جواب نہ کیا جاتا۔ بس ایک خاموشی سی خاموشی ہوتی جس کے دوران وہ اپنا کام کاج دوبارہ سنبھال لیتی۔

"کالی مر گئی! کالی مر گئی!" ایک روز حویلی اس منحوس خبر سے گونج اٹھی، اندر سے بالکل خالی میں نے ایک عجیب سی لاتعلقی کا روپ دھارنے رکھا۔ سب ہی یہ کہہ رہے تھے کہ وہ زچگی کے دوران مر گئی، لیکن مجھے اس دبا دی گئی افواہ پہ یقین تھا درد زہ کے آغاز میں اس نے پھانسی لے لی تھی۔ ماں کا مردہ جسم ہوا میں لٹک رہا تھا اور بچہ باہر آنے کی جدوجہد میں تھا۔ وہ دونوں پھانسی پر لٹک رہے تھے۔ ایک رسے کے ساتھ اور دوسرا نانہالی سے منسلک، غم کی کالی سیاہ گھٹا میرے اندر اُمڈ آئی۔

ماں نے ابھی تک مجھے کوئی خط نہ لکھا تھا۔ وہ ایسی تو نہ تھی، اگرچہ مجھے احساس تو تھا کہ اسے جان بوجھ کے مجھ سے دور رکھا جا رہا تھا لیکن کالی کی موت مجھے یوں کھائے جا رہی تھی کہ مجھے ماں کی شفقت اور سائے کی شدت سے ضرورت تھی۔ مجھے ایک بار پھر پیر سائیں سے پوچھنا چاہیے تھا۔

اس رات جب شیطان میرے قریب آ رہا تھا میں نے ہمت کر کے اُس سے پوچھا "کیا میری ماں نے میرے نام کوئی خط بھیجا ہے؟" میرے بات ختم کرتے ہی وہ رک گیا۔ مجھے ایک پھنکار سنائی دی "تمہیں کس نے بتایا .....؟" "کسی نے نہیں سائیں" میں نے بوکھلاہٹ میں جواب دیا لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ دن کو روا رکھا جانے والا تشدد جب وہ لباس میں ہوتا رات کی اس بربریت سے بہت مختلف ہوتا جب وہ ننگ دھڑنگ ہوتا تھا۔ یہ بالکل ہی دوسری قسم کا تشدد تھا۔ دل ہی دل میں میں نے سینکڑوں خطوط لکھ ڈالے۔

سب سے پیاری ماں!

تم پیر سائیں کی اپنے خاندان میں آمد کو کتنا بڑا اعزاز سمجھتی تھیں۔ ذرا یاد کرو تم جائے نماز پہ بیٹھی خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کتنا روئی تھیں تمہارے کندھوں سے اس روز کتنا بڑا بوجھ اتر گیا تھا جس روز میں بابل کی دہلیز پار کر آئی تھی، لیکن میں اپنا سب کچھ ساتھ ہی لے آئی تھی۔ جس میں سے واپس کرنے کے لئے اب میرے پاس کچھ بھی نہیں ..... رہا۔

ماں! تم سجدہ ریز ہو کے خدا سے کہہ رہی تھیں کہ وہ اپنی عظیم نعمتیں تم سے کہیں دور نہ کر دے۔

تم میری طرح کے اور بھی تجربے چاہتی تھیں!
اپنی دعائیں واپس لے لو!
ماں! انہیں واپس لے لو!
مجھے پریوں والی روشنیوں اور قہقہوں کی یاد آئی۔
اور پھر جب وہ بجھ گئی تھیں تو وہاں بھی اتنا ہی اندھیرا چھا گیا تھا جتنا میرے اس بستر پہ جو قبر کی طرح تھا۔

تصور ہی تصور میں خط لکھتے ہوئے، دل ہی دل میں منہ بسورتے ہوئے، پاگل عورتوں کی نگرانی کرتے کرتے اور کالی کی یادوں میں ڈوبے ہوئے میں نے چھٹکی، ننھی اور بھائی

کو بھی خطوط لکھے۔ اُن سب کے ماں کی اجازت سے اپنا زیادہ سے زیادہ وقت میرے پاس گزارنے کے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔

چھوٹی بہنو! اگر تم یہاں آؤ تو ہنسنا بھول جاؤ گی، اور بھائی میرے پیارے بھائی جب میں گھر چھوڑ رہی تھی تو تم نے ہی تو کہا تھا "آپا اگر تمہارا خاوند تم سے اچھا سلوک نہ کرے تو مجھے بتانا۔ یہ کبھی نہ سوچنا کہ تم اکیلی ہو اور تمہیں کوئی پناہ نہ دے گا۔" میں تم پہ ہنس دی تھی اور میں نے تم سے پوچھا تھا "بھلا تم کیا کر لو گے؟" تو تمہارا سینہ تن گیا تھا اور تم نے اپنے دبلے پتلے بازوؤں کے مسل دکھاتے ہوئے کہا تھا "میں اسے اپنے ننھے ہاتھوں سے قتل کر دوں گا، سب سے پیارے بھائی! تم مجھے بچانے کی کوشش میں صرف اپنی ہی جان کھو بیٹھو گے۔"

بہار کا موسم تھا۔ میرے پیٹ کا بچہ ہلتے جلتے گویا نئے موسم کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ حویلی کی ان دیواروں کے ساتھ جو ہمیں محدود رکھتی تھیں میں نے جو بیج بوئے تھے چھوٹے چھوٹے پیلے پھولوں میں بدل گئے۔ یہ نظارہ مجھے اپنے گھر کے لئے بے قرار کر دیتا۔ ماں کی بالکونی کے گملوں میں بھی پھول کھل گئے ہوں گے۔ اس کے گلدانوں میں گلاب اور جوڑے میں چنبیلی ہو گی۔

یہ سوچتے ہوئے کہ ہمارے بیاہ کی سالگرہ آئی اور یوں گزر گئی کہ مجھے اس کا احساس تک نہ ہوا میرا جی چاہا میں چلا اٹھوں۔ اس بد قسمت دن نے میرے ماضی کو ملیامیٹ کر ڈالا تھا، رہا مستقبل تو وہ تو اس روز جیسے سرے سے کالعدم ہو گیا تھا۔ اس قبر کی طرح جس پہ کوئی کتبہ نہ ہو۔

مجھے بچے کا خیال آتا تھا کہ بہار کا موسم بھی جیسے دم توڑ گیا، وہ میرا بچہ کہاں تھا، مجھے تو لوگوں کے لئے ایک اور دیوتا کو جنم دینا تھا۔ چیل جیسے غوطہ لگاتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ میں نے آنسو پونچھ ڈالے۔ میرا رونا اس نے پہلی بار نہ دیکھا تھا۔

اس رات جب پیر سائیں نے مجھ سے پوچھا "تم کالی کے لئے کیوں روتی ہو؟" تو گھٹا گھٹا اور گرم رہنے والا کمرہ برف خانہ ہو گیا۔

وہ جانتا تھا!

مجھ پہ کالی کے ساتھ ناجائز تعلقات کا شبہ کیا جا رہا تھا۔ اس کی دہشت کے بوجھ تلے دبے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے یہ واقعی درست تھا۔ میرا لہجہ جرم کی تصدیق کر رہا تھا۔ میرے

جواب مدافعانہ اور اقرارِ جرم کے مترادف تھا۔

کالی کے پیٹ میں کس کا بچہ تھا؟ وہ دھاڑا اس خوف اور بوکھلاہٹ میں کہ وہ بچے کو میرے نطفے سے بھی سمجھ سکتا تھا میرے منہ سے فوراً اُس کے سسر کا نام نکل گیا۔ "سائیں، کالی کے شوہر نے اُس سے شادی اپنے بڈھے سُسر کی عیاشی کے لیے کی تھی۔" لیکن یہ کہتے ہوئے میں نے کالی سے اپنے تعلقات اور قربت کی تصدیق کر دی تھی۔

وہ مزید جاننا چاہتا تھا۔ میں مزید کچھ بتا کے کالی سے کیا ہوا ایک اور وعدہ نہ توڑتی، لیکن جب اس کا فولادی ہاتھ خنجر کی طرح میری گردن پہ پڑا تو ایک اور قول و اقرار ٹوٹ گیا۔ میری گردن اس کے پنجے میں تھی وہ اسے مروڑتے ہوئے میرے عہد و پیمان تڑوا رہا تھا۔ اکھڑتی ہوئی سانسوں اور کھانسی کے درمیان میں نے ایک اور راز اگلا "سائیں وہ کالی پہ مرد چھوڑتا تھا۔"

"اور بتاؤ۔"

وہ چیخا

میں نے کچھ اور بتایا مجھے فرش پہ گراتے ہوئے اس نے میرا چہرہ اپنے پاؤں تلے دبا دیا۔ پاؤں تلے پھڑ پھڑاتے ہوئے میں نے ایک اور وعدہ توڑا۔

"وہ کالی اور اس پہ چھوڑے گئے مردوں کو دیکھا کرتا تھا۔ کئی کئی گھنٹے، کئی کئی دن، شب و روز۔"

"بولو، بولو۔ اور بتاؤ" وہ گرجا۔

میں اس سے زیادہ اسے اور کیا بتاتی۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ اسے کہتی کہ سائیں تم تو سب کچھ جانتے ہو۔ تم تو ہمیشہ وہاں موجود ہوتے تھے، پیر سائیں نے قینچی لانے کو کہا۔

وہ کرسی پہ بیٹھ گیا، مجھے ٹانگوں میں گرا کے اُس نے میری کنپٹیاں اپنے گھٹنوں میں دے لیں۔ میری آنکھیں چھت کی طرف اُبل رہی تھیں۔ وقت قینچی کے کترنے کی آواز میں منجمد ہو کے رہ گیا۔ وہ استرے کے لئے چلایا۔ وقت استرے کی آواز میں ٹھہر گیا۔ اُسترا میری کھوپڑی کے آر پار چلا پھر پیشانی اور ابرووں پہ۔ کمرے میں چت پڑے پڑے میں نے اسے آتش فشاں لاوے کی طرح اپنے اوپر آتے دیکھا۔

میں فرش پہ دراز۔

میرا پیٹ بڑھا ہوا اس کے اندر ٹانگیں چلاتا میرا بچہ۔

اس کے اوپر نازل ہوتا ہوا اس کا باپ۔

پیر سائیں رات دن میں اور دن رات میں بدل جاتا۔

اگلی رات سے پہلے ایک اور آگ اگلتا دن۔ روشنی اندھیرے اور اندھیرا روشنی میں بدلتا رہا۔ میرا بچہ اس کے دھکوں کی مزاحمت کرتا۔ دونوں میں کوئی بھی تھکا نہیں وہ ابھی میرے اندر ہی تھا کہ بچہ باہر آنا شروع ہوا اسے یہ جاننے کے لئے ایک عمر لگی تھی۔ مجھے تنبیہ کی گئی تمہاری آواز اس کمرے کی دیواروں سے باہر نہ جانے پائے۔ درد مجھے کھا رہا تھا میں درد کو پی رہی تھی۔ میرے اپنی دشمن نوکرانیوں کے بازو اور ہاتھ بھینچے، کاٹتے اور نوچتے ہوئے میرے بچے نے اِس دنیا میں آنکھ کھولی اور میں نے سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے خواب میں ماں کو اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا۔ وہ پیار سے میرے سر پہ ہاتھ پھیر رہی تھی۔ اس کی انگلیاں میرے ابرووں اور میرے آنکھوں کے گڑھوں کو محسوس کرتی ہوئی اِن کے سیاہ حلقوں پہ چل رہی تھیں۔ وہ ابھرے ہوئے میرے رخسار کی ان ہڈیوں کو چھو رہی تھی جو میرے گالوں کے گڑھوں میں اتر رہی تھیں۔ میرے اب بہت نمایاں جبڑے پہ تیرتی ہوئی ماں کی انگلیاں اس صحرا کی تپتی ہوئی ریت میں کسی چشمے کی تلاش میں تھیں۔

ماں نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور پھر اپنا گال میرے گال کے ساتھ ملا دیا۔ مجھے اس کے گرم گرم آنسو اپنے وجود میں داخل ہوتے محسوس ہوئے۔

کبھی وہ مجھے چمچے سے کھلا رہی ہوتی، کبھی ٹھنڈی پٹیاں میری پیشانی پہ رکھ رہی ہوتی۔ پھر وہ میرے سینے سے بہت دور آگے نکل جاتی اور میں اسے دل ہی دل میں خط لکھتی۔

سب سے پیاری ماں!

تمہیں یقین تھا کہ بابا مجھے یہاں بھیجنے پہ راضی ہو جاتے۔ بابا! کیا یہ سچ ہے؟ ماں میرے پاس آ جاؤ۔ آؤ دیکھو اُس نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟ دیکھو یہ میرے ساتھ کیا ہو گیا ہے؟

ماں پھر لوٹ آتی

میں جانتی تھی۔ بہت سے موسم آئے اور گئے۔ یہ سب کچھ موسم بہار میں شروع ہوا تھا۔ لیکن اس کے بعد مجھے گرمیوں کی تپش کے بجائے سردیوں کی ٹھنڈ نے آلیا تھا۔ جب

میری نگاہیں گلدان کے زرد پھولوں پہ پڑیں تو مجھے احساس ہوا کہ یہ تو کوئی دوسری بہار تھی۔

سرسبز گھاس پہ سرخ اور گلابی پھولوں کے بکھرے ہوئے تختے کپڑے پہ پرنٹ ہوئے مختلف رنگوں اور ہر سائز کے چھوٹے بڑے پھول اور ان کے اوپر رکھے دو ہاتھ ایک اور خواب؟ ..... میں نے رُخ دوسری سمت کر لیا۔ مزید دیکھنے کی خواہش نے مجھے ایک بار پیچھے دیکھنے پہ مجبور کر دیا۔

ایک جھکا ہوا سر، ایک عورت آگے کی طرف جھکے ہوئے سر کے ساتھ کرسی پہ بیٹھی سو رہی تھی۔ اس نے مکھی اُڑانے کے لئے اسے جنبش دی۔ "ماں! ..... شکستگی کے شکار ایک اور خواب سے بچنے کے لئے میں نے کروٹ بدلی۔ میں پھر اس کی طرف بڑھتی اور پھر منہ موڑ لیتی۔ میرا سر اس وقت تک آگے اور پیچھے ہوتا رہا جب تک میری آنکھیں اس کے تصور پہ جم نہ گئیں۔ میری نگاہوں کے ارتکاز کی قوت نے اسے بیدار کر دیا۔

ہاں وہ ماں ہی تھی۔

سچ مچ کی ماں

میرا بدن اوپر اور اس کا نیچے ہو رہا تھا۔ وہ وہی تو تھی۔

میں چیخی، میرے بدن میں کوئی سوئی سی چبھی، ماں کی تصویر لہرائی اور پھر غائب ہو گئی۔

میری صحت امن اور سکون کی ضامن نہ رہی تھی۔ میں نے کھانا پینا چھوڑ دیا، گولیاں میں اپنی انگیا میں چھپا لیتی اور ہر اُس چیز سے انکار کر دیتی جو مجھے صحت مند کر کے ایک بار پھر اس کے حوالے کر سکتی تھی۔ ماں مجھے میری پہلی حالت میں واپس لانے کی ضد کرتی۔

"جان ہے تو جہان ہے، اگر تم بیمار ہو گی تو پھر سب کچھ کھو دو گی۔" وہ سرگوشی کرتی

کیا اس نے میرے مُنڈھے ہوئے بال نہیں دیکھے تھے؟ کیا اس نے زخموں کی خراشیں نہیں دیکھی تھیں؟؟ کیا وہ جاننا نہ چاہتی تھی کہ میرا بچہ کیسے مرا تھا؟ ماں کو سمجھانا آسان نہ تھا۔

میں نے جب بھی کوشش کی وہ کہتی "ہوں! میری بچی اللہ پہ ایمان رکھو۔" بار بار چومتے ہوئے میرے اور اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اُس نے مجھے کبھی بھی میری پتا سُنانے نہ دی، ایک دن میں نے اُسے بتایا۔

"ماں مجھے گھر لے چلو، وہ پیر نہیں ہے شیطان ہے ..... " اُس نے میرے منہ پہ

ہاتھ رکھ دیا۔ "میری بچی بات مت کرو کوئی سُن لے گا۔" میں خاموش ہو گئی۔ ماں، میری واحد پناہ گاہ اور نجات دہندہ بھی خوفزدہ تھی، وہ بھی اسی طرح اس کے قبضے میں تھی جیسے دوسرے۔

پیر سائیں اندر داخل ہوا۔ میرا دل ڈوب گیا۔

"یہ کیسی ہے۔" اُس نے پوچھا۔

"سائیں اللہ کے فضل سے اب وہ بہتر ہے، لیکن ابھی اُسے مزید آرام چاہیئے۔" ماں نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔ وہ کرسی پہ بیٹھ گیا بالکل ویسے ہی جیسے اس روز۔ میری جان نکل رہی تھی، جو اس نے کہا وہ اس سے بھی بدتر تھا۔

"تمہیں میری بیوی کی بیماری کی وجہ سے تکلیف ہوئی، تمہارے دوسرے بچوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ اب وہ بہتر ہے تم جا سکتی ہو۔" میرا دل ماں کے دل میں دھڑکا، اس نے فوراً کہا کہ اسے کوئی جلدی نہیں، بچوں کی دیکھ بھال ہو رہی تھی، اور وہ بلا فکر یہاں مزید رہ سکتی تھی۔ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ خوف کی یہ نشانیاں پیر سائیں کے لئے کوئی نئی نہ تھیں۔ "تم کب جاؤ گی؟" اس نے فیصلہ کُن انداز میں پوچھا ماں نے میری طرف دیکھا، میں نے دوسری طرف "سائیں میں اس کی مکمل صحت یابی کا انتظار کروں گی، یہ تو ہل بھی نہیں سکتی، ابھی اس میں طاقت ہی نہیں۔" ماں کی آواز تھرا رہی تھی۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا "کل تمہارا بیٹا تمہیں گھر لے جائے گا۔" کل؟، بھائی کہاں تھا؟ میں نے تو اسے دیکھا بھی نہ تھا۔ میرا خاوند کمرے سے نکلا تو میں ماں سے لپٹ کے چلا اٹھی "خدا کے لئے مجھے اپنے ساتھ لے چلو میں گھر جانا چاہتی ہوں۔"

ماں پیچھے ہٹی "میری بچی تمہیں یہ نہیں کہنا چاہئے، تم شادی شدہ عورت ہو، ہمیں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے جس سے میرا یہاں آنا ہی بند ہو جائے۔ سمجھ آئی؟ ....."

یہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔

"بھائی کہاں ہے؟ وہ اندر کیوں نہیں آتا؟" میں نے پوچھا

"تمہارا بچہ مردہ پیدا ہوا تو ہمیں یہاں بلایا گیا، بھائی تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

تمہیں دیکھنے کے بعد وہ تمہیں شہر کے ہسپتال لے جانا چاہتا تھا۔

اس کی یہ سوچ ہم سب کے لئے خطرناک ہو سکتی تھی۔ میں نے اسے تمہارے معاملات میں مداخلت سے باز رہنے کو کہا ہے" ماں نے جواباً کہا۔

سب سے سچے اور قابلِ یقین رشتے کتنے بے اعتبار ہیں، میں نے سوچا، کتوں کے درمیان کوئی اتحاد نہیں ہوتا، مکوڑوں کی ریڑھ کی ہڈی نہیں ہوتی اور کیڑوں کا کوئی کردار نہیں ہوتا، جب اپنے عزیز ترین لوگ بوجھ بن جائیں تو کمزور اور ضعیف لوگ انہیں کس طرح منجدھار میں چھوڑ دیتے ہیں۔

میری ماں بے سہارا بے آسرا بیوہ تھی۔ میرے خاوند کے خلاف کھڑا ہونے کے لئے اس کے پاس کوئی طاقت نہ تھی۔ وہ مجھے عدالت کے ذریعے واپس لے سکتی تھی مگر اس میں اتنی ہمت اور جذبہ کہاں تھا۔ وہ خاندان کی ناک کی خاطر ہر سمجھوتہ کرتی رہی تھی۔ سکینڈل اسے موت کے حوالے بھی کر سکتا تھا۔ وہ دروازے جو کسی بھی مرد کے لئے چوپٹ کھلتے تھے عورتوں پہ بند تھے۔ اگر وہ بے عزت ہو گئی تو وہ معاشرہ جو اس کے عروج کا حاسد اور بیری تھا اس پہ پل پڑتا۔ تنہا وہ اس قابل نہ تھی کہ مجھے بچا سکتی، مروج نظام اس کی اجازت ہی نہیں دیتا تھا۔ نہ ہی اسے ان معاملات میں مداخلت کا کوئی حق تھا جو اب میرا مقدر ہو چکے تھے۔ میں جیون بھر کے لئے وقف ہو گئی تھی، وہ میرا مالک تھا۔

جس طرح ساحل پر سمندر کی موجوں کا جوش و جذبہ دم توڑ دیتا ہے اسی طرح میری امیدوں نے اس وقت دم توڑ دیا، جب ماں مجھے خدا حافظ کہنے آئی۔ ہم دونوں بستر پہ آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ دو عورتوں نے اپنے کمزور اور لاغر ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں دیئے۔ اکیلے بھی بے بس اور اکٹھے بھی بے بس، جب وہ بول رہی تھی میں اس احساس میں ڈوبی ہوئی تھی کہ کل اسی وقت میں اس کی یہ آواز نہ سُن سکوں گی۔

"میں تمہیں اکیلا چھوڑ کے نہیں جا رہی، اللہ تمہارے ساتھ ہے۔" وہ رو پڑی

"وہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں جتنا پیار کرتا ہے، وہی تمہاری جان اور جذبہ ہے تم جب بھی اُسے یاد کرو گی وہ تمہارے پاس ہو گا اس کا کرب اس کی ابتری میں اور میرا امیری بے حس سرد مہری میں واضح تھا۔ اس نے مجھے گلے سے لگایا تو میرا بدن اکڑ گیا۔ وہ جانے کے لئے مڑی تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ میں نے کوشش کی کہ باہر اس کی موجودگی کے احساس کو چھو لوں۔ خاموشی ہو گئی تو مجھے اپنے اندر کے خلا نے پھر گھیر لیا۔

باب ۵

اوراقِ پریشاں

یہ ایک اور سال کا قصہ ہے۔ برسات کا ایک اور موسم، بارش کے پانی اور تپتی ہوئی دھرتی کے ملاپ سے فضا میں وہ سوندھی سوندھی مہک پھیل گئی جو دو دلوں میں ہلچل مچا دیتی تھی۔ مہک کو اپنے اندر جذب کرتے اور اس میں تحلیل ہوتے ہوئے میں وہ پرندہ ہو گئی جو درخت پہ بیٹھا تھا اور پھر میں اُڑتی ہی چلی گئی، دور بہت دور۔

گاؤں سے دور، وطن کی فضاؤں کے پار پہاڑوں اور سمندروں کے اوپر وہاں جہاں پرندے اور طیارے محوِ پرواز تھے اور ہر طرف کہانیاں ہی کہانیاں تھیں۔ رنگ برنگی تصویریں اور بہت سے لوگ۔ میں نے رات پہ چاند اور دن پہ سورج کی حکمرانی بڑے قریب سے دیکھی اور اُسے محسوس کیا، میرے لئے یہ بڑی حیرت اور تعجب کی بات تھی کہ اگرچہ ان دونوں کا دائرہ اختیار مختلف تھا لیکن وہ ایک ہی دنیا پہ سایہ فگن تھے۔

شام کے دھندلے سائے میں میں آسمان پہ دور دراز تک ہیجان خیز شوخ رنگوں کے چھینٹے پھیلتے ہوئے دیکھتی۔ میرے دیکھے ہوئے سب ہی سپنے بھی جیسے انہی فاصلوں اور رنگوں میں کہیں گم ہو جاتے لیکن یہاں تو سورج سیدھے سبھاؤ ڈوب جایا کرتا تھا اور اس کے تھکے ہارے سائے میری محدود دنیا پہ آ گرتے۔

کسی اور کے ساتھ پیار بانٹنے کی یہاں کوئی گنجائش نہ تھی۔ میں فطرت اور ان نظاروں کی محبت میں جکڑی جا رہی تھی۔ باہر جو کچھ بھی تھا اسے دیکھنا میرے بس میں نہ تھا، میں اسے کھینچ کے اپنے زنداں کی چار دیواری میں لے آئی تھی۔ اس عمل کو میں نے خدا کی بستی کو پرواز کے نام سے منسوب کیا۔ وہ بستی جو میرے خاوند کے تخلیق کردہ جہان کے اردگرد، اوپر اور نیچے واقع تھی۔ میں جب چاہتی سنہری دھوپ اور چاندنی کو اپنی مٹھی میں لے لیتی...... لیکن کاش میں اس کے ساتھ ساتھ مسرت اور شادمانی سے رقص بھی کر سکتی۔

میں اس بارش میں کھڑی ہو جاتی جو بہت دور میری ماں کی چھت پہ برس رہی ہوتی۔ وہی رات وہی ستارے جو ہر جگہ تھے وہی مجسّمیں، وہی طلوع و غروب اور وہی شامیں لیکن...... خواب اور تصویر میرے ہاتھ سے پھسل گئے تھے۔ امیدوں سے خالی خواب کتنے

مختصر تھے۔ میں اپنے دوسرے حمل کے آخری دنوں سے گزر رہی تھی لیکن اب کوئی تمنائیں نہ تھیں۔ ہاں ایک گہری افسردگی اور بے یقینی ضرور تھی۔

جب میری پہلی بیٹی نے جنم لیا' پیر سائیں کی متوقع ناپسندیدگی کے خوف میں ڈوبے ہوئے میں نے چیخ روکنے کے لئے اپنے منہ میں کپڑا دے لیا تھا۔ اس نے بچی کو ایک نظر دیکھا تک نہیں' وہ اس کے لئے ہمیشہ وہ گھڑی ہی رہی جو وہ پیدائش کے وقت تھی۔ اس کے لئے پیدائش کے دن سے ہی پردے کا حکم صادر ہو گیا۔ اپنی موت تک اسے اُسی زندان میں رہنا تھا۔ میں چاہتی تھی وہ اس دنیا کو دیکھے اور جانے جو اسے کبھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ وہ اسے اُس پرواز کے ذریعے ہی دیکھ سکتی تھی جس کی صلاحیت میں نے اپنے اندر دریافت کی تھی۔ میں اسے پرندوں کے سے پر دینا چاہتی تھی اور وہ رفتار بھی جو تیز ہواؤں کی تھی۔

ماں' چھٹکی اور ننھی پہنچ گئیں "اب تو تمہارے پاس ایک بچی بھی ہے جس سے تم کھیل سکو گی' اب تو خوش ہو؟" ماں نے پوچھا' مجھے اُسے یہ بتانے میں کوئی دلچسپی محسوس نہ ہوئی کہ میرے پاس کھیلنے کے لئے وقت ہی کہاں تھا۔ اس نے مجھے چھٹکی اور ننھی کے رشتوں کے بارے میں ملے سندیسوں کا حال سنایا۔ بھائی کی تعلیمی زبوں حالی بھی موضوع بحث ہوئی اور اسی جیسے دوسرے چھوٹے چھوٹے بحرانوں کا ذکر بھی' میں نہ سُن رہی تھی نہ مجھے کوئی جواب دینا تھا۔

میری بہنیں خوبصورت دوشیزائیں نکلیں' چھٹکی تو کوئی مرمریں سی مخلوق تھی۔ اس کی آنکھیں گویا طشتریاں تھیں اور چال تو اس کی بادِ صبا کی سی تھی۔ وہ اپنے شب و روز بڑے لاابالی انداز میں بسر کر رہی تھی۔ ننھی کا رنگ ساٹن کا سا تھا' اس کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ مقناطیسی تھے اور آواز سحر انگیز' میں جانتی تھی ماں نے انہیں میری زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا تھا' اگر وہ جانتی ہوتیں تو وہ بھی اذیت میں نظر آتیں لیکن ایسا نہ تھا۔

وہ جیون اور شباب کے مزے لے رہی تھیں اور میں اٹھارہ سال کی عمر میں پیکرِ رنج والم عمر رفتہ کی آواز دیتی ایک لونڈی' جس کی زندگی میں جوانی' پیار اور امید کچھ بھی تو نہیں۔ چھٹکی اور ننھی ماں کا تمسخر اڑا رہی تھیں "یہ خالص دیسی گھی میری بیٹی کی اپنی گائیوں کا ہے' اس کے ہاں دودھ اور گائیوں کی بہتات ہے۔ نوکر چاکر ڈولے بھر بھر کر اتنی دور سے ہمارے لئے لاتے ہیں اور ہم صبح سویرے مرغ کی بانگ سے پہلے ہی پی پلا جاتے ہیں۔"

ماں لوگوں کو دیسی گندم کا آٹا' چینی اور چاول بھی دکھاتی ہو گی۔ وہ مجھے قربان کرنے کے بعد اپنی بہت سی نئی دوستوں کو مرعوب کرنے کے لئے نت نئی کہانیاں گھڑتی ہو گی' میں سوچ رہی تھی۔

"آپا تم گھر کیوں نہ آگئیں' چھٹکی نے گلہ کیا' اب تو چلو" "ہم تمہارے ساتھ زیادہ وقت کیوں نہیں گزار سکتے؟" میرے بجائے ماں نے تیزی سے جواب دیا "میں تمہیں سو دفعہ بتا چکی ہوں کہ ہیر اب ایک شادی شدہ عورت ہے' اس کی زندگی اب ہمارے جیسی تو نہیں رہی۔ اس کے ہمراہیوں کو ٹھہرانے کے لئے ہمیں نیا مکان بنانا ہو گا۔" اپنی بات پہ ماں خود ہی ہنس دی، لیکن میری بہنیں خاموش رہیں۔

ننھی نے افسردہ لہجے میں پوچھا "آپا کیا ہم تمہارے کسی کام کے نہیں رہے؟" پھر وہ دونوں رو پڑیں "ماں ہمیں یہاں کیوں نہیں رہنے دیتی؟ آپا خدا کے لئے ہمیں اپنے ساتھ رہنے دو؟ ماں نے انہیں جھاڑ دیا' میں تمہیں یہ اجازت نہیں دے سکتی تمہاری بہن کے ہاتھ بھاری ذمہ داریوں میں گندھے پڑے ہیں۔"

یہ سلسلہ جاری رہتا اور اُدھر اندر ہی اندر میرا دل ٹوٹ ٹوٹ جاتا۔ میرے پاس اپنے کنبے کے لئے بہت تھوڑا وقت تھا لیکن یہ پھر بھی بہت تھا۔

چیل مجھے ہر وقت یہ احساس دلائے رکھتی کہ میں کہاں تھی۔ میں ماں اور اپنی بہنوں کے بارے میں بھی اتنا ہی محتاط تھی جتنا اپنے زنداں کے باسیوں کے متعلق۔ ماں اس پہ بھی یوں تبصرہ کرتی "تمہاری بہن بڑے دینی رہنما کی بیگم اور اس کے بچے کی ماں ہے۔ اب وہ ایسی لاابالی کیونکر ہو سکتی ہے جیسے وہ بچپنے میں تھی؟"

ماں میری تعریفوں کے پُل باندھنے سے کبھی نہ تھکتی "تمہارا باپ تمہیں یوں پا کے کتنا فخر کرتا' وہ تمہیں ایسا ہی دیکھنے کے خواب دیکھا کرتا تھا" میرے بجائے میرے کپڑے اس کی توجہ کا مرکز تھے۔ یہی نہیں اُس نے انہیں ہر ایک کی نگاہوں کا مرکز بنا ڈالا۔ "یہ کپڑا تو دیکھو' آؤ اسے چھوؤ بالکل ملائی کی طرح کا ہے' آؤ جلدی آؤ اسے چھوؤ۔"

کبھی اُن کے رنگ اس نقصان کی تلافی کرتے دکھائی دیتے جو اُسے مجھے کھو کے ہوا تھا۔ "میں نے تو ایسا رنگ زندگی بھر نہ دیکھا تھا۔ یہ سبز ہے یا نیلا؟ اتنا بھرپور ہے کوئی بتا ہی نہیں سکتا۔"

وہ مسلسل انہی باتوں میں مصروف رہتی یہاں تک کہ مجھے کپڑوں سے نفرت ہو جاتی اور میرا دل چاہتا انہیں اپنے بدن سے اتار پھینک اس کے حوالے کر دوں، لیکن ماں میری بے زاری سے لاپرواہ جیسے غش کھاتے ہوئے کہہ رہی ہوتی "لوگ تو ایسے جوڑوں کو نرم ترین ململ میں لپیٹ کے رکھتے ہیں۔ پہننے کے لئے تو انہیں بالکل نکالا ہی نہیں جاسکتا۔" میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لئے مجھے بوسے دیتے ہوئے وہ کہتی "صرف میری شہزادی کے مقدر میں تھا کہ وہ انہیں پہنے۔" کبھی اپنے کمرے سے نکلتے ہی حویلی کے کسی دوسرے کونے سے ماں کی تیز آواز سنائی دیتی "میرے خدا، خدایا، ذرا آؤ اور اپنی بہن کے ہیرے جواہرات تو دیکھو نظریں ان سے ہٹائی نہیں جاسکتیں۔"

چھٹکی، ننھی اور راستے میں حائل سب ہی کو دور ہٹاتی وہ جوش سے چلاتی "آؤ دیکھو ہیر کتنی حسین لگ رہی ہے، آؤ ذرا قریب سے اس کی جیولری دیکھو۔" میرا دل چاہتا تھا میں اس سے پوچھوں کہ میں ان پتھروں میں کیسے خوش رہ سکتی تھی جن کے بوجھ تلے میں کچلی جا رہی تھی لیکن پھر میں ایسے فضول سوال کو بنا جواب دل میں ہی چھوڑ دیتی۔

جب وہ لوگ چلے جاتے تو مجھے یوں لگتا جیسے کبھی آئے ہی نہ تھے۔ پیر سائیں ماں کے لئے اشیائے خوردنی بھیجتا رہا لیکن اس سے زیادہ اس نے کبھی کچھ نہ کیا۔ وہ ان چیزوں کو نہ تو بھائی کی تعلیم پہ خرچ کر سکتی تھی اور نہ ہی یہ بہنوں کے جہیز کے لئے محفوظ کی جاسکتی تھیں، لہٰذا وہ انہیں بیچ دیا کرتی، لیکن یہ بیوپار صرف اُن لوگوں سے ہوتا جن سے اس کی کوئی جان پہچان نہ تھی۔ مجھے احساس ضرور تھا لیکن ماں کی مدد کے لئے مجھے جرأت کی ضرورت تھی۔ مہینے گزر گئے تب کہیں جا کے میں نے اپنے خاوند سے اس موضوع پر بات کرنے کی ہمت کی۔

ایک روز جب وہ بستر پر براجمان تھا میں دل ہی دل میں دعائیں مانگتی اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ میری اس غیر معمولی بے تکلفی نے اسے میری طرف متوجہ ہونے پہ مجبور کر دیا۔ "کیا ہے؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔ وہ الفاظ جو میں نے ہزاروں بار دہرائے اور رٹے تھے بالآخر ادا ہو ہی گئے "سائیں مری بہنوں کی ابھی شادی ہونا ہے، میری ماں نے ان کے حصے کا جہیز بھی دے دیا تھا۔"

"اس کا مجھ سے تعلق؟" اس نے پوچھا۔

میرا حلق خشک ہو گیا۔

"تم یہ مجھے کیوں بتا رہی ہو؟" وہ گرجا۔

"سائیں آپ ہی نے کہا تھا کہ مجھے آپ کو ہر معاملے سے باخبر رکھنا چاہئے۔" میں آہستہ سے بڑبڑائی۔ اس نے سُنی اَن سُنی کر دی اور میں ایک بار پھر الفاظ کی تلاش میں الجھ گئی۔

"ٹھیک ہے، لیکن کوئی ایسی بات نہیں جس کا مجھ سے تعلق نہ ہو" وہ شیطان کا روپ بدل رہا تھا۔ ہم جہنم کی طرف چھلانگ لگانے کو تھے۔ میں چُھٹکی اور ننھی کے جہیز کے لئے بات کرنے کو ترس رہی تھی۔

اگلا روز بدقسمتی کی نذر ہو گیا۔ عیار حرافہ ٹیڑھی نے میرے سب سے چھوٹے دیور کا ایک خط اچانک میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اس نے خط کیوں لکھا تھا؟ میرے لئے یہ بات سمجھ سے بالاتر تھی۔ مجھے اسے کھولنے کی ہمت نہ ہوئی اور میں نے اسے پیر سائیں کے پلنگ کے ساتھ رکھی میز پہ رکھ دیا۔

میں کبھی پیر سائیں کے کسی بھائی کے سامنے نہ آئی تھی، ہاں ان کی بیویوں اور نوکرانیوں سے میں نے ان کے متعلق بہت سے قصے سُن رکھے تھے، اگرچہ میں ان میں سے صرف ان کہانیوں کو ہی درست مانتی تھی جو ممکنات میں سے تھیں۔

عمر میں میرے خاوند کے بعد دوسرا بھائی وہ عیاش اور بدکردار شخص تھا جو گاؤں کی نوجوان چھوکریوں اور وہسکی کی بوتلوں کے ساتھ اپنے شب و روز اس سرکاری ریسٹ ہاؤس میں گزارا کرتا تھا، جو کئی عشرے قبل ایک معتقد وزیر نے دربار کو الاٹ کر دیا تھا۔ تیسرا بھائی بدتر تھا۔ اس کا اپنی سگی بیٹی سے جنسی رشتہ اور تعلق کوئی راز کی بات نہ تھی، اپنی دوشیزگی کھو دینے کے بعد کوئی اُسے کیسے اپناتا۔ کسی کزن سے ہوئی اس کی منگنی بالآخر توڑ دی گئی۔ کہنے والے کہتے تھے کہ یہ سب میسنی اور اس کے باپ کے حق میں ہی ہوا کہ اب ان کا گھناؤنا رشتہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا تھا۔

چوتھے بھائی نے اماں سائیں کی بھانجی سے بیاہ کے بعد تین ادھیڑ عمر خادماؤں سے بھی نکاح کر رکھا تھا۔ اس کے اپنی ساس سے جنسی تعلقات کا چرچا بھی عام تھا جو اماں سائیں کی بیوہ بہن ہونے کے ناطے اس کی حویلی میں رہائش پذیر تھی۔

ان بہیمانہ جرائم کے باوجود پیر سائیں صرف اپنے پانچویں بھائی سے ناخوش تھا جس

نے گھٹیا قسم کی زرعی ادویات کے استعمال سے اس کی کپاس کی فصل کو نقصان پہنچایا تھا' اگر چہ یہ بھائی اماں سائیں کو ملنے آیا کرتا تھا لیکن سال بھر سے میرے خاوند نے اس سے بول چال بند کر رکھی تھی۔

نگاہ پڑتے ہی پیر سائیں نے لفافہ اٹھالیا اور مجھے پوچھا "یہ تمہیں کس نے دیا؟" میں نے اسے بتایا' وہ حیرت زدہ ساد کھائی دیا۔ میرے پوچھ گچھ ختم ہو گئی' پھر کھجور کی تازہ چھڑیاں اور ٹیڑھی دونوں کے لئے آواز دی گئی' ٹیڑھی کی سن رسیدگی اس کی خوش بختی ثابت ہوئی اس کی سزا میری سزا سے کم رہی۔ مجھے پیٹ کے بل لیٹنے کا حکم ہوا جس کی میں نے فوراً تعمیل کی۔ دو نوکرانیوں نے میرے پھیلے ہوئے بازوؤں کو اوپر سر کی طرف سے پکڑا اور دو نے میرے ٹخنے اپنی گرفت میں کئے۔ برق کی طرح لہراتی کھجور کی چھڑی سے شڑاپ شڑاپ کی آوازیں آئیں، کوڑوں کی تعداد کا انحصار میری برداشت پر نہیں بلکہ اس کی اپنی ہمت اور توانائی پہ تھا۔

کپڑے کے چیتھڑے اور اُن کے نیچے میرے بدن کا گوشت ایک ساتھ پھٹتے اور اُڑتے رہے۔ میں ہونٹ بھینچے درد پیتی رہی۔ خون کے انجماد سے بچنے کے لئے مجھے فوراً اٹھ کھڑا ہونے اور چلنے کا حکم ملا۔ اپنی لاغر اور لڑکھڑاتی ٹانگوں سے کمرے کے طول و عرض کو ناپتے ہوئے میں سوچتی رہی وہ کس طرح کا انسان تھا جو جرم بے گناہی کی اتنی شدید سزا کو حق بجانب سمجھتا تھا۔ میرا بچہ' میری گٹھڑی میرا دودھ چوس رہی تھی۔

ان زخموں کے مندمل ہونے میں کئی ہفتے لگ گئے۔ اس دوران حوائج ضروریہ اور ہاتھ منہ دھونے تک کے لئے میں نوکرانیوں کی محتاج رہی۔ میں اس پہ بھی حیران تھی کہ گھر میں محرمات سے ناجائز تعلقات اتنی بے شرمی اور ڈھٹائی سے جاری و ساری تھے اور پیر سائیں اُسے روکنے کے لئے کچھ بھی نہ کر رہا تھا۔ یہ سوچ کے میرا دم گھٹتا تھا کہ اماں سائیں اور اس کے بدکردار مجرمانہ ذہنیت کے حامل بیٹوں کے آپس کے تعلقات پر اس مکروہ دھندے کا کوئی سایہ نہ پڑتا تھا۔ یہاں گناہ صرف چھوٹی چھوٹی خطاؤں کا نام تھا۔

بغلی دروازے سے میں سرنگ میں داخل ہوئی اور ایک تاریک غلام گردش سے دوسری میں ہوتے ہوئے مزار تک پہنچ گئی اندر جیسے ایک بغاوت اور انقلاب برپا تھا۔ زائرین جھوم جھوم کے ناچ اور گا رہے تھے۔ افسردگی کے بجائے وہاں زندہ دلی کا ڈیرا تھا۔ خانقاہ والے

سب ہی مردہ تھے لیکن کیا تعجب کی بات تھی کہ زندہ مردہ اور مردہ زندہ تھے۔

خاندان کی عورتوں کے لئے زیارت اور دعا کا ایک وقت مخصوص تھا جس کے دوران مزار کا بڑا چوبی دروازہ عام زائرین کے لئے بند کر دیا جاتا تھا۔

انجانی وجوہات سے میں جب بھی حویلی کی عورتوں کی قبروں کے پہلو سے گزرتی تو میرے قدم تیز تر ہو جاتے وہ مر کے بھی اتنی ہی بے بس اور کمزور رہتی تھیں' جتنی وہ زندگی کے دوران ہوتی تھی۔ رہے ان کے مرد تو وہ تو قبروں سے بھی حکمرانی کرتے تھے۔ عورتوں کا تو قبرستان بھی الگ تھا۔

چھوٹے بڑے فانوسوں میں جگمگاتے نقرئی ملمع کاری سے مرقع دیواروں والے بابا جی کے عالیشان گنبد کے نیچے کھڑے کھڑے میں سوچ رہی تھی کہ کیا وہ جانتے تھے انہوں نے کس کام کا آغاز کیا تھا؟ نازک اور پیچیدہ کٹ ورک سے جھانکتے ہوئے میں سنگ مرمر کے وسیع و عریض صحن کو دیکھ رہی تھی جو قبروں کے چہار اطراف پھیلا ہوا تھا۔ وضو کی ٹونٹیوں کی ایک قطار اس نالی میں قطرہ قطرہ رس رہی تھی جو خانقاہ کی بلند چار دیواری کے ساتھ ساتھ گھوم رہی تھی۔ چار دیواری خانقاہ کو بیرونی دنیا سے منقطع رکھتی تھی۔ میری آنکھیں بابا جی کے بڑھ کے درخت پہ اٹک گئیں۔ اس کا تنا، اس کی لاکھوں جڑوں نے آپس میں لپیٹتے ہوئے تشکیل دیا تھا بالکل اسی گنجلک سوچ کی طرح جو اس کے سایوں تلے سے چرائی گئی۔

رمضان کے مقدس مہینے میں مزار سے باہر کھلے لنگر سے غریب غربا کی تواضع کی جاتی۔ ادھر میں اندرون خانہ اپنے میاں کے خاص اور عام مریدوں کے لئے سحری اور افطار کے بندوبست میں جتی ہوتی۔ ان دنوں وہاں ہر سیدھا قدم بھی الٹا ہی پڑتا کیونکہ بھوک کے عالم میں پیر سائیں کی قوت برداشت کی سطح مزید گر جاتی۔ ادھر ہم بھی بھوکے ہی ہوتے تھے اور اس حالت میں مسلسل کوئی نہ کوئی غلطی ہوتی ہی رہتی۔ اپنے رب اور اپنے مالک کو بیک وقت راضی رکھنا ناممکن تھا۔

یہاں تو جیسے خدا اور مالک دونوں ایک ہی ہو رہتے تھے۔ رمضان کے فوراً بعد مجھے حمل ٹھہر گیا اور میں نے اسے بتا دیا۔

"حمل گرا دو" وہ بھونکا۔

دکھ اور صدمے کا پہاڑ مجھ پہ آن گرا۔ جس عمل کو وہ دوسروں کے لئے گناہ کبیرہ

سمجھتا تھا وہ اُس کے اپنے لئے حلال کیسے ہو گیا تھا؟

جب کونین کے زہر نے پیٹ کے اندر میرے بچے کو خون میں نہلا کے موت کے گھاٹ اتار دیا تو دائی نے وضاحت کی۔ رمضان کی تیس شامیں بے مزہ گزارنے کے بعد مرد مزید پرہیز کیسے کر سکتا ہے۔

میں اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کیسا تضاد تھا کہ میرا خاوند روزوں کے حکم پہ اتنی سختی سے کاربند رہنے کے بعد ان کا اختتام گناہ کبیرہ پہ کر رہا تھا؟ لیکن یہ سوال میرے دل میں ہی رہا۔ میں جانتی تھی دائی کے لئے یہ کہنا ممکن نہیں تھا کہ موج اور ترنگ میں آئے پیر کے لئے خدا کے احکامات کی کیا اہمیت تھی۔ عملاً وہ کسی اور ہی مذہب کا پیروکار تھا۔

میرا دماغ تضادات کا ڈھیر ہو گیا۔

کالی کی خودکشی۔

تارا کے رحم کا بچہ۔

ماں کا لالچ اور طمع۔

بیہمانہ ظلم اور تشدد۔

محرمات سے جنسی رشتے، عیاشی۔

بدمعاشی، بار بار کے حمل۔

ان کا ٹھہرنا اور گرایا جانا۔

سوچیں کسی رتھ کے پہیوں کی طرح ذہن میں چرچراتیں۔

مجھے مسلسل سر درد کی شکایت رہنے لگی۔

اس وقت تو میں چکرا گئی جب اماں سائیں نے مجھے بتایا کہ ان کے بیٹے نے انہیں میری دونوں بہنوں کے جہیز کے لئے چوبیس بستر، ساٹھ جوڑے، چھ عدد جڑاؤ سیٹ اور دو باورچی خانوں کے جملہ برتن میری ماں کو بھیجنے کو کہا تھا۔

زندگی میں پہلی دفعہ میرے دل میں خوف کے بجائے اس کے لئے کسی اور جذبے کی کونپل پھوٹی۔ "یہ تو بہت زیادہ ہو گا۔" میں نے کہا لیکن اماں سائیں مجھ پہ ہنس دیں "تم جانتی ہو ہمیں کسی چیز کے لئے اپنے پلے سے رقم نہیں دینا۔ کوئی مرید کچھ لے آئے گا کوئی کچھ اور" جب میں نے سُنا کہ دونوں بہنوں کی فوری منگنی کر دی گئی تھی تو میں رو دی۔ چھٹکی کا

منگیتر ایک وکیل تھا جس نے خط کے ذریعے اُسے پارک میں ملنے کو بھی کہہ دیا لیکن وہ اسے سرپرائز دینا چاہتی تھی اس لئے اس نے سہاگ رات سے پہلے اس سے ملاپ اور رابطوں کو مسترد کر دیا۔

بے وقوف! مجھے خیال آیا۔

نھنی کی منگنی ایک ڈاکٹر سے ٹھہری اور ماں خوشی سے پاگل ہو گئی۔

مجھے دونوں میں سے کسی شادی میں شامل ہونے کی اجازت نہ ملی لیکن میں نے سنا کہ ماں اپنے داماد کے لئے دعائیں کرتے نہ تھکتی تھی۔ یہ سب اُس کی برکتوں سے ہی تو ممکن ہوا تھا۔ میں نے کاغذ کی پٹی میں سوراخ کیا اور اس میں سے گویا اپنے باپ کے گھر جھانکتی رہی۔

نھنی اور چھٹکی کا جہیز میرے جہیز سے کہیں شاندار اور قیمتی تھا، ماں طاقتور اور امیر دکھائی دے رہی تھی۔ بینڈ وہی دھنیں بجا رہا تھا۔

میری بہنیں گئے زمانوں کی شہزادیاں لگ رہی تھیں۔ پریوں کے دیس کے قمقمے جگمگا رہے تھے۔

میں نے کاغذ کا ٹکڑا اپنی آنکھوں سے ہٹایا تو روشنیاں بجھ گئیں۔ میرے جہان پہ اندھیرے اور تاریکیوں کا راج تھا۔ میرا دوسرا وضع حمل میرے سر پر تھا اور میں کھنکتے، بجتے برتنوں کے شور میں اپنے روزمرہ کی نگرانی میں مصروف تھی۔ جب عورتوں کی چیخ و پکار اور بچوں کا رونا چلانا میرے اعصاب پہ سوار ہونے لگا تو میں اپنی بیٹی گُپی کے ساتھ دالان کے آخری کونے میں بچھی چارپائی پہ گر گئی۔ میرا حلیہ سوت کے پھولے ہوئے گولے کی طرح تھا۔ بے تحاشا بڑھا ہوا پیٹ سنبھالتی میں سلائیوں سے بُنائی کر رہی تھی اور گُپی نئی نئی کہانیوں کے مطالبے میں مصروف تھی۔

ایک مکھی اپنے پھیلے ہوئے پروں کے ساتھ ٹھنڈ سے منجمد مردہ پڑی تھی۔

ایک بُڑھیا نے جسے میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا گُپی کی پیشانی کو چھوا، میرے پاؤں کو ہاتھ لگائے اور نیچے فرش پہ بیٹھ گئی۔

میں نے اُسے پوچھا کہ "وہ کون تھی اور کہاں سے آئی تھی۔" اس نے چھوٹتے ہی قہقہہ لگایا۔ "بی بی آپ کو اپنے علاقے کے لوگوں کی پہچان ہونا چاہیے، ہم تو بڑے پیر کے یہاں رونق افروز ہونے سے بھی پہلے اس جگہ کے باسی ہیں جب باباجی کی میت پہاڑوں سے

یہاں لائی گئی تو میرا خاندان ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے اسے کندھا دیا۔“

بڑی عجیب عورت تھی میرے لئے یہ کہنا مشکل تھا کہ اس کی عمر سولہ سال تھی یا سو سے زیادہ' اس کے بال چاندی کے سے رو پہلے' چہرہ شکنوں سے پاک اور آنکھیں چمکدار تھیں۔ بیٹھے ہوئی وہ مشکل ہی سے دکھائی دیتی لیکن جب وہ کھڑی ہوتی تو خاصی لمبی اور قد آور نظر آتی۔

اس کے گھسے پٹے پرانے کپڑوں کے پیوند اسے باقی لوگوں کی صف میں ہی کھڑا کرتے لیکن وہ پھر بھی ان سے مختلف تھی۔ بڑی بات یہ کہ وہ بے خوف اور بے باک نظر آ رہی تھی۔

میں اپنے چاروں طرف دیکھتے ہوئے مطمئن تھی کہ اس کی یوں آمد سے کوئی بھی چوکنا نہ ہوا تھا۔ چیل بھی اس روز کوئی معمول سے زیادہ ہوشیار نہ تھی۔

”تم اس سے قبل یہاں کیوں نہیں آئیں؟ میں نے تمہیں عرس پہ بھی نہیں دیکھا تھا۔“ میں نے پوچھا۔ ”میں اپنی بہن کے ساتھ بہت دور رہتی ہوں' کوئی ہفتہ بھر پہلے ہی تو واپس لوٹی ہوں“ اس نے جواب دیا ”جہنم سے نکل جانے والوں میں کون واپس آنا چاہے گا۔“ اس کی واپسی بڑی پُر تجسس تھی' وہ قصہ گو تھی۔

اگرچہ اس کی بے باکی میرے لئے خوف کا باعث تھی لیکن خبروں کی ترسی ہوئی میں اسے کریدتی رہی۔ دائی کے بعد وہ پہلی عورت تھی جو مجھے کچھ بتانے چلی تھی۔ میں بار بار اپنے قرب و جوار پہ نگاہ دوڑاتی کہ کہیں کوئی مصیبت نہ اُٹھ کھڑی ہو اور پھر خود کو محفوظ سمجھتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ وہ نیم بہری تھی اور مجھے بار بار اسے اپنی آواز نیچی رکھنے کے لئے کہنا پڑتا لیکن یوں تاکید سے وہ سرگوشیوں پہ اتر آئی' میرے لئے کچھ سننا محال ہو گیا۔ ”ذرا تو اونچا بولو۔“ جونہی میں کہتی وہ پھر آسمان سر پہ اٹھا لیتی۔

”لڑکیاں ایسا بوجھ ہوتی ہیں جسے جتنا جلد ممکن ہو اتار دینا چاہئے میں بد شکل تو تھی ہی اوپر سے مجھے خارش کا ایک عجیب و غریب مرض لاحق تھا ایسا کہ کوئی مجھ سے شادی نہ کرنا چاہتا تھا۔ میرے باپ کا کوئی خاندان برادری تو تھی نہیں لہٰذا میری شادی کا دور دور تک کوئی امکان نہ تھا۔ پھر ایک شخص پہاڑوں سے اُترا اور میری خارش کسی معجزے کی طرح غائب ہو گئی۔“ عورت کے چہرے پہ یکدم افسردگی چھا گئی۔ ”میرا باپ میرا نکاح کسی غیر یا اجنبی کے

ساتھ پڑھانے میں خوش کہاں تھا لیکن کسی دوسرے رشتے کی عدم موجودگی میں اُس نے ہتھیار ڈال دیئے، لیکن جس رات میرا اس سے بیاہ ہونا تھا وہ مر گیا۔“

میں ابھی اسے مزید سننا چاہتی تھی لیکن گمی نے میری توجہ کے لئے رونا شروع کر دیا اور اب مزید وہاں ٹکے رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ میں نے قصہ گو عورت سے اس کی واپسی کے بارے میں پوچھا۔ ”اس نے کہا وہ کل آئے گی' یہاں سب مجھے جانتے ہیں' میری وجہ سے تمہیں کوئی گزند نہ پہنچے گا۔ چیل کے ہاتھوں بھی نہیں' وہ مجھے جانتی ہے۔ یہ سب لوگ میری کہانی سے باخبر ہیں۔“

ہاتھ ہلاتے ہوئے اُس نے اپنے آپ کو ایک بیزار کن فضول شے قرار دیتے ہوئے کہا ”بی بی جی اگر آپ خود ہماری اس ملاقات کو کوئی اہمیت نہ دو گی تو پھر دوسرے تو پوچھیں گے بھی نہیں۔“ اپنی پیشانی اور میرے پاؤں چھونے کے لئے وہ دُہری ہوئی اور پھر چل دی۔

مکھی نے پر جھاڑے اور اُڑ گئی میں نے تیزی سے اپنی چیزیں سنبھالیں اور گمی کو لئے اندر چلی گئی۔ میں حیران تھی کہ اماں سائیں نے بھی مجھ سے اس کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ نہ کی۔ اس سے بھی زیادہ حیرانی کی بات اس وقت ہوئی جب پیر سائیں دیوار کی اوٹ سے نکل کے سامنے آیا۔

چیل کے لب سِلے رہے۔

وہ ہر روز نصف ساعت کے قریب میرے پاس رہتی' پورا مہینہ بیت گیا لیکن کسی کو میرے نئے ساتھ پہ کوئی اعتراض نہ ہوا۔ مجھے شک نے آن لیا' وہ میرے خاوند کی جاسوسہ بھی تو ہو سکتی تھی لیکن اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جسے جاننے کے لئے میں تڑپ رہی تھی۔ میں نے اسے طوطی کا نام دیا کیونکہ وہ طوطے کی طرح مسلسل بولتی جاتی۔ اس نے مزار کی اصل داستان مجھ پہ کھول دی' اماں سائیں نے تو کچھ اور ہی بتایا تھا۔

”آباد گاروں کے ایک خاندان کے سربراہ نے علاقے میں زمین کا ایک ٹکڑا خریدا۔ اس کے بیٹوں میں سے ایک ملنگ تھا جس نے اپنے آپ کو دین کے لئے وقف کرتے ہوئے باپ کی وراثت میں سے ہر چیز تج دی۔ جب بڑھ کے درخت تلے دیہاتی اس کے ارد گرد اکٹھا ہونے شروع ہوئے تو اس کے بھائیوں نے اسے دیس نکالا دے دیا۔ بے گھر بے

وطن وہ نگری نگری مارا پھرا اور پھر ایک روز پہاڑوں میں غائب ہو گیا۔ کوئی دس سال بعد اس کے مرید اس کی میت لئے میدانوں میں اُترے۔ میت کے ساتھ ساتھ اس کی ہزاروں کرامتوں کے قصّے بھی تھے۔

یہ انگریز راج کے ابتدائی دنوں کا واقعہ تھا۔ غیرملکیوں کو اَکھڑ مزاج مقامی باشندوں کو رام کرنے میں بڑی دقتیں پیش آ رہی تھیں۔ یہ وہ سادہ لوح لوگ تھے جو اپنے مقامی مالکان کے ظلم و زیادتی کو تو مسلسل برداشت کرتے چلے آ رہے تھے، لیکن غیر ملکیوں کے سامنے کھڑا ہو جانا اُن کے لئے بڑا معمولی فعل تھا۔

مقامی زمیندار ان لوگوں کی اسی قوت، جذبے اور گرمئ مزاج کو استعمال کرتے ہوئے انگریزوں کو بلیک میل کرتے۔ حکومتی مراعات اور وظائف ہتھیا لینے کے بعد یہ وڈیرے اپنے بچوں کے نام لے لے کے قسمیں اٹھاتے کہ ان کا راج کے خلاف ایسی سازشوں اور جوڑ توڑ سے کوئی تعلق کوئی واسطہ نہ تھا۔

کرامات کے قصّے کہانیوں میں لپٹی باباجی کی سادہ سی قبر پہ بیرونی حاکموں کی نگاہ پڑی تو انہیں احساس ہوا کہ مزار کی مقناطیسی کشش پورے علاقے کو تسلط میں رکھنے کے کام آ سکتی تھی۔ ہمیشہ وفادار اتحادیوں کی جستجو میں رہنے والا انگریز جانتا تھا کہ اس نے نچلی پرتوں سے اٹھا کے جس کسی کو بھی عزت بخشی تھی وہ ہمیشہ کے لئے اُس کا احسان مند ہو جاتا تھا۔

طوطی کھی کھی کرکے ہنس دی۔ باباجی کے بھائیوں سے گوروں کی بات چیت نے ہر شے بدل کے رکھ دی۔ مٹی کے ڈھیر کی جگہ سنگ مرمر کی خوبصورت قبر نے لے لی۔ اس کے اوپر گنبد بنا دیا گیا جس کی دیواریں مرصع ٹائلوں سے چن دی گئیں۔ دور دراز کے لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے گنبد کی چھت کے ساتھ بلند و بالا سبز اور سنہرے مینار کھڑے کر دیئے گئے۔ بغل میں مسجد تعمیر ہوئی اور باہر لنگر کھل گیا، جہاں غریب غرباء زائرین اور مسافروں کے لئے بڑی دیگوں میں کھانا پکایا جاتا۔

وہ افتتاح کی رات تھی، طوطی ہنسی جس شخص کے سر پہ سجادہ نشینی کی دستار باندھی جانے کو تھی وہ باباجی کے اس بھائی کا بیٹا تھا، جس نے انہیں ان کے حصے کی زمین پر جبری قبضہ کر کے گھر سے نکال دیا تھا۔ ملک کے کونے کونے سے معززین کو اس لڑکے کی رسم دستار بندی میں شمولیت کی سعادت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی، جس نے ڈاڑھی تو بڑھا ہی لی

تھی اس کی زلفیں بھی طویل تر ہو گئی تھیں۔ اندر کسی صندوق میں رکھی باباجی کی پگڑی اب اس کے سر باندھ دی گئی۔ باباجی کی روحانی طاقت، تصرف، تقویٰ اور تقدس جو انہیں اس ارفع مقام تک لایا تھا پگڑی کے لمس سے اب سجادہ نشین میں منتقل ہو گیا یہی لوگوں کا عقیدہ اور ایمان تھا۔ باباجی کے اپنے رب سے عشق کا انعام اور حاصل بنا کسی مشقت کے اب اس کا ہو گیا تھا۔ فضا اللہ ہو! اللہ ہو! کی صداؤں سے گونج اٹھی، ایک جہان دستار بندی سے محظوظ ہوا۔ قبر کے پائینتی رکھی صندوقچی نوٹوں سے بھر گئی۔

طوطی نے اگلے کئی روز یہ کہانی جاری رکھی۔

مزار کی کنجی پیر کے حوالے کر دی گئی اور لوگوں کے مقدر پہ تالے لگ گئے۔ خانقاہ ہمیشہ پھلتے پھولتے کاروبار کا مرکز بنی اور انگریز حاکم اولوالامر ہو گیا جس کی رعایا اب بڑی تابعدار تھی۔ دوسرے پیر کی موت کے بعد اس کا سجادہ نشین بڑا باصلاحیت نکلا۔ آخر کیوں نہیں انہیں اس پیشے کے آداب بڑی محنت سے سکھائے گئے تھے۔

میں نے طوطی سے باباجی کے مریدوں کے بارے میں پوچھا کہ اُن کا کیا ہوا تو اس نے جواب دیا۔ "انہوں نے کوشش تو کی کہ لوگ گمراہ نہ ہوں مگر وہ ناکام ہی رہے۔ انہوں نے لوگوں کو یاد دہانی کروائی کہ باباجی سے اُن کے خاندان والوں نے کتنا بُرا سلوک روا رکھا تھا لیکن لوگوں کو دوسری کہانی ہی اچھی لگی۔ وہ کہانی جو انہیں امید دلاتی تھی۔ باباجی کے مریدوں پہ مزار میں داخلہ بند کر دیا گیا، اگرچہ وہ دوسرے دیہات کی طرف نقل مکانی کر گئے لیکن انہوں نے نسل در نسل جانوں کی بازی لگاتے ہوئے بھی مزار کی زیارت کے لئے جانا نہ چھوڑا۔ وہاں وہ لوگوں کو اس بُرے اور مشرکانہ نظام کے خلاف تنبیہ کرتے جو باباجی کے خاندان کی طرف سے قائم کیا گیا تھا۔ قابو میں آ جانے والے ہر ایسے مرید کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ صرف چیل ہی بچ سکی جس کا مشن اُن سے مختلف تھا۔"

چیل، باباجی کے اُن مریدوں کی وارث یہ میں کیا سُن رہی تھی؟ وہ کون سے مشن پہ ہے؟ میرے اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ نہ ہی طوطی مجھے یہ بتانے کو تیار تھی کہ اس نے اپنا خاندانی عہد و پیمان کیوں توڑ ڈالا تھا۔

یہ سب جان لینے کے بعد طوطی سے پوچھنے کے لئے میرے پاس ایک بڑا خاص سوال تھا کہ کیا یہ لوگ اولادِ پیغمبرؐ نہ تھے؟ ان پر اللہ کا خصوصی کرم کیا اس لئے نہ تھا کہ وہ اس

مقدس نسل سے تھے؟

طوطی نے قہقہہ لگایا۔

اس نے مری ہلسی اُڑاتے ہوئے الٹا ایک ایسا سوال کر دیا جو میری بات کا جواب تھا۔ "کیا ان کے اعمال کسی بھی حوالے سے پیغمبرؐ کی بزرگی اور عظمت کی کوئی خوشبو رکھتے ہیں؟ اس کے برعکس کیا وہ ان کے بدترین دشمنوں سے مشابہت نہیں رکھتے؟ یہ تو وہ دھوکے باز ٹھگ ہیں جو ہمارے دلوں پہ مسلط کر دیئے گئے ہیں۔ یہ ہماری جہالت اور غربت' ہمارے گھاٹے' نقصان اور ہماری کمزوریوں کو استعمال کر کے ہم پہ حکومت کرتے ہیں۔" طوطی کی جسارت نے مجھے دنگ کر دیا۔ جتنی شوخ چشم اور گستاخ وہ تھی کوئی اور کیا ہوگا۔

اس کی آگ لگا دینے والی باتوں پہ گھبرائے ہوئے میں اکثر اُسے وہیں چھوڑ کے چل دیتی لیکن ھَل مَن مزید کی تشنگی لئے ہمیشہ لوٹ آتی۔

طوطی تڑاخ تڑاخ بولتے ہوئے کبھی مجھے حیرت زدہ اور گنگ کر دیتی' کبھی وہ مجھے زور زور سے ہنساتی اور کبھی اس کی باتیں سنتے ہوئے میرا دل ڈوب جاتا۔ میں اس کی بے باکی کا پس منظر جاننا چاہتی تھی۔ آخر وہ اتنی بے خوفی سے اپنی رائے کا اظہار کیسے کر لیتی تھی، لیکن میں اس سے یہ کبھی نہ پوچھ سکی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ کہیں مجھ سے بیزار ہو کے خاموشی نہ اختیار کر لے۔

"برطانوی حکمرانوں کو یوں وہ کنجی مل گئی' جس سے دیسی لوگوں کے دلوں کا بھید جانا جا سکتا تھا۔ اب جونہی کوئی سر اُٹھتا اسے فوراً قلم کر دیا جاتا" طوطی کہہ رہی تھی "بابا جی کا نام کسی رنڈی کی طرح استعمال کیا گیا......" میں نے تیزی سے اپنا ہاتھ اپنے منہ پہ رکھ دیا۔

"دلالوں کے خاندان نے اسے نوے سال تک برطانوی لائسنس پر بیچا اور لوگ انہیں اللہ کا محبوب سمجھتے رہے 'اگر اللہ مزار کے ساتھ تھا تو پھر اُن کے ساتھ کون لڑ سکتا تھا؟" میں خوف کے عالم میں اس کا منہ تک رہی تھی۔

انگریز چلے گئے لیکن ہم ان کے تخلیق کردہ جہنم میں جل رہے تھے۔ وہ جہنم جواب ان کے کسی کام کا نہ رہا تھا۔ طوطی سے میری ملاقاتوں کے خلاف کسی ردِعمل کی عدم موجودگی بھی پریشانی کا باعث تھی' نہ تو چیل نے پیر سائیں کے سامنے میرے خلاف لب کھولے اور نہ ہی اماں سائیں نے مجھے کسی متوقع قیامت سے ڈرایا۔

طوطی جب بھی ظاہر ہوتی ہر شے جہاں ہوتی اس کی واپسی تک جیسے وہیں منجمد ہو جاتی۔ وہ اپنے میاں کے عشق میں ثابت قدم تھی' مجھے یقین تھا کہ دوسرا کوئی کبھی نہ ملتا' کہتے کہتے وہ ہنس دیتی لیکن اس نے یہ کبھی نہ بتایا کہ اس کی موت کیسے واقع ہوئی۔ اس کے جواب میں میرے چہرے پہ مرکوز اس کی آنکھوں میں نمی اُمڈ آتی اور اس کے ہونٹوں پہ ایسے الفاظ جو نرا معمہ ہوتے۔

"ہم ایک طوفان کے تھپیڑوں کی زد میں تھے۔ اُس نے ہماری محبت کو آسمانوں پہ اُڑا دیا۔ راکھ کبھی اکٹھی نہ ہوئی' گرد کبھی بیٹھی ہی نہیں' مجھے دیکھو؟ ایک دن میں جوان تھی' دوسرے روز بوڑھی۔"

ایک روز وہ خوشی سے ناچ اٹھی "بی بی جی وہ ہماری شادی کی سالگرہ پہ مجھے ملنے آ رہا ہے۔ اُس صبح کے لئے میں سال بھر منتظر رہتی ہوں۔"

میری حیرت اس کے قہقہے کا باعث بنی۔ "بی بی جی مرد بے وفا' حرامی ہوتے ہیں۔ صرف میرا خاوند ہی وفا کا پتلا ہے جو مر کے بھی میرا ہی رہا۔" میں نے سوچا کاش میرا مرد بھی زندہ ہونے کے بجائے مردہ ہوتا۔

طوطی نے سالگرہ پہ گھسے ہوئے زری تاروں والی بروکیڈ کی قمیص پہن رکھی تھی جس کی دھاری دار شکنیں بیتے ہوئے وقت کی گواہی دے رہی تھیں۔ اس کے سر پر ٹشو کا دوپٹہ تار تار ہو رہا تھا اور طلّے سے بجے سنہری جوتوں کی چمک دم توڑ چکی تھی۔ کانوں کی بالیوں کی لمبی زنجیر زنگ خوردہ بکلوں کے ساتھ سر کے اڑے ہوئے بالوں میں اڑسی ہوئی تھی۔ ٹھوڑی کے نیچے لٹکتا گلوبند اس کے آگے کو جھکتے ہوئے بدن کے ساتھ ہل رہا تھا۔

دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے وہ کسی تیز طرار کراری لڑکی کی طرح کھڑے دائرے میں گھوم گئی۔ "وہ آج آئے گا' آج سہ پہر تم اُسے دیکھنے آ سکتی ہو۔ میں تمہیں اجازت دے دوں گی' میری طرف سے تم ضرور آؤ۔" اس دائمی نقصان نے غریب طوطی کو پاگل کر دیا تھا۔ میں نے مزاحاً پوچھا "کیا دوسرے لوگ اسے نہیں دیکھ سکیں گے؟" "یقیناً نہیں۔" اس نے بڑی تمکنت سے جواب دیا "میرے مرد کو صرف وہی دیکھ سکتا ہے جسے میں پروانہ دوں۔"

اس کا چہرہ بجلی کے قمقمے کی طرح روشن ہو گیا ایک سرد یخ بستہ لہر میرے بدن میں

دوڑ گئی مجھے وہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔

وہ آگیا تھا۔

حدود سے باہر، غیر واضح، منتشر سا، لمبا چوڑا، اس کی مونچھیں طرح دار تھیں۔

میں نے اسے دیکھا۔

فطرت سے ماورئی نظارے کے ردِعمل میں میں نے چیخنا چاہا لیکن میں تو گونگی ہو گئی تھی ایک عجیب و غریب شخص حویلی میں آگھسا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ مردہ تھا۔ مجھے ہوش آیا تو میں سلائی کے اسی پہلے ٹانکے پہ تھی۔

طوطی کی روحانی مسرت غصے میں بدل گئی' "میں پورا سال اس کی ایک جھلک کے انتظار میں گزارتی ہوں لیکن وہ صرف لمحہ بھر کو رکتا ہے۔ میں اس پیاسی فصل کی طرح ہوں جو بارش کی منتظر ہو' لیکن لدے پھندے بادل اس کے اُوپر سے بنا برسے گزر جائیں۔"

اگرچہ خوف کی برفیلی لہریں میرے بدن کے آرپار ہو رہی تھیں، لیکن میں نے پھر بھی طوطی کو بہادر بننے کو کہا۔

"تم اپنے میاں کے لئے بچے جنتی رہو اور میں اذیتیں سہتی رہوں؟ یہ کتنی بے انصافی ہے کہ تم اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار نہیں سمجھتی ہو؟" اس نے شکایتاً کہا۔

یہ پہلی بار تھا کہ اس نے ہمیں اس کا ذمہ دار قرار دیا۔ "کیا تمہارے خاوند کو ہم نے قتل کیا؟" میں نے بے ساختگی سے کہا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور کچھ کہے بنا چل دی۔

ایک بڑا راز سنبھالے میں چیل کے پہلو سے گزری۔

اسی رات مجھے دردِ زہ اٹھا۔

درد کی خاموش دھار دور میرے اندر سے کہیں اٹھتی، پھیلتی اور قیامت برپا کرتے ہوئے اسی طرح لوٹ جاتی۔ سولہ گھنٹے تک بار بار یہی کچھ ہوتا رہا اور بالآخر میں نے مزار کی گود میں اولادِ نرینہ ڈال دی۔ فوری مسرت اور شادمانی میرے تحت الشعور میں اتر گئی تھی۔

مالک سنجیدہ اور پُر متانت انداز میں مبارک سلامت کے جواب میں دعائیں دیتا رہا۔

بیٹے کی پیدائش کے چالیسویں روز میں نے نقرئی کمخواب کا جوڑا پہنا اور سر پہ ایک بڑا نایاب ٹشو کا دوپٹہ لیا۔ میرے کانوں میں لعل جگمگا رہے تھے اور پاؤں میں خالص طلے کی ہیروں جیسی جوتی تھی۔ وارث کو بازوؤں میں لئے میں اس کے آبائی مزار پہ دعا کرنے پہنچی۔

میرے جلو میں عورتوں کا قافلہ تھا۔ واپسی پہ میں اپنے بیٹے کو ورثے میں مل سکنے والے ناگوار اور تکلیف دہ مقام اور حیثیت کا تصور کرتے ہوئے کانپتی رہی۔ وہاں ہر کوئی یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کتنے بھاگوں والا تھا۔ یہ تو میں ہی جانتی تھی کہ وہ خدا کے غیض و غضب کو دعوت دینے کا سزاوار بھی ہو سکتا تھا۔

باباجی کی قبر پر میں نے اللہ سے التجا کی کہ وہ میرے بیٹے کو اس کے باپ سے ملنے والی ممکنہ تربیت کی بناء پر نہ پکڑے' میں نے دعا کی خدایا میرا بیٹا باباجی کے نقشِ قدم پہ چلے۔ دیوتا بننے کے بجائے وہ اچھا مسلمان بنے۔

میں صحن میں لوٹ آئی جو زرق برق ملبوسات پہنے عورتوں کی موجودگی میں دمک اٹھا تھا۔ سبز' سرخ' نیلا اور زرد رنگ جیسے میری روح کے اندر اتر گئے۔ عورتیں وارفتگی کے عالم میں یوں ناچ رہی تھیں کہ فضا میں گزرتے ہوئے وقت کا کوئی سراغ نہ تھا۔ یہ کوئی دوسرا ہی جہان تھا اور دوسرے ہی لوگ۔

ہاتھ اپنے سینے پہ باندھے کھڑی چیل بہرحال ایک استثنیٰ تھی۔ جاگیرداروں کی بیگمات سونے کے تحائف لئے آئیں۔ غریب ہر وہ شے اٹھا لائے جس پہ انہیں قدرت تھی۔ حویلی کے باہر صبح سے شام تک انواع و اقسام کے تازہ پھلوں' خشک میووں' مٹھائیوں' آٹے اور چینی کی بوریوں' گھی اور تیل کے ڈبوں اور ذبح کئے ہوئے جانوروں کے پہاڑ کھڑے ہو گئے۔ یہ سالانہ عرس کی طرح کا یادگار دن ثابت ہوا' جسے اللہ سے واپسی کا ملاپ قرار دے کے منایا جاتا تھا۔

ماں اپنے پہلے نواسے کی آمد پر فخر و انبساط کا مرقع ہو گئی۔ اس کے بعد میرا جونہی اس سے سامنا ہوتا وہ مجھے چومتے چاٹتے پُرجوش انداز میں دعا دیتی "اللہ تمہیں اس سے بھی زیادہ عزت اور احترام عطا کرے۔ اللہ تجھے پوری دنیا پہ حکمرانی نصیب کرے۔"

کیا وہ جانتی نہیں تھی کہ میری دنیا تو بس یہی تھی؟ میں دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔ میرے اور ماں کے درمیان کتنی دوری تھی؟ لیکن وہ اسے کب مانتی تھی۔

پیر سائیں کی بھابیاں چار کا ٹولہ ہو کے میری طرف بڑھیں' وہ ہمیشہ ایک دوسری سے جڑی رہتی تھیں۔ میں نے ان میں سے کسی کو کبھی اکیلے نہ دیکھا تھا۔ مزار کے نئے وارث کو طویل العمری کی دعائیں دیتے ہوئے انہوں نے مجھے اس کی پیدائش پہ مبارکیاں دیں۔ اس

موقع کو میری طاقت کا باعث بننا چاہئے تھا، لیکن یہ کچھ دوسرے ہی احساسات کی نذر ہو گیا تھا۔ میسنی کو اپنی طرف آتے دیکھتے ہوئے میرے دل میں یہ خواہش ابھری کہ میں اسے گناہ آلود بے حسی کے عالم سے نکالنے کے لئے جھنجوڑوں لیکن عملاً میں نے اسے گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔ وہ لمحہ بھر کو اِدھر اُدھر دیکھتی تو میں بار بار بڑے غور سے اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیتے ہوئے اس کے متعلق سوچتی۔

وہ اتنی بجھی بجھی تھی کہ اسے چلتا پھرتا مردہ کہا جاسکتا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا اور اس کی خوفزدہ آنکھوں میں جھانکنے والا خود بھی خوفزدہ ہو جاتا۔ وہ کسی خرگوش کی مانند صیاد کے جال میں گرفتار تھی۔ اس کی ماں اس سے مختلف تھی۔

اس کے سخت تیکھے نقوش والے چہرے سے ناراضگی ہویدا تھی۔ وہ اپنی حویلی کی سب سے بالا قوت تھی لیکن صرف اس وجہ سے کہ اس نے کبھی کسی کو چیلنج نہ کیا تھا۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ میسنی اور اس کی ماں کی آپس کی بات چیت بالکل بند تھی۔ رشتہ دار خواتین اور خادمائیں ہی ان کے درمیان کسی رابطے اور پیغام رسانی کا ذریعہ ہو سکتی تھیں۔ امراء کی بیگمات کے جمگھٹے میں بیٹھے بیٹھے ایک مل مالک تخی بابا کی شریک حیات تخی بی بی میرے قریب ہوئی۔ پچھلے کئی سالوں سے وہ خرابی صحت کی بناء پہ کسی دور دراز گاؤں میں اپنے والد کے ہاں صاحبِ فراش رہی تھی۔

تخی بی بی نے اپنی آواز نیچی رکھتے ہوئے میرے کانوں میں اس خیال کا اظہار کیا جو پہلے ہی کہیں میرے دل میں موجود تھا۔ "قرآن ترجمے سے پڑھو اور اسے خوب سمجھو۔ کلام پاک تم پہ ہمارے دین کے اصل معنی کھول کے رکھ دے گا۔" میں اماں سائیں کو خشمگین نگاہوں سے گھورتے ہوئے دیکھ کر اس سے پرے ہٹ گئی۔ جشنِ مُسرت ہر شے پر حاوی ہو چکا تھا لیکن میری آنکھیں تخی بی بی کے تعاقب میں رہیں۔

اماں سائیں نے مجھے پکڑ لیا "مل والے کی بیوی سے گپیں مت ہانکو" انہوں نے حکم دیا "وہ ہماری خیر خواہ نہیں ہے۔" جب انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ وہ مجھ سے کیا کہہ رہی تھی تو میں نے جھوٹ بول دیا۔

اس کے بجائے اماں سائیں نے ایک ہی خاندان میں بیاہی گئی دو بہنوں سے میرا تعارف کروایا۔ یہ ان لوگوں میں سے تھے جو کئی عشروں سے مزار کے کٹر عقیدت مند چلے آ

رہے تھے۔ دونوں دلہنیں اٹھارہ سال پیشتر تک بے اولاد ہی رہی تھیں، حتیٰ کہ پیر سائیں کی دعا سے ایک بیٹے اور دوسری بیٹی کی نعمت سے سرفراز ہوئی۔ اولاد کی خوشی میں کسانوں نے پیر سائیں کے گیت گاتے ہوئے' مٹھائیاں بانٹیں' لڑکے کو مہاراجہ اور لڑکی کو مہارانی کے نام دیئے گئے۔ عین پیدائش کے روز ہی ان دونوں کو منگنی کے بندھن میں جکڑ دیا گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ تخی بی بی کے علاوہ صرف یہ دو عورتیں ہی مطمئن اور آسودہ دکھائی دے رہی تھیں، ایسا شاید ان کے شوہروں کے اچھے سلوک کی وجہ سے ہو گا۔

اسی دوران ماں ہر ملنے والی کو بڑے فخر و مباحات سے بتاتی چلی آ رہی تھی کہ ' "دیکھو ہیر کیسے اچھے انداز میں اتنے بھرے پُرے گھر کو سنبھالے ہوئے ہے۔ دیکھو وہ کیسے اس عظیم گھرانے کا حصہ ہو گئی ہے۔"

"میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ اللہ ہمیشہ ہماری فریادیں سنتا ہے۔" اُس نے مجھے کہا' "اگر تم بے صبری ہو کے دل چھوڑ دیتیں تو ان مستقل روحانی کرم نوازیوں کے بجائے محض ایک وقتی اور فضول فائدہ اور نتیجہ نکلتا۔ دیکھو اب اللہ نے تم پہ کتنا فضل کیا ہے؟"

میں نے جھوٹ موٹ کی تائید کرتے ہوئے اس کا ہاتھ دبایا۔ ماں اس نتیجے پہ پہنچ چکی تھی کہ یا تو میں اپنے حالات سے خوش تھی یا ایسا ہونا چاہئے تھا یا میرے لئے لازم تھا کہ میں خوش رہتی۔

میں کمرے کو اوپر نیچے ناپتے ہوئے مسلسل سوچ رہی تھی کیا بابا بھی اسی جیسے تھے؟ دونوں بالآخر ایک ہی کمزور طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ایسے لوگ جو امیر اور طاقتور لوگوں سے واسطہ جوڑنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے رہے تھے۔ اُن کے پاس شیخیاں بگھارنے یا کسی کو دکھانے کے لئے اور کیا تھا۔ ان حالات میں بابا کی عدم موجودگی بہرحال میرے لئے باعثِ سکون تھی۔ ان کے لئے ماں کی طرح منہ کا ملاحظہ رکھنا ضروری نہ ہوتا لیکن پھر وہ کیا کر سکتے؟ میرا ذہن تیزی سے دوبارہ اسی سوچ کی طرف پلٹا کہ شاید بابا بھی ماں ہی کی طرح کے ہوتے۔ میں نے بھلا کب سوچا تھا کہ ماں مجھے یوں چھوڑ دے گی۔

تخی بی بی رخصت ہونے کے لئے اجازت مانگنے آئی تو میں نے دائی سے پوچھا ' "اماں سائیں اس کے خلاف کیوں ہیں۔" "وہ سالہا سال بے اولاد رہی تھی۔" دائی نے بتایا "اس دوران لوگ اسے مسلسل ترغیب دلاتے رہے کہ وہ پیر سائیں کے پاس جائے جو اپنی

دعاؤں سے اس کا بانجھ پن ختم کر سکتا تھا۔" "میں بے دین لوگوں پہ ایمان لانے کے بجائے بے اولاد رہنے کو ترجیح دوں گی۔" وہ جواباً کہتی۔

تین سال پہلے اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا جس پہ بڑی خوشیاں منائی گئیں۔" بہرحال وہ ہماری خیر خواہ نہیں"، دائی نے ساتھ ہی فتویٰ جڑ دیا۔

بھائی عورتوں کے سامنے نہیں آ سکتا تھا لیکن روانگی سے پہلے اُسے ایک خالی کمرے میں لایا گیا۔ اسے دیکھتے ہی میں بے اختیار چلا اٹھتی لیکن میں نے ضبط کیا اور چپ رہی۔ مجھے اس سے ملے ہوئے چار سال گزر گئے تھے۔ وہ بڑا بڑا لگ رہا تھا' دبلا پتلا اور لمبا' وہ میرے چہرے پہ کچھ پڑھنے کی کوشش میں تھا' میں اس کے چہرے پہ ڈھونڈ رہی تھی کہ وہ کیا اور کتنا کچھ جانتا تھا۔ ہم دونوں میں سے کوئی کچھ بھی نہ بتا سکا۔

وہ اپنی پڑھائی' اپنے اساتذہ اور اپنے مستقبل کے بارے میں طفلانہ گفتگو میں مصروف رہا۔ میرے مصائب سے بظاہر بے خبر وہ اعصاب کو متاثر کرنے والی رفتار سے بولتا رہا۔

بند اچانک ٹوٹ گیا اور وہ پھوٹ پڑا۔ "ماں کو نہ بتانا میں نے تم سے کیا پوچھا تھا لیکن سچ کہو اب جب کہ تم دو بچوں کی ماں ہو کیا تم خوش ہو؟" اپنی کسی عزیز شے کو اپنے سامنے ڈوبتے ہوئے چھوڑ دینے کے احساس نے یقیناً اسے دکھوں کے بوجھ سے لاد دیا ہو گا۔

بھائی حالات کی تصدیق کا منتظر تھا جو میرے علاوہ کوئی اور نہ کر سکتا تھا' لیکن میں تو اسے دُکھوں سے بچانا چاہتی تھی۔ جب میں نے بات ختم کی تو اس کا چہرہ خوشی سے روشن ہو گیا۔ "خدا کا شکر ہے آپا" اس نے بے ساختہ کہا۔

میں نے اُس کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اس کا سر اپنے سینے میں چھپا لیا۔ "بھائی میری فکر مت کیا کرو' بلکہ تم مجھ پر ایسے ہی فخر کیا کرو جیسے ماں کرتی ہے' میری شادی بھلا باعث شرم کیسے ہو سکتی ہے؟" لیکن میرے سینے سے لگا وہ اب سسکیاں بھر رہا تھا میں نے اسے یقین دہانی کرواتے ہوئے کہا' "میری زندگی کو ان حوالوں سے مت جانچو کہ میں تمہارے پاس نہیں آ سکتی اور تم میرے پاس آ کر تو ٹھہر نہیں سکتے۔ یہاں کی روایات ہمارے لئے مشکل تو ہیں لیکن وہ باقی ہر شے کی نفی تو نہیں کرتیں۔"

بھائی نے سر اٹھاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہا "آپا قسم اٹھاؤ' کیا یہ سچ ہے؟"

میں نے قسم تو اٹھا ہی لی لیکن سوچتی رہی کہ بھلا یہ کبھی ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ میرے منڈے

ہوئے سر کو بُھلا دیتا؟

بھائی کی پریشانی میرے لئے ماں کی چشم پوشی سے زیادہ اذیت ناک تھی۔

مجھے اپنے غریب خاندان کو اپنے متعدی دُکھ درد سے بچانا تھا۔ اُن سے اُن کے پیار کی یقین دہانیوں کی توقع کرنا میری خود غرضی ہی ہوتی۔ مجھ سے پیار ان کے لئے موت کا پیغام ہو سکتا تھا۔ میں بھاگتی ہوئی باہر نکلی اور ماں سے لپٹ گئی۔ میں اُسے بے تحاشا پاگلوں کی طرح چوم رہی تھی۔ وہ یقیناً حیران تھی کہ ہمارے آپس کے فاصلے کیونکر اور کیسے مٹ گئے تھے۔

باب ۶

چوکور دائرے

ہر کوئی جا چکا تھا۔ رسومات اور تضادات سے تھک ہار کر میں بچوں کے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ میرا بیٹا میرے پہلو میں تھا۔ گُمی میری پائینتی ربڑ کی اس گڑیا سے کھیل رہی تھی جو اس کی اور میری طرح تھی بلکہ حویلی کی تمام عورتوں کی طرح میں سوچ رہی تھی کیا اسے اپنے اور اپنے بھائی کے درمیان مرتبے کے فرق اور تمیز کا احساس ہو سکتا تھا۔

طوطی سیدھی اندر داخل ہوئی۔

میں نے حیرانی سے پوچھا ''تو اندر کیسے آئی؟'' اس نے قسم کھائی کہ کسی نے اُسے دیکھا نہ تھا اور ساتھ ہی مجھے سنائیں کہ میں تو اپنے سائے سے بھی خوفزدہ تھی۔ میں اسے کالی کے حشر کے بارے میں بتا کے خطرے سے آگاہ کرنا چاہتی تھی' لیکن اس کے بجائے میں نے جھوٹ موٹ کا غصہ دکھاتے ہوئے کہا۔

''بڈھی گائے' تو کہاں تھی۔ تو میرے بیٹے کی رسم پہ بھی نہیں آئی۔ تجھے اپنی سالگرہ منانے کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا؟'' اس نے ڈھیروں جواز دیئے لیکن سب جھوٹ لگ رہا تھا۔ میرے ننھے بیٹے چھوٹے سائیں کے گرد ناچتے ہوئے اس نے اُسے بہلانے کے لئے گیت گایا۔ گُمی گیتوں کی رسیا تھی لیکن اس وقت اس نے اُس کی حرکتوں میں کوئی دلچسپی نہ لی۔

طوطی الوداع ہونے آئی تھی۔ وہ ایک بار پھر گاؤں چھوڑ رہی تھی۔ اس کی غیر حاضری کے تصور سے پریشان ہوتے ہوئے میں نے کہا ''لیکن تو واحد عورت ہے جس کے یہاں آنے پہ اُنہیں اعتراض نہیں ہوتا۔ تو بھی چلی گئی تو میں کس سے باتیں کروں گی۔''

میرا ہاتھ بے تحاشا چومتے ہوئے طوطی نے مجھ سے وعدہ کیا ''میں جلد ہی لوٹ آؤں گی اور پھر تمہیں کالی کی کہانی سناؤں گی۔''

اُس نے اس سے قبل تو یہ ذکر کبھی نہ کیا تھا کہ وہ جانتی تھی اور اب وہ بہت جلدی میں تھی۔ میں نے اُسے روکنے کی کوشش کی ''جانے سے پہلے مجھے کچھ بتاتی جاؤ' مجھ میں انتظار کی تاب نہیں۔''

طوطی دروازے کی طرف بڑھی' وہ کہانی کو مستقبل کی اگلی ملاقات پہ چھوڑے جا رہی

تھی۔ ''مجھے کچھ تو بتا دو' کوئی ایک چیز کچھ تھوڑا بہت'' میں نے اس کی منت کی۔

اس نے کالی کی خودکشی کی جو بھیانک وجہ بتائی اس کو سُن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں چلانے اور رونے لگی وہ جا چکی تھی۔ گُمی نے مجھ سے لپٹتے ہوئے مجھے غم اور افسردگی سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ اس کی تمنا تھی کہ میں رونا دھونا چھوڑ کے اس کے لئے کوئی نئی لوری چھیڑ دوں' ہچکیوں کے درمیان میں نے اس سے پوچھا ''تمہارا اس گیت کے بارے میں کیا خیال ہے جو طوطی گا رہی تھی۔ وہ تمہیں پسند آیا؟''

''میں نے تو وہ سُنا ہی نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''گُمی' وہی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے مائی گا رہی تھی'' میں نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی لیکن اُسے کچھ یاد نہ تھا۔

میں متعجب سی بیٹھ گئی۔

''گُمی' تمہیں وہ عورت یاد ہے جو باہر ہوا کرتی تھی؟ وہی جو تمہارے بھائی کی پیدائش سے پہلے میرے پاس بیٹھا کرتی تھی۔''

''نہیں'' اُس نے کہا۔

شاید اُسے اتنی پرانی باتیں یاد نہیں ہو سکتی تھیں ''میں نے پھر کوشش کی تھوڑی دیر پہلے وہ یہیں تھی کیا تم نے اُسے دیکھا تھا؟'' سر نفی میں ہلاتے ہوئے اس نے جواب دیا ''میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا نہ یہاں نہ وہاں۔'' کیا اس کی بینائی ختم ہو رہی تھی' یا وہ قوتِ سماعت کھو رہی تھی؟

میں اس کی توجہ طوطی کی طرف مبذول کرنے میں ناکامی پہ جھنجلا اُٹھی اور کچھ سوچتے ہوئے دائی کو آواز دی۔

''گُمی کیا تم دائی اماں کو دیکھ سکتی ہو؟'' وہ دیکھ سکتی تھی۔ ایک ایک کر کے میں نے کئی عورتوں کو بلایا۔ وہ اُن سب کو بخوبی دیکھ سکتی تھی' تو پھر وہ طوطی کو کیوں نہ دیکھ سکی تھی۔

ہفتہ بھر تشویش کے عالم میں میں اس کے عجیب و غریب مرض کا جائزہ لیتی رہی، آخر کار میں نے اماں سائیں سے خاندانی حکیم کو بلانے کی درخواست کی۔

''پرانی نوکرانیوں میں سے وہ کس کو نہیں دیکھ سکتی۔'' اماں سائیں نے قہقہہ لگایا ''اسے جو میرے وضع حمل سے پہلے میرے پاس بیٹھا کرتی تھی۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

"وہ کون سی تھی؟" اس نے دریافت کیا۔

اوہ خدایا! میں طوطی کی پردہ داری کیسے کر سکتی تھی؟ اس معاملے کو مختلف رنگ دے کے میرے ہی منہ پہ مارا جا سکتا تھا۔ سوئی ہوئی بلائیں بیدار ہو کر حملہ آور ہو سکتی تھی لیکن میرے لئے یہ لازم تھا کہ میں گھی کے مسئلے کی وجوہ ڈھونڈ نکالتی۔ میں پھوٹ پڑی "وہ نوجوان تھی، نہیں وہ بوڑھی تھی۔ نہیں، وہ مکار نظر آتی تھی۔"

اماں سائیں نے درشت لہجے میں میری بات کاٹ ڈالی "اور کس کس نے اُسے دیکھا تھا۔" "میرے خیال میں سب ہی نے۔" میں نے جواب دیا۔

اماں سائیں نے ان تمام عورتوں کو بلایا جن کے نام میں نے لئے تھے لیکن اُن سب نے طوطی کو دیکھنے کا انکار کیا۔ میں نے انہیں وہ چھوٹی چھوٹی باتیں یاد کروائیں جو ان کی یادداشت میں تازہ ہو سکتی تھیں، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

"چیل سے پوچھیں۔" میں نے مشورہ دیا "اسے تو باخبر ہونا چاہئے۔" لیکن وہ بھی لاعلم نکلی۔

تو پھر طوطی اندر کیسے آئی تھی؟ کیا میں پاگل ہو رہی تھی؟ کیا نوکرانیاں مجھے پیر سائیں سے بچاتی رہی تھیں؟ کیا چیل مجھے تحفظ دے رہی تھی؟ یہ ناممکن تھا لیکن گھی ان کے کہے میں ہو سکتی تھی ننھی گھی باقی سب کی طرح ہی تھی، اگر کوئی مختلف تھا تو وہ میں ہی تھی۔

جب میں نے کہا کہ اس کے منگیتر کو مرے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے لیکن سال بھر انتظار کے بعد اپنی منگنی کی سالگرہ کے روز اس کی روح اُسے ملنے آتی ہے، تو کمرے میں ہلچل مچ گئی۔

اماں سائیں نے تالی بجاتے ہوئے سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی جیسے اعلان کیا "اس کو مرے ہوئے پچاس سال گزر چکے ہیں۔" میں نے احتجاج کیا "وہ زندہ ہے، مجھے اس کا یقین ہے" لیکن اماں سائیں نے نوکرانیوں کو ان گنت ہدایات دینا شروع کر دیں "دم کے لئے پانی لاؤ، جلدی کرو، گدھی کہیں کی، بھاگو۔" اِدھر میں گھبرائی ہوئی "پالاماری" مکھی کو یاد کر رہی تھی۔

"وہ اتنی بدصورت تھی کہ لوگ اسے بدرنگ کہا کرتے تھے۔" دائی نے میرے کان میں سرگوشی کی تو میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچی "صرف مالک ہی اس کی روح کو دور رکھ سکتا ہے۔" اس نے دوبارہ سرگوشی کی۔

مالک اور طوطی دونوں کا خوف آپس میں ٹکرایا۔

پھر اس کا بھوت غالب آ گیا۔ وہ دروازہ کھولے بنا میرے کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہ جہاں چاہتی آ جا سکتی تھی۔ خوف نے مجھے جکڑ لیا، پیر سائیں کی دہشت کی گرفت سخت ہو گئی۔ وہ بدتر تھی، نہیں وہ بدتر تھا۔

کیا یہ میری غلطی تھی؟ میں کسی روح سے پیچھا کیسے چھڑا سکتی تھی۔ اماں سائیں غضبناک ہو رہی تھی۔ "ہر موسم سرما میں وہ کمزور ایمان والوں کو بہکانے آتی ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد کے بارے میں جھوٹ بکتے ہوئے وہ انہیں ہماری بے ادبی اور بے حرمتی پہ اکساتی ہے۔"

مجھ پہ آیتیں پڑھ کر پھونکتے ہوئے انہوں نے کہا "تم بہت خوش نصیب ہو کہ اس کے وار سے بچ گئیں۔ بدرنگ اپنی موت کے بعد ہر اُس عورت کو دکھائی دیتی ہے جو کمزور ایمان ہو۔ کالی اور بہت سی دوسریوں کو موت کے منہ میں اُسی نے تو دھکیلا تھا۔ یہ قصہ سُن کے تمہارا خاوند بالکل خوش نہ ہو گا۔"

جب میرے خاوند نے یہ سُنا تو اس کا چہرہ واقعی غیظ و غضب سے بھر گیا اور اس کا لہجہ شیطانی ہو گیا۔

"اللہ نے میرے فرزند کی ماں کا پردہ چاک کر دیا ہے، اس نے ہمیں ایک شیطان سے باخبر کر دیا ہے۔"

"خدا نے میرے مصائب میں اضافے کے لئے ایک چڑیل کو بھیجنا کیوں ضروری سمجھا، پہلے کوئی کم تھے؟ چہرے پہ زناٹے کے ایک تھپڑ نے مجھے اماں سائیں کے کمرے کے دوسرے کونے میں دے مارا۔ مجھے بالوں سے گھسیٹتے ہوئے پیر سائیں مجھے موت کی کوٹھڑی، ہماری خواب گاہ میں لے آیا۔ رانوں کے درمیان رسید ہوئے ٹھڈے نے مجھے درد سے دُہرا کر دیا۔ اس کا ایک پاؤں میری گردن پر تھا۔ میری آنکھوں کے ڈیلے باہر ابل پڑے بالکل اسی طرح جیسے اس کی توند اس کے بدن سے باہر نکلی ہوئی تھی۔

اس نے سب کچھ بتانے کا مطالبہ کیا "خواہ تمہاری جان جائے میں تم سے سب کچھ سنوں گا۔" مصیبت ٹلنے تک جیسے پوری زندگی گزر گئی تھی۔

اماں سائیں نے بہت سے تعویز میری گردن میں ڈالتے ہوئے مجھے اپنی متبرک سانسوں سے نواز رہی تھی اور میں طوطی سے نجات کے لئے دعاؤں میں مصروف تھی۔ اس کے بعد نہ تو

کبھی میں بھولے سے عقبی دالان میں گئی اور نہ ہی کبھی اکیلا ہونے کی جرأت کی لیکن کوشش کے باوجود میں اسے اپنی سوچوں سے محو نہ کرسکی۔

دائی نے مجھے طوطی کی کہانی سنائی۔

طوطی کے بلوچ منگیتر پر پیر سائیں ثالث کے ایک مہمان کی جیب کاٹنے کا الزام لگا تھا۔ کسی مقامی کو یہ جرأت ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ نتائج کے متعلق باخبر ہونے کے باوجود ایسی حرکت کرتا۔ بلوچ غیر مقامی تھا "اگر جرم نامانوس ہے تو مجرم تو غیر ہی ہوگا۔" ہر طرف سے کہا گیا۔ بلوچ کو گھسیٹتے ہوئے پیر کے سامنے لے جایا گیا جہاں اس نے صحتِ الزام سے انکار کیا' لیکن بدرنگ جیسی مسترد شدہ عورت سے شادی کرنے کی اس کی خواہش اس کے خلاف شہادت ہوگئی۔ "ایک کڑیل اور خوبصورت مرد ایسی دلہن کا انتخاب کیسے کرسکتا ہے۔" پیر نے فیصلہ دیتے ہوئے کہا "یہ محض ہمارے علاقے میں آباد ہونے کا بہانہ ہے۔" مردہ دلوں کے اس ماحول میں کسی چاہنے والے دل کی تمناؤں کی کیا قدر و قیمت ہوسکتی تھی۔

یہ کپاس چننے کا موسم تھا۔ پیر چارپائی پہ نیم دراز اور اس کے حواری اپنے سرد مہر دل خستہ حال رنگ دار چادروں میں چھپائے فرش پہ آلتی پالتی مارے براجمان تھے۔ بدرنگ کے مرد کو رسوں کی مدد سے درخت کے تنے کے ساتھ جکڑ دیا گیا۔ اس درخت کو "تھانہ" کا نام دیا گیا تھا اور جبر و تشدد ڈھانے کے لئے یہ بڑا خاص مقام تھا۔

ایک بلوچ کے لئے اس کی مونچھ اس کی غیرت ہوتی ہے۔ پیر نے حکم دیا "اکھاڑ ڈالو۔" دو آدمی آگے بڑھے انہوں نے اپنی انگلیوں کے پورے نیم کے کڑوے عرق میں ڈبوئے اور پھر بلوچ کی مونچھوں کے ایک ایک بال کو جڑوں سے اکھاڑ ڈالا۔ درد اور اذیت سے وہ کسی بھیڑیئے کی طرح چیخ رہا تھا۔

پیر سائیں ثالث کی اس سے تسلی نہ ہوئی۔ اُس نے اپنے بندوں کو حکم دیا کہ وہ اسے کھول کے ننگا کردیں اور پھر درخت سے یوں باندھیں کہ اس کی پشت کھلی ہو۔ کھجی کی چابکوں نے اس کی کھال ادھیڑ ڈالی۔ وہ پاگل کتے کی طرح چلاتا ہوا بے ہوش ہوگیا۔ رسہ کھولا گیا تو وہ پھسلتا ہوا زمین پہ ڈھیر ہوگیا' پھر یکایک مچھلی کی طرح تڑپتے ہوئے وہ فضا میں بلند ہوا۔ کپاس کی سینکڑوں سرخ سُنڈیاں اس کے بدن پہ دیوانہ وار بھاگتی اسے بھڑوں کی طرح کاٹ رہی تھیں۔ رحم کے لئے اس کی التجائیں ہر کسی نے سنیں اور کوئی بھی سکون سے بیٹھا نہ رہ سکا۔

بدرنگ دلہن کا جوڑا پہنے چیختی چلاتی باہر بھاگی۔ اس کا بوڑھا باپ اسے بدقت اپنے شکستہ جھونپڑے میں واپس لایا اور پھر تھپڑوں کی بارش میں وہ چپ ہوگئی۔ اُس نے اُسے قسم دلائی۔ "اس آدمی کے متعلق پھر کبھی بات نہ کرنا۔ وہ مرچکا ہے اور ہم اللہ کے فضل سے زندہ سلامت ہیں۔" لیکن بدرنگ کو کون روکتا۔ وہ اپنے مرد کو بچانے کے لئے پھر "تھانے" کی طرف بھاگی۔ پیر کے بندے اُسے پکڑ کے اس کے سامنے لے گئے۔ اُس نے اپنی ٹانگیں اکڑا لیں اور مزاحمت کرتی رہی۔ اس کا بدن دھول میں اَٹ گیا اور زمین پہ اس کی مزاحمت کے نشان ثبت ہوگئے۔ دلہن کا باغیانہ انداز اس خوف سے بالکل میل نہیں کھاتا تھا جو اس کی آنکھوں میں تیرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

جب انہوں نے اسے اٹھا کے زمین پہ دے مارا تو وہ چلائی "اس شیطان کو آج مجھے اللہ کے پاس بھیج دینے دو۔ آج شیطان کو اپنی مرضی کر لینے دو۔"

پیر نے اس سے جو کچھ بھی کہا وہ بے سود رہا۔ کوڑا اس کے پاؤں کے تلووں پہ لہراتا رہا۔ درد اور اذیت کی تیز لہریں اس کے ذہن اور بدن میں سرسراتی رہیں' لیکن وہ چپ تھی۔ کھجی کے کوڑوں کی مسلسل سرسراہٹ اپنے شکار کے عزم کو توڑنے پہ مصر تھی۔ باہر اس کا مجبور باپ عاشورے پہ زنجیروں سے ماتم کرنے والوں کی طرح اپنی بوڑھی چھاتی پیٹ رہا تھا۔

دائی نے نسوار کا بیڑہ منہ میں رکھنے کے لئے توقف کیا تو مجھے خیال آیا کہ وہ قدیم المیہ ہماری زندگیوں پہ کس طرح صادق آتا تھا۔

بدرنگ کا باپ اللہ اور رسولؐ کے واسطے دیتے ہوئے دہائیاں دے رہا تھا "سائیں اللہ اور رسولؐ کے نام' فاطمہؓ' علیؓ' حسنؓ اور حسینؓ کے واسطے سائیں میری بچی کو بخش دو۔ اپنے پیر ولی کے نام اپنے آباء کے نام' اپنی ماں کے واسطے' اپنی آئندہ نسلوں کے واسطے' اپنی جان اپنی عزت، روزِ قیامت اور خانقاہ کے عرس کا واسطہ سائیں اللہ کے نام پہ میری بچی کو معاف کر دو۔" لیکن ایسا نہ ہوا۔

بدرنگ کو چارپائی پہ ڈال کے اس کے باپ کے گھر لے جایا گیا۔ جب وہ مسلسل بے ہوش رہی تو حکیم کو بلایا گیا جو حویلی کی عورتوں ہی کی طرح پیر سے ڈرتا تھا۔

اس کی پیٹھ کا قیمہ کردیا گیا تھا۔ جڑی بوٹیوں کا اینٹی سیپٹک پاؤڈر اس پہ مسلسل چھڑکا جارہا تھا تاکہ خون رُک جائے۔ اسے یوں بھرنا ممکن نہ تھا لہٰذا حکیم نے زخموں میں کپڑا ٹھونس دیا۔

بوڑھے غم زدہ باپ نے اظہارِ شفقت اور سکون کے لئے اپنا جھریوں بھرا ہاتھ اس کے سر پہ رکھا تو اس نے اپنی اذیت زدہ آنکھیں کھول دیں۔ یہ وہ آنکھیں تھیں جو سب کچھ ہار کے بھی جیت گئی تھیں۔

عشق و محبت ' بارشوں اور ارغوانی جامنوں کے موسم ساون نے بنجر زمین اور اس کے باسیوں کے دلوں میں آگ لگا دی۔ جنسی وارداتیں اور اغواء، فرار کے واقعات روزمرہ کا معمول ہو گئے۔ یہی وہ وقت تھا جس کے دوران زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے۔ فضا میں نمی نے اس کے وجود میں جراثیم اور طفیلی کیڑے پیدا کر دیئے جو لمحوں میں دگنے ہوتے بدرنگ کا بدن کھا گئے۔ اس کے زخم بار بار کاٹے ' دھوئے ' بھرے اور صاف کئے گئے ' لیکن چھوت کا زہر پھیلتا گیا اور وہ مرگئی۔

اس رات بڑا شدید طوفان آیا۔ بدرنگ کی روح طوفانی ہواؤں کے ساتھ اُڑتی پہاڑی کے کنارے پہ پہنچی جہاں ہواؤں نے اسے ریزہ ریزہ کر دیا۔ اب وہ ایسی خاک ہو گئی تھی جو کبھی بیٹھ نہ سکی۔ نہ اس کی تمنائیں کبھی پوری ہو سکی تھیں، نہ اس کے پیار کی آگ کبھی سرد ہوئی۔ اس کی روح ہمیشہ مزار کے اِرد گرد گھومتی رہی۔ دائی نے کہانی ختم کرتے ہوئے ٹھنڈی آہ بھری لیکن ساتھ ہی اسے ایک نیا رُخ بھی دے دیا ' کسی کو اس منکر کی تعزیت میں دو حرف کہنے کی کبھی جرأت نہ ہوئی۔ جہاں پیر کی طاقت اور اقتدار کا مسئلہ تھا وہاں رحم اور شفقت کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ رحم ' تشکیک اور سوال پیدا کرتا تھا جو ایسے سرکشوں کو جنم دیتے جو بندھے بندھائے نظام سے بغاوت کرتے۔ بدرنگ کی موت کی خبر تیزی اور حقائق سے بعید تر ہو کے پھیلتی گئی۔ لوگوں نے کہا "لڑکی نے ہمارے پیغمبر کی توہین کی جرأت کی تھی۔ ہم نے اسے گستاخانہ زبان استعمال کرتے سنا تھا۔ وہ اُن پہ ہنستی اور تمسخر اُڑاتی تھی۔ ہم نے اپنے کانوں یہ سب کچھ سنا۔" کچھ دوسروں نے قسم اٹھائی "اس نے کتابِ مقدس کو آگ لگا دی۔ اس نے کفر تولا ' ہم نے خود دیکھا ' جب وہ کتابِ مقدس کو جلا رہی تھی ہم وہیں تھے۔" ایسے الزامات کا طومار جس نے بھی سُنا اس نے بے ساختہ اُسے موت کے گھاٹ اُتارنے پہ پیر کی تعریف و ستائش کی۔ بلوچ کو تو سب نے بُھلائے ہی رکھا۔

دائی کو اچانک خانقاہ سے اپنی راسخ اور پختہ وفا کا خیال آیا اور اُس نے تیزی سے اضافہ کرتے ہوئے کہا "پیر تو خُدا کا منتخب کردہ تھا۔ وہ جانتا تھا کا فروں سے کیسے نبٹا جاتا ہے۔"

میرے لئے یہ بڑے تعجب کی بات تھی۔ آخر ایک اتنے عظیم دین کو ایک محبت بھرے دل والی لڑکی کیسے تباہ کر سکتی تھی۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ لوگوں کو پیر کے ہاتھوں قرآن اور سُنت کی کھلی توہین کا خیال کیوں نہ آتا تھا۔ میں خانقاہ سے اپنے رشتے اور تعلق پہ کانپ اٹھی۔

طوطی سچی تھی۔

وہ اتنی ہی اچھی تھی جتنا یہ لوگ بُرے۔

اس سرما میں میں نے ملن گاہ میں اس کا انتظار کرتے ہوئے بڑی محبت اور نرمی سے کہا ' "طوطی واپس آ جاؤ کسی کو خبر نہ ہو گی۔ میں تمہیں تسلی اور سکون دینا چاہتی ہوں۔ میں تمہاری بہن ہوں طوطی ' لوٹ آؤ۔" لیکن وہ کبھی نہیں آئی ' کبھی نہیں۔

میری یہ سعی کہ میں بہت سے معاملات کی مکمل سوجھ بوجھ حاصل کر لوں میرے لئے وبالِ جان ہو گئی۔ میرے پاس کوئی وقت نہ رہا۔ جب میں اپنے خاوند تلے نہ ہوتی میں اپنے تلے ہوتی اور پھر ان دو بچوں کے اس بوجھ تلے جو سب سے بھاری تھا۔ ان سے دور گزرا ہر لمحہ میرے لئے گراں تھا لیکن یہاں ہر چیز انہیں توجہ دینے سے زیادہ اہم اور عزیز تھی۔ وہ اکثر نوکرانیوں یا اپنے کنزنز سے کھیلتے رہتے ' نوکرانیوں کے بچے اُن کے لئے کھلونوں کی جگہ استعمال کے لئے تھے۔

اماں سائیں کی زندگی مجھ سے مشابہ ہی گزری تھی۔ ایسا ہی جبر و تشدد ' وہی خوف ' کمالِ فن کے ویسے ہی تقاضے اور ویسی ہی قید و بند، لیکن وہ صرف اپنے خاوند کے لئے وقف رہی تھیں۔ اس کے بچے نوکرانیوں کی گودوں میں ہی پلے بڑھے۔ کہتے ہیں وہ اپنے بچوں سے اتنی غیر مانوس ہو گئی تھی کہ ایک روز اپنے بالغ بیٹے کو کسی نوکرانی سے بغلگیر ہوتے دیکھ کے انہوں نے شور مچا دیا کہ حرم میں کوئی غیر مرد گھس آیا تھا۔ یہ اُمید لئے کہ چھوٹے سائیں اور گُگی مجھے یاد رکھیں اپنی بھاری ذمہ داریوں سے جو بھی وقت ملتا میں انہیں بھینچ بھینچ کے پیار کرتی۔ میں انہیں بڑھتے ہوئے دیکھنے ' اُن کے پہلے الفاظ سننے ' ان کے اٹھتے ہوئے پہلے قدموں میں مدد دینے کے لئے ترسا کرتی لیکن یہ کبھی ممکن نہ ہو سکا۔

میں گُگی کو اس دنیا کے بارے میں بتانا چاہتی تھی جس سے میں یہاں آنے سے پہلے آشنا تھی۔ میں اُسے روحوں کی پرواز کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔ میں اسے سوچنا، سمجھنا اور تخلیق کاری کا ہنر سکھانا چاہتی تھی تاکہ کسی نہ کسی طریقے سے اس کے لئے زندگی کی مسرتوں

تک رسائی ممکن ہو سکے۔ میری روزمرہ سے میرے ذہن کو مکمل فرصت کم ہی ملتی تھی لیکن جب بھی ایسا ہوتا میں گمی سے باتیں کرتی۔ میں نے محسوس کیا کہ اتنی چھوٹی عمر میں اپنے لئے جو فیصلے وہ کرتی تھی وہ اس کے اپنی ذات پہ مرکوز ہونے کی گواہی دیتے تھے۔

بد قسمتی سے اس کے باپ کی طرف سے شفقت کا واحد اظہار اگر کوئی تھا تو محض اتنا کہ وہ جب بھی اس کے پاس ہوتا اس کے گال پہ یوں چٹکی بھرتا جیسے اس کے گوشت کا کوئی ٹکڑا نکالنا مقصود تھا۔ گمی نے کبھی اس سے کسی چیز کے لئے آنکھیں نہیں ملائیں۔ اس کے اپنے باپ کے سامنے آنے کا اتفاق اتنا کم ہوتا تھا کہ اگر وہ بچوں میں کھیل رہی ہوتی تو وہ کبھی بھی اسے پہچان نہ سکتا۔ مجھے اپنے بیٹے کو کچھ سکھانے کی کبھی جرأت نہ ہوئی۔

کبھی کبھی جب وہ سویا ہوتا میں اس کی نازک کلائی پہ سیاہ دھاگے کے زخم کا نشان دیکھتے ہوئے سوچتی کہ کیا واقعی وہ اسے شیطان کے اس غلبے سے بچا سکتا تھا جو اسے ورثے میں ملنے کو تھا۔

میری زندگی کا بہترین وقت میرے ایام کے سات روز ہوتے تھے۔ دن بھر میں اپنے سینے سے لگے اپنے بچوں سے تصور ہی تصور میں باتیں کرتی رہتی۔ میں سوچتی میں پوری رات ان سے باتوں میں گزاروں گی لیکن تھک ہار کے جب میں ان کے پاس پہنچتی تو وہ سو چکے ہوتے۔ جب میں حسبِ معمول صبح کے وقت بیدار ہوتی تو وہ ابھی سو رہے ہوتے۔ میں اسی عالم میں ناشتے کی رسم ادا کرنے نکل جاتی۔ جب کبھی دن کے وقت میرا اور ان کا آمنا سامنا ہوتا میں انہیں بدقت یہ یقین دلاتی کہ "گزشتہ رات میں تمہارے ساتھ سوئی تھی' وعدہ آج رات بھی ایسا ہی کروں گی۔"

اپنے وجود کا احساس دلانے کے لئے میرے پاس دوسرا راستہ یہی تھا کہ میں عالمِ خواب میں انہیں پیار کرتی رہوں کہ شاید یونہی میں ان کے ننھے ننھے سپنوں میں اتر سکوں۔

جب پیر سائیں اسلام آباد میں منعقدہ مشائخ کانفرنس کے لئے گیا تو مجھے غیر متوقع آزادی ملی جس کے دوران میں خوشی سے ناچ سکتی تھی لیکن اس کے بجائے میں اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔ ملک بھر کے مذہبی راہنما یہ فیصلہ کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے تھے کہ اسلام کے کون سے احکام ان کے مفادات کا تحفظ کر سکتے تھے۔

میں نے ان کی کلف لگی پگڑیوں اور پرپیچ عماموں کا تصور کیا جو ان کے سروں پہ لہرا رہے

ہوں گے۔ ان میں سے کچھ نسبتاً چھوٹے گھرانوں کے چھوٹے "دیوتا" تھے۔ پیر سائیں یقیناً ایسے بارسوخ اور طاقتور گروہ میں سے تھا جس کی سوچ بھاری وزن رکھتی تھی۔

فرش پہ لیٹے لیٹے میں نے اپنے ٹخنوں پہ بیٹھی گمی کو ٹانگیں اٹھاتے ہوئے فضا میں بلند کیا اور پھر جھولا دیتے ہوئے اسے نیچے لے آئی۔ وہ کھلکھلا کے ہنس رہی تھی اور میں شیطان کی شوریٰ کے بارے میں سوچ رہی تھی' اسلام کو بونوں کے پنجوں میں دے دیا گیا تھا۔

آڑھتیوں اور نیلام گروں نے مسلمانوں کو قبروں کے پجاری بنا دیا تھا۔ وہ ہمیں اس دور جاہلیت اور ان حالات میں واپس لے گئے تھے جن سے ہمیں رسول اللہؐ نے آزادی دلوائی تھی۔ یہ وہی حالات تھے جن کے خاتمے کے لئے دینِ اسلام کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

گمی کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے اسے چکر دیتے ہوئے مجھے خیال آ رہا تھا کہ قانون کے محافظ خود اس سے ماوریٰ ہو کے ہمیں کس طرح گرداب میں لے آئے تھے۔ بوڑھے اپنے آباؤ اجداد کی قبروں سے منسلک ان کے جانشین خون چوستی جونکوں کی طرح تھے۔ ان میں سے ہر ایک اس خون آشام تسبیح کے دانوں میں اضافہ ثابت ہوتا جو لہو کے اس کاروبار میں چل رہی تھی۔

میری روزمرہ کبھی تبدیل نہ ہوئی۔

تیس سال کی عمر میں پانچ بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ گمی اب گیارہ سال کی تھی اور چھوٹا سائیں دس سال کا۔ اس کے بعد میرے ہاں ایک بیٹا راجہ جی اور دو بیٹیاں دیا اور منی پیدا ہوئیں' اگرچہ دو بیٹوں کی ماں بن جانے سے میری پوزیشن مضبوط ہو گئی لیکن میرے مقام میں مجھے کبھی کوئی تبدیلی محسوس نہ ہوئی۔ گمی کی ماں ہونا بہر حال فخر کی بات تھی' وہ میری ہم روح تھی۔ میرے اندر کے لئے طاقت۔ میری ہی مانند متجسس اس کی روشن آنکھیں ہر وقت ٹمٹماتی رہتی تھیں۔

"ماں' صرف ایک بٹن دبانے سے بلب میں روشنی کیسے پیدا ہو جاتی ہے؟" وہ پوچھتی اور پھر اس کی متعجب نگاہوں میں جو سوچ اور اس سے بہت دور بلب کے درمیان پھر رہی ہوتیں سینکڑوں سوال ابھر آتے۔ اندر باہر آتے جاتے لڑکیاں پیر سائیں کے راستے میں آ جاتیں تو وہ باری باری ان کے گالوں پہ چٹکیاں بھرتے ہوئے گزر جاتا۔ وہ تکلیف سے جھرجھرا جاتیں۔

گمی کچھ مختلف تھی۔ ابھی ابھی اس نے اُس کے گال پہ چٹکی بھری تو وہ کچھ ظاہر کئے بنا

اذیت پی گئی۔

لیکن فطرتاً وہ ایسی تابعدار کہاں تھی۔ گمّی کو صرف ناظرہ قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ملی تھی۔ ایک روز اس نے مجھ سے پوچھا کہ "میں قرآن کا اُردو ترجمہ پڑھنے کے لئے ڈریسنگ روم میں گھس کے اسے مقفل کیوں کر لیا کرتی تھی۔" میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔

میرا ذکر کئے بغیر اس نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اماں سائیں سے پوچھا کہ "جس زبان کو وہ سمجھتی ہی نہیں اس میں قرآن پڑھنا ضروری کیوں تھا۔"

"یہ لازمی ہے 'الہامی الفاظ تو یہی ہیں 'انہی کو پڑھنے کا ثواب ہو گا" اس کی دادی نے جواب دیا تھا۔

گمّی اس سے بحث میں الجھ گئی "لیکن مجھے تو عربی کی سمجھ نہیں' میں اللہ سے عہد و پیمان کیسے کر سکتی ہوں' جب مجھے علم ہی نہیں کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ اللہ جانتا ہے کہ میں جو کچھ پڑھ رہی ہوں اُسے سمجھ نہیں پا رہی۔"

پہلے تو اماں سائیں نے بڑے صبر سے اُسے سمجھایا "اللہ ہماری نیتوں کا حال جانتا ہے۔ جب تم اچھی نیت سے اس کا کلام پڑھتی ہو تو وہ اسے قبول کرتا ہے۔" لیکن گمّی کی اس سے تسلی نہ ہو سکی اور اس نے بحث مباحثہ اسی طرح جاری رکھا جیسے میں بابا سے کیا کرتی تھی۔

کیا اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک صرف اس لئے اتارا تھا کہ ہم اسے پڑھ کے ثواب حاصل کریں؟

کیا اس کا مقصد ہماری تربیت نہ تھا؟

کیا یہ ہماری زندگیوں کو ایک سمت میں ڈالنے کے لئے نہ تھا؟

کیا یہ اس لئے نہ تھا کہ ہمیں بتایا جائے کہ ہمیں کیا ہونا چاہئے؟

اماں سائیں جو اس قسم کی بحث اور دلائل کی کبھی عادی نہ رہی تھیں سخت بیزاری اور غصے میں آ گئیں۔ گمّی کی سوچ کچھ بھی تھی اسے ہر صورت احکام کی تعمیل کرنا تھی لیکن میری بیٹی کسی ایسے حکم کو ماننے کے لئے تیار نہ تھی جو اس کی سمجھ سے بالاتر ہو۔ مجھے یقین ہے اللہ میاں چاہتے ہیں کہ ہم اسے اور اس کے احکام کو سنجیدگی سے لیں۔ جب تک میں انہیں سمجھتی نہیں اللہ کے نزدیک میرے قرآن پڑھنے کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے؟

اماں سائیں نے گمّی کو تنبیہہ کی "کتنے شرم کی بات ہے تم سُن ہی نہیں رہی ہو۔ مجھے

تمہارے باپ کو یہ سب کچھ بتانا پڑے گا۔" دھمکی اپنا کام کر گئی' گمّی نے اُلٹی قلابازی لگائی۔

اس نے قرآن عربی رسم الخط میں ہی پڑھنے کا وعدہ کیا۔ اُس نے قسم اٹھا کے کہا کہ وہ دل کی گہرائیوں سے اماں سائیں سے متفق تھی۔ اس نے دادی سے التجا کی کہ وہ اس دفعہ اس کے والد کو نہ بتائے ساتھ ہی اس نے یہ حلف بھی اُٹھایا کہ آئندہ وہ کبھی کسی حکم کے بارے میں پوچھ گچھ نہ کرے گی۔

میری تمنا تھی کہ میں گمّی کو راز کا یہ نکتہ بتا دوں کہ اگر قرآن پاک کو سمجھ لیا جائے تو بگڑے معاشرے میں انقلاب برپا ہو جائے۔ اس کا پیغام خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ یہ ان لوگوں کو بے نقاب کرتا تھا جو اس کی آڑ میں استحصال کو روا رکھتے تھے۔ ترجمے سے تو انقلاب آ جاتا لیکن گمّی کا اس عمر میں ان چیزوں میں الجھنا مناسب نہ تھا' سو میں چپ رہی۔

گمّی اس نازک اور پیچیدہ نسوانی ماحول کا حصہ ہو گئی جس میں اس نے آنکھ کھولی تھی۔ یہ بڑی فطری سی بات تھی۔ میرے برعکس وہ کچھ بھی نہ جانتی تھی۔ حویلی کی مکار اور فریبی عورتوں کے درمیان جگہ بنانے کے لئے میں نے ہر ممکن جدوجہد کی تھی۔ بہت سے واقعات اور حالات کے بعد بہت سا وقت گزر جانے کے بعد میں ان پہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوئی تھی کہ گمّی کی طرح میں بھی کوئی ان کی دشمن نہ تھی بلکہ یہ کہ ان کی ذلت و خواری بھی مجھ پہ اسی طرح گراں تھی جیسے اپنی بے عزتی۔ میں انہیں گودام سے کچھ نہ کچھ فالتو بھی دے دیا کرتی اور ان کی غیر حاضری میں ان کے کام دوسروں سے کروا کے ان کی پردہ پوشی بھی کر دیتی۔ یہ اتنی غیر معمولی باتیں تھیں کہ وہ سب میری ہوتی گئیں۔

چیل بہر حال اب بھی میری نگرانی کر رہی تھی، اگرچہ وہ ہر وقت چادر کا نقاب اوڑھے رہتی تھی اور میں کبھی بھی اس کا چہرہ نہ دیکھ سکی لیکن اس کی آنکھوں کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہوتا تھا شاید وہ بھی میرے لئے افسردہ تھی۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھے اس انسان کے مقابلے میں زیادہ پسند کرتی تھی۔ جس کی خاطر اس نے اپنے خاندان کی قسم توڑ دی تھی۔

اس کے باوجود ہم میں سے کسی نے بھی کبھی کسی دوسرے کو بچانے کے لئے پیر سائیں کے سامنے جھوٹ نہ بولا اس کا خوف ہر چیز پہ حاوی رہا۔ میں تو محض ایک کمزور منڈلی کی کمزور راہنما ہی بن سکی۔

میری طرح اُن عورتوں کے لئے بھی آزادی کے کوئی معنی نہ تھے، اگرچہ وہ اپنے گھربار

والی تھیں لیکن ان کی غربت انہیں مزار سے یوں جکڑے ہوئے تھی کہ اگر ان میں سے کوئی فرار کا سوچتی بھی تو اس کے عزیز و اقربا مالک کی مضبوط گرفت میں ہی پھنسے رہتے۔ یوں اس جگہ سے نجات حاصل کرنے کا مطلب بہت سی زندگیوں کو خطرے میں ڈالنے کے سوا کچھ نہ تھا اگر کبھی کوئی بھاگ جاتی تو پوری پوری برادریاں اس کی واپسی تک یرغمال رہتیں فرار اور آزادی کے بارے میں سوچنا گناہ تھا۔ قیمت بڑی بھاری تھی۔ حالات سے راضی رہنے میں ہی بھلا تھا۔ غربت اور جہالت کا جال اتنا سخت تھا انہیں آج تک کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ خانقاہ کی اصل طاقت وہ لوگ خود ہی تھے، نہ ہی یہ کہ انہیں محض دھوکے اور فریب سے یرغمال بنایا گیا تھا۔

پھر اچانک سخی بی بی کی کہانی نے ان کی سوچوں کے خلا میں سمانا شروع کر دیا ہر کوئی مل مالک کی زندگی میں ہونے والے واقعات کو جاننے میں لگ گیا۔

سخی بی بی کے اکلوتے بیٹے کو کسی ایسی بیماری نے آلیا جس کی تشخیص کوئی ڈاکٹر یا حکیم نہ کر سکا۔ مریض لاغر اور بے جان ہوتا چلا گیا' لوگوں نے سخی بابا کو ڈرایا' یہ مزار کی بددعا کے سوا کچھ نہیں' پیر سائیں کو حاضری دو لیکن یہ وہ کہتے ہوئے اپنے عقیدے پہ ڈٹا رہا کہ "میرا ایمان تو صرف اللہ پہ ہے۔"

بچہ قریب المرگ ہو گیا۔ اس کی ماں بے قرار تھی اُسے اپنے کندھے پہ ڈالتے ہوئے وہ ننگے سر ننگے پاؤں مزار کو دوڑ پڑی۔

بے حال بے دم وہ پیر سائیں کی مجلس میں پہنچ کے گڑگڑائی "سائیں میرے بچے کو بچالو، اگر یہ بچ گیا تو پوری دنیا کا اعتقاد بڑھ جائے گا۔ میں قسم اٹھاتی ہوں کہ تمہاری پکی مریدنی ہو جاؤں گی۔ سائیں میں تمہارا چرچا دنیا کے کونے کونے میں پھیلا دوں گی۔ سائیں' میرا بیٹا اور اس کے بیٹے تمہاری اس کرم نوازی کو کبھی نہیں بھلائیں گے۔"

پیر سائیں نے بچے کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ آنکھیں بند کئے وہ خاصے طویل وقت کے لئے زیرلب کچھ بڑبڑاتا رہا۔ سخی بی بی جواب کے لئے اس کے چہرے پہ نظریں گاڑے ہوئے تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ اچھل پڑی۔

"تم نے بہت دیر کر دی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جیسے بچے کی موت کا اعلان کر دیا "یہ اللہ کی رضا ہے۔" سخی بی بی نے گڑگڑاتے ہوئے اللہ سے التجا کرنے کے لئے عرض کی۔

"سائیں کوئی تو دعا ہو گی جو تم جانتے ہو۔ دل سے کہہ دو تو اللہ تمہاری ضرور سنے گا' کرم کرو سائیں میں تم سے بھیک چاہتی ہوں' میرے بچے کے لئے کچھ کرلو سائیں۔ ہمیں معاف کر دو ہم اب تک تمہارے روحانی تصرف کے منکر رہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں اس جاہلیت اور بدتمیزی کا ہم کفارہ ادا کر دیں گے۔"

پیر سائیں نے بچے کے جلتے بھنتے سر کو ایک بار پھر اپنی گرفت میں لے لیا اور دوبارہ کوشش کی۔ پھر جب اس نے مایوسی میں سر ہلاتے ہوئے کہا کہ "اسے گھر لے جاؤ۔ یہ اس کی رخصتی کا وقت ہے۔" تو ٹوٹے ہوئے دل والی ماں انتظار میں کھڑے لوگوں کے ہجوم میں سے چیختی چلاتی واپس ہوئی "یا اللہ مجھے یہاں آنے کے لئے معاف کر دے۔ مالک میرے بچے کو بچالے۔ اسے بچالے تاکہ ان لوگوں کو پتہ چل جائے کہ تیری رضا تیری رضا ہوتی ہے۔ کوئی انسان اسے طے نہیں کر سکتا۔"

لوگوں نے خدا کے غضب سے بچنے کے لئے توبہ توبہ کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "کیا مزار کا غضب ابھی تک اس کے گھر پہ نازل نہیں ہوا؟" کسی نے کہا۔ "کیا اس نے اب بھی سبق نہیں سیکھا؟" کسی دوسرے نے گرہ لگائی۔

"یہ عورت تو پاگل ہے۔" کسی نے فتویٰ دیا۔

مراثنوں نے دائی کو بتایا کہ سخی بابا نے مزار پہ جانے کے لئے سخی بی بی کی بڑی کھچائی کی تھی۔ "قبریں زندگی نہیں دے سکتیں' وہ لوگ جو غریبوں کا لہو چوستے ہوں اور کمزوروں کو دباتے ہوں خدا تک نہیں پہنچ سکتے۔"

بچے پہ بے ہوشی طاری ہو گئی تو سخی بی بی سجدے میں گر گئی۔ چوتھے روز اُس نے خاک سے اپنی پیشانی اس وقت اُٹھائی جب بچے کے بدن میں حرکت ہوئی۔ پانچویں روز اُس نے آنکھیں کھول لیں۔ اس روز ہی باہر شامیانے لگا دیئے گئے۔

شامیانوں تلے لنگر کھل گیا جہاں غریب غرباء کو مفت کھانا دیا گیا۔ لوگوں نے اپنی چادروں میں چاول ڈلوائے اور گٹھڑیاں سینوں سے لگائے اپنے بچوں کے لئے لے گئے۔ پھٹی ہوئی آنکھوں اور کھلے منہ سے انہوں نے سخی بابا کا وعظ سنا۔

سکوت کا وہ عالم تھا کہ سوکھے پتوں کی سرسراہٹ کوڑیوں والے سانپ کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ وہ تحریر جو اس معاملے میں چند ایک پڑھے لکھے افراد تک پہنچی دریائی مچھلی پہ

لپٹے کاغذ کی صورت میں میرے ہاں بھی پہنچ گئی۔

اس پہ لکھا تھا۔

"ہمارے بیٹے کو زندگی عطا کر کے اللہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مزار والے پاکھنڈی' جھوٹ اور فریب کی قوت پہ داد عیش دے رہے ہیں۔ اولیاء اللہ کو تمہیں دعا دینے کے لئے کسی دولت کی ضرورت نہیں، نہ انہیں تحائف چاہئیں اور نہ ہی انہیں لوگوں کو اپنا غلام بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ قبروں کے مجاور اللہ کے نام پہ تجارت کر رہے ہیں۔ تم لوگوں نے شرک کو دل پذیر بنا ڈالا ہے۔

تم ہی ان کی قوت کا سرچشمہ ہو' تم شیطان کی قوت کا باعث بن گئے ہو' تم اسلام کو مسخ کر رہے ہو' ننگے پاؤں اپنے معمولی وسائل اٹھائے قبروں کی پوجا کے لئے جانے کے بجائے اللہ کی عبادت کرو' اللہ ہر اس جگہ موجود ہے جہاں تم ہو' پیر صرف اس خدا کی عبادت کرتا ہے جو اس کی تائید کرتا ہے' ہمارا رب ظلم و ستم کی تائید نہیں کرتا۔"

میں نے کاغذ کا وہ ٹکڑا چولہے میں جھونک دیا۔ ہر کوئی سرگوشیوں میں مصروف تھا۔ ہر گھرانہ سخی بابا کی دعوت میں گیا تھا۔ مستثنیٰ کوئی بھی نہ تھا۔ خدا کا شکر ہے پیر سائیں پوری آبادی کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے قابل نہ تھا لیکن وہ غصے میں جل بھن رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی اب وہ کیا کرے گا۔ اس نے کچھ نہیں کیا۔

"اللہ انہیں معاف کر دے۔ وہ ان پہ اپنا فضل کرے کیونکہ یہ اس کی رضا ہے۔ وہ جو چاہے سو کرے' میری دعا ہر وقت تو قبول نہیں ہوتی۔" کسی نے ڈرتے ڈرتے یہ موضوع چھیڑا تو اس نے نہایت حلیمی سے جواب دیا۔

اس کے رویئے نے سخی بابا کے وعظ و نصیحت کا زور توڑ ڈالا۔

مزار کے خلاف بغاوت
اس جنگلی بیج کی طرح ثابت ہوئی جو جلی ہوئی
دھرتی پہ گرا
پھوٹا
جڑیں پکڑیں
پھیلا

بڑھنے کی کوشش میں اُبھرا
اور مر گیا۔

ہر وہ چیز جو اس گھرانے کے بارے میں طوطی کی سوچ سے مطابقت رکھتی تھی میرے لئے دلچسپی کا باعث تھی۔ میری تمنا تھی کہ میں سخی بی بی کو دیکھوں ملوں لیکن میں یہ بھی جانتی تھی کہ وہ دوبارہ کبھی اس حویلی میں پاؤں نہیں رکھے گی۔

باب ۷

شکار گاہ

گمی بارہ سال کی ہو گئی۔

وہ بالکل میرے لڑکپن کی تصویر تھی۔ اس کے رخساروں پہ اگرچہ ابھی تک بچپنے کا بھولا پن تھا، لیکن مجھے اس کی تہہ میں اپنی نانی اور اپنی ماں، اپنی نسل در نسل جھلک کا ''معجزہ'' دکھائی دیتا تھا۔ گمی بڑے پُراسرار انداز میں میرے کچھ کہے بنا میرے دل کا حال بوجھ لیا کرتی تھی۔

میں اُسے کئی بار کریدتی۔

''تمہیں یہاں گھٹن محسوس نہیں ہوتی؟ زندگی جیسی عظیم شے کو یہاں جیسے سوئی کی ڈبیا میں بند کر کے رکھ دیا گیا ہے؟ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ یہ پھٹ جائے اور تم یہاں سے نکل جاؤ؟''

گمی اس خاموش اور پُرسکون دریا کی طرح جواب دیتی جس کی گذرگاہ بڑی قدیم اور مستقلاً طے شدہ ہو ''میں اپنی زندگی کے خلاف جنگ نہیں لڑنا چاہتی'' ''لیکن کیا تم خوش ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے لمبے وقفے کے ساتھ بڑا موزوں جواب دیا۔ ''یہاں ہے کیا جس پہ خوش رہا جائے؟'' پھر جیسے مکرر سوچتے ہوئے اُس نے مجھے گلے لگا لیا۔ پیار کرتے ہوئے اُس نے مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کی ''میں خوش ہوں کہ تم میری ماں ہو۔ یہ میرے لئے بڑی خوشی کا مقام ہے۔'' وہ اپنے باپ سے دور دور رہتی تھی۔

گرما کے اختتام پہ پتے نارنجی ہونے شروع ہوئے۔ موسموں کے اتصال سے بڑا سماں پیدا ہوا۔ سال کے اس حصے میں ہم صحن کے درمیان چارپائیوں پہ سوتے تھے۔ پیڈسٹل پنکھے ہمارے ارد گرد ٹھنڈی ہوائیں پھینک رہے ہوتے۔ گمی، چھوٹا سائیں اور تینوں بچے میرے پاس ہوتے۔ ہمارے آگے چیل کی چارپائی ہوتی۔ ہمارے دائیں کچھ دور اماں سائیں اور ان کی پشت پہ دوسری رشتے دار عورتیں سو رہی ہوتیں۔ برآمدے کے قریب پیر سائیں کی اکلوتی چارپائی ہوتی۔ اس کے ساتھ رکھے ٹیبل پہ پانی بھرا جگ اور گلاس ہوتا۔ جگ پہ

کروشیے کا جال اور گلاس پہ پرچ رکھی ہوتی۔

اوپر آسمان پہ چھوٹے چھوٹے ستارے کبھی ٹمٹماتے کبھی اچھل کود کرتے دکھائی دیتے۔ یہ مربع قطعہ ہمارے لئے پورے آسمان کا نمائندہ تھا۔ چودھویں کے چاند کی ٹھنڈی چاندنی ہمارے اوپر کی سفید چادروں سے پھیلتی ہوئی بے رنگ صحن، کھڑکیوں، دروازوں اور سرکش درخت کے پتے پتے کو روشن کر دیتی، ہر چیز جگمگا اٹھتی۔

کبھی کبھی تو روشنی کا گولہ اتنا قریب آ جاتا کہ میں ہاتھ بلند کر کے اسے چھو سکتی تھی۔

میں نے گمی کی طرف سرگوشی کی ''اسے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لو۔'' اس نے اپنی ہتھیلیاں چاند کی طرف پھیلا دیں ''اماں کاش ہم چھلانگ مار کے اس کے پاس پہنچ سکتیں اور پھر وہ جہاں جاتا اس کے ساتھ جاتیں۔'' اس کا چہرہ فرطِ مسرت اور چاندنی کے نور سے چمک رہا تھا۔ چاند اپنی کہانیوں کو ساتھ لئے ڈوب گیا، پیر سائیں ہماری طرف آ رہا تھا۔

میں نے یہ ظاہر کیا کہ میں سو رہی تھی۔ اپنے اور اس کے درمیان فاصلے کے تعین کے لئے میں نے اُس کے بدن سے اُٹھتی عطر کی خوشبو کو سونگھنے کی کوشش کی۔ وہ گمی کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ میرا دم جیسے گھٹ گیا۔ وہ کیا چاہتا تھا؟ وہ بول کیوں نہیں رہا تھا؟ کیا اُسے اس کے چاند کی طرف سفر کا علم ہو گیا تھا؟ اس سے کیا قصور سرزد ہوا تھا؟

میں نے محسوس کیا وہ واپس جا رہا تھا اور گمی بستر سے اٹھ رہی تھی۔ میری آنکھیں ان دونوں کے تعاقب میں دوڑیں، لیکن میں ماں کی طرح بے بس تھی۔ وہ دونوں خواب گاہ کے دروازے کے پیچھے گم ہو گئے۔

گمی چیخی۔

یہاں عورتیں گھوڑے بیچ کے سویا کرتی تھیں۔ کئی طوفان آئے اور گذر گئے۔ گمی پھر چلائی۔ میں نے اپنے دل کو تھام لیا جیسے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہونے کو تھا۔

''دفعان ہو جاؤ نکل جاؤ۔'' بالآخر اُس کے باپ کے دھاڑنے کی آواز آئی اور وہ لڑکھڑاتی ہوئے برآمدے میں نکلی۔ دیوار پہ اس کا سایہ نظر آیا تو میں چارپائی پہ سیدھی ہو گئی۔

گمی کی چارپائی کی رسیاں کڑکڑائیں۔ اس کے تڑمڑ بدن کو محسوس کرتے ہوئے میں نے پیر سائیں کی موجودگی کو سونگھنے کی کوشش کی۔ سر ہلائے بغیر میں نے آنکھیں اس کے بستر پہ مرکوز کر دیں۔ اُسے وہاں پاتے ہوئے میں نے سکھ کا سانس لیا اور گمی کی طرف مڑی۔

وہ ظاہر کر رہی تھی جیسے سوئی ہوئی ہو۔

صبح تڑکے شبنم میں بھیگے ہوئے مکھیوں کی یلغار میں ہم لوگ اٹھے اور منتشر ہو گئے۔ جب ارد گرد کوئی خطرہ نہ رہا تو میں نے گھی سے پوچھا "تمہارا باپ تم سے ناراض کیوں ہو رہا تھا؟ تم نے کیا کیا تھا؟"

وہ میرے سوالوں سے خوفزدہ نظر آ رہی تھی اور نظریں چرا رہی تھی۔ "وہ کیوں ناراض تھا؟" میں نے اصرار کیا "کیا اس نے تمہارے گالوں پہ زور کی چٹکی بھری تھی؟"

اُس نے ہاں میں سر ہلایا۔

"گھی، پھر اس کی ناراضگی کی وجہ کیا تھی؟"

"کیونکہ میں چلا اُٹھی تھی۔" اس نے ٹال مٹول کی "گھی تم کیوں چلائیں؟" وہ جواب نہیں دے رہی تھی۔

"کیوں گھی کیوں، مجھے فوراً بتاؤ کیوں؟"

میری بیٹی نے جواب دیا اُس نے اپنا ہاتھ میری شلوار میں ڈالا۔ اس نے قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کے مجھے بہت دبایا بھی۔

کہاں؟ میں نے احمقانہ سوال کیا۔

گھی نے اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھا۔

گھی ابھی مکمل عورت تو نہ بنی تھی لیکن اس کے خدوخال بدل رہے تھے۔ خوف، صدمہ، غصہ اور الجھن بہت سے گڈ مڈ جذبات میرے ذہن سے نکل کر میرے بدن میں داخل ہوئے اور نیچے پاؤں تک چلے گئے، پھر انہوں نے واپسی کی یلغار کی۔ میسنی کی زندگی کے راز جو اس کے باپ کی حویلی میں دفن تھے، بھوتوں کی طرح ہمارے گھر پہ منڈلاتے رہا کرتے تھے۔ اب سب حقیقت میں تبدیل ہو گئے تھے۔

کیا یہ اس کی ہمزاد کی پیدائش تھی؟ مجھے میسنی کی ماں کے چہرے پہ راضی بہ رضا رہنے کے تاثر کی یاد آئی اور میرے اعصاب کی ہر نس کھنچتی چلی گئی۔ اس کے لئے آخری چارہ کار یہی ہوا تھا کہ وہ اُن معاملات سے آنکھیں پھیر لے۔ میرے لئے واحد راستہ کیا تھا؟ .....

کیا؟ وہ قاتل طوفان جس نے مجھے میری شادی کے روز سے گھیرا ہوا تھا، مجھے دھکیلتا ہوا اپنے مرکز میں لے آیا تھا۔ اب وہ مجھے چبا جانے کو تھا۔

میں نے ہمت کر کے اپنے آپ کو اٹھایا۔ اب گھی کا بوجھ بھی میرے کندھوں پہ تھا۔ اب ہر لمحہ خطرات سے پُر ہوگا، ہر رات خطرناک ہوگی۔ لیکن گھی تو اس سے بہت دور دور رہی تھی؟

اس نے بنظرِ غائر اس کا جائزہ کب لیا تھا؟

مجھے یاد آیا اس نے مجھے پوچھا تھا "تمہاری بیٹی اب کے سال کی ہے؟" اب مجھے سمجھ آئی یہ پوچھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں اس روز کیا تھا۔ سوال کے پیچھے شیطینیت تھی، جواب کے بعد بھی شیطینیت ہی رہی۔

میں نے گھی کو سمجھایا "جتنا ممکن ہو اپنے باپ سے دور رہو۔ جب تک وہ تمہیں خود نہ بلائے اسے نظر بھی نہ آؤ۔"

غیر ارادۃً میری نگاہیں بچوں کے ایک گروہ پہ پڑیں جو آپس میں کھیل رہے تھے۔ اور ایک دبلی پتلی پیار کے بھوکے بدن والی یتیم لڑکی پہ جم گئیں۔ اس کے خدوخال گھی کی طرح تبدیلی کا شکار ہو رہے تھے۔

میں نے تیمڑی کو صاف کپڑوں کا جوڑا دیا اور اسے غسل کرنے کو کہا۔ ایک نوکرانی کو میں نے اس کے بالوں کو گوندھنے کو کہا۔ اس رات وہ غسل خانے میں تھا اور میں کمرے میں اس کی منتظر تھی۔ "یہ لڑکی یہاں کیا کر رہی ہے؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

سائیں وہ تمہارے لئے ہے میں منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اس کا غصہ دھچکے میں بدل گیا۔

میں اپنے چھوٹے موٹے کام کاج سے فارغ ہوئی تو اس نے کہا "تم جا سکتی ہو۔"

میں نے اس لڑکی کے متعلق سوچا۔ جیسے اس نے میرے دل کی بوجھ لی تھی۔ وہ بولا "اسے یہیں چھوڑ جاؤ۔"

اس کی قبولیت پہ مطمئن میں دروازہ بند کر کے چلی آئی۔ میری نگاہوں میں تیمڑی کی مردہ ماں کا نقش ابھرا۔ میں نے اپنے احساسِ جرم کو لگام میں ڈال دیں۔ طوفان کی آنکھ میں رحم کیسے ہو سکتا ہے۔ کسی بچے سے زنا بالجبر کسی محرم کی آبروریزی سے تو بہتر تھا۔

کیا یہ اس سے گھناؤنا تھا؟

کھلے آسمان تلے گھی کے قریب لیٹے ہوئے میں اپنی سہاگ رات کی یادوں کو اپنے ذہن سے دور کرنے کی کوشش میں تھی۔ میں نے اس کے کمرے کی سمت کان لگاتے ہوئے کچھ

اور سننے کی کوشش کی لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ میں اب بھی اسی رات کی یادوں میں غلطاں تھی۔

مجھے کوئی آواز نہ آئی۔ کیا اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا؟

ممکن ہے گھی اسے غلط سمجھی ہو۔ یااللہ میں نے یہ کیا کیا؟ وہ چھوٹی سی لڑکی تو اس کے خوف سے ہی مرگئی ہوگی۔

قیامت کے ایک گھنٹے کے بعد پیر سائیں کا دروازہ کھلا اور اس نے چلاتے ہوئے مجھے بلایا۔ میں کمرے کی طرف بھاگی۔

ہرن کا ایک زخمی بچہ اپنی خوفزدہ آنکھیں کھولے فرش پہ پڑا تھا۔ اس کے منہ میں پیر سائیں کا رومال ٹھنسا ہوا تھا۔ اس کے بدن کا کچھ حصہ چادر سے ڈھکا اور کچھ کھلا تھا۔

میں غنودگی کے عالم سے نکل آئی۔

اس کی آنکھیں میرے اندر سوراخ کئے دے رہی تھیں۔ انہیں میرے چہرے پہ لڑکی کے لئے ہمدردی اور اپنے لئے نفرت کے کسی نشان کی تلاش تھی۔

لیکن اُسے وہاں کچھ نظر نہ آیا۔

اس کے پہلو میں چوکڑی مارتے ہوئے میں نے اُس کے منہ میں ٹھنسا رومال نکالا۔ اس کے حلق میں مجتمع وحشت ہلکی سی سانس کے ہمراہ باہر نکلتی محسوس ہوئی۔

او خدایا! مجھے خیال آیا اگر یہ نہ ہوتی تو کیا گھی اس کی جگہ ہوتی۔ میں اسے ایک خالی کمرے میں لے آئی۔

تیمڑی نے چادر کو سختی سے اپنے ارد گرد لپیٹ رکھا تھا۔ میں نے بمشکل اُس کو اس سے علیحدہ کیا، بہیمیت اس کے معصوم بدن پہ ہر طرف کندہ تھی۔ اس کی ٹانگیں بوڑھیوں کی طرح تھر تھرا رہی تھیں۔ میں نے اُسے فرش پر ایک تکیہ رکھ کے دیا کہ وہ کچھ آرام کر لے۔

اس نے مجھ سے آنکھیں ملائے بنا سر پہ کمبل کھینچ لیا۔ اس کی ماں کے تصور سے جان چھڑانے کی کوشش میں اور گھی کے متعلق سوچتے ہوئے میں باہر نکل آئی۔

یہاں کوئی چوائس نہ تھی۔

میں اس کی جگہ گھی کو نہیں دے سکتی تھی۔

چارپائی پہ ہانپتے، اپنے خاوند کے موٹے بدن کو ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے میں تیز قدموں اپنے بستر میں گھس گئی۔

آسمانوں پہ جواب تلاش کرتے ہوئے میں نے قوت اور اختیار والے رب سے پوچھا، یااللہ! یہ بندہ کون ہے؟ کیا اُسے یہ جرائم اس لئے معاف ہیں کہ اس کے آباء میں کوئی بھلا انسان تھا؟ میں نے اپنے بھیڑوں بھرے دماغ میں جواب کی تلاش کی۔ میں لڑکی کو کہاں بھیج دوں؟ میں کس پہ بھروسہ کر سکتی ہوں؟ مجھے خیال آیا کیا مینی کی ماں نے بھی ہتھیار ڈالنے سے پیشتر اپنی بیٹی کو بچانے کی کوشش کی ہوگی؟ کیا گھی کا باپ پھر اس کی طرف بڑھے گا؟ اب تو میں نے آدم خور کی بھوک کا چارہ کر ڈالا تھا، لیکن وہ پھر بھی تو بھوکا ہو سکتا تھا، اگلی دفعہ میں اس کے سامنے کس کو پھینکوں گی؟

مجھے خیال آیا کہ میں تیمڑی کو تخی بی بی کے پاس بھیج دوں۔ میں مراثن کو کچھ پیسے دے کے اور اس سے حلف لے کر لڑکی کو پیر سائیں سے بچا سکتی تھی۔

لیکن نہیں، میں اسے جانے نہیں دے سکتی تھی۔

اس طرح تو وہ گھی کی طرف پلٹ آتا۔ گھی تو کہیں جا بھی نہیں سکتی تھی۔ قربانی کی ضرورت میرے ذہن پہ ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔ چڑھاوا کس کا ہوتا؟

وہ اپنی بہیمانہ خواہشات کا اکھاڑا جاگیردار کی حویلی سے اٹھا کے اپنے ہاں کیوں لے آیا تھا؟ جب بہت سی لڑکیاں ہر روز دن دیہاڑے غائب ہو رہی تھیں تو اس نے گھی کا انتخاب کیوں کیا تھا؟ اُس نے معاملے میں مجھے کیوں ملوث کیا؟

اپنی بیٹی کو بچانے کے لیے مجھے اور کتنی معصوم بچیوں کا چڑھاوا چڑھانا تھا؟ دن بھر اس مسئلے پہ سوچتے ہوئے میں نے اپنے ذہن کو سولی پر چڑھائے رکھا۔ میں نے مسئلے کے ہر پہلو پہ مسلسل غور کیا اور بالآخر یہی فیصلہ کیا کہ تیمڑی کو ہی اس کام پہ رکھا جائے۔ یہاں کسی کو اس کی فکر نہ ہوتی۔ اس کا انتخاب محفوظ ترین تھا۔ پہلی بار میں ہی وہ بدترین صورتِ حال سے گزر گئی تھی۔ میں اسے اچھی طرح کھلا پلا کے توانا رکھوں گی اور باقی وہ خود سنبھال لے گی۔

میرا دل اس کی طرف سے نرم ہو گیا، لیکن جب گھی کا تصور آتا تو وہ اس کے لئے پگھل جاتا اور تیمڑی کے لئے سخت ہو جاتا۔

جائے نماز پہ میں اللہ کے سامنے گڑگڑائی تھی۔ ماؤں کا دل ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے کیوں ہوتا ہے؟ یہ دوسروں کے لئے گنجائش کیوں نہیں چھوڑتا؟ کیا مجھے مینی کی ماں کی طرح اپنی آنکھیں بند کر لینا چاہئیں؟ یا مجھے حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے؟

اس شام تیمرڑی کی آنکھیں اتنی وحشت زدہ تھیں کہ وہ کوئی جنگلی جانور لگ رہی
تھی۔ میں ڈر رہی تھی کہ وہ کہیں میرا بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ گناہ تو میرا ہی تھا۔ خوش قسمتی سے
نوکرانیوں نے یہی سمجھا کہ کوئی بدروح یا جن بھوت اس پہ آوارد ہوا تھا بلکہ اُس گھر میں جہاں
شفقت اور رحم کی کوئی جگہ نہ تھی اس کے لئے میری ہمدردی سب کے لئے حیران کن تھی۔
گاڈ مدر یا کفیل ماں کے روپ میں درحقیقت اس کے لئے ایک چڑیل تھی۔ میں نے
اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کی لیکن اس نے بل دیتے ہوئے اسے میری
گرفت سے آزاد کرا لیا۔ وہ میرے متعلق کیا سوچتی ہوگی اس کا تصور بھی میرے لئے محال تھا۔
میں شیطان کی منکوحہ تھی اگرچہ میرا دل ابھی پتھر نہ ہوا تھا۔

اسے ہو جانا چاہئیے تھا۔

میرے دونوں رخ ایک دوسرے سے گہرے تضاد میں تھے۔ پیر سائیں نے مشورہ
دیا ”اسے دودھ میں کچا انڈہ پھینٹ کے پلاؤ، اس سے اس کی طاقت بحال ہو جائے گی“ میں نے
اس امید میں کہ وہ دوبارہ اس پہ حملہ آور نہ ہوگا سرگوشی کی ”سائیں وہ قریب المرگ ہے۔“
اس کے جواب نے بہت سی خالی جگہیں بھرتے ہوئے بہت سے معمے حل کر ڈالے تھے۔

”میں اس سے پہلے ایسی بہت سی بھگتا چکا ہوں“ اس نے کہا اور بہت سی لڑکیاں جو
سرے سے غائب ہو گئی تھیں میرے ذہن میں آ گئیں۔ ”وہ اس بخار کی عادی ہو جائے گی۔“ اس
نے مزید کہا اور مجھے خیال آیا کالی مر گئی لیکن اس کی عادی نہ ہوئی۔

اس کی شیطانی کارروائیاں حویلی کے اندر پہنچ گئی تھیں۔ سیدھی اس کے اپنے
حجرے کے اندر، میری آنکھوں کے عین نیچے، سامنے۔

میں نے اپنے اُن ہاتھوں کو دیکھا جو پچھلے پندرہ سال سے میری گود میں پسینے سے تر
رہے تھے۔ قسمت کی اس لکیر میں جو کبھی حنا کے جال میں چھپ گئی تھی شیطان کا وجود کندہ ہو
گیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ انہیں ہاتھوں نے اس بچی کو بار بار مالک کے حوالے کرنا تھا۔

”یا اللہ!“ میں فکر مند تھی کیا وہ اس کی ہوس کو اس وقت تک برداشت کر سکے گی
جب تک میری تینوں بیٹیاں بیاہی نہیں جاتیں؟ کیا میں شیطان کا بوجھ اٹھائے رکھوں گی؟
گچی نہ صرف خود اپنے باپ سے دور دور رہی بلکہ میرے کہے بنا اس نے دیا اور منی
کو بھی جتنا ممکن ہو سکا اس سے دور رکھا۔ اس اثناء میں تیمرڑی رو بصحت ہو کے پھر بچوں میں

کھیلنے لگی۔

اگلے مہینے جب میرے مخصوص دن شروع ہوئے تو اُس نے تیمرڑی کو پیش کرنے
کا حکم دیا۔ دو روز بعد اُس نے اُسے پھر بلا لیا۔ میری غیر حاضری کے سات دنوں میں سے چار
روز وہ اس کے پاس رہی۔ میرے کان کھڑے ہوئے، لیکن میں اس سے کچھ پوچھ نہ سکی، نہ ہی
مجھے اس کی سمجھ آئی کہ اس کا خوف کیسے دور ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے اور بدن پہ زخموں کے
نشان اور گھرنڈ ہوتے، اس کی آنکھیں بجھی بجھی سی دکھائی دیتیں اور چال ڈھال بہت ست ہو
گئی لیکن اس کے باوجود اس نے معصوم بچوں کے ساتھ کھیلنا نہیں چھوڑا۔ اس کے ساتھ
میرے اپنے پہلے تین ہفتے بڑے بھیانک گزرے تھے اور میں سوچتی کہ وہ اگلی صبح کیسے بچوں کے
ساتھ ہنس کھیل لیتی تھی؟۔ شاید وہ اس سے نرمی کا برتاؤ رکھتا تھا؟ لیکن اس سوچ کو میں نے
ساتھ ہی مسترد کر دیا۔ کسی کا خیال رکھنے کے لئے اس کے ذہن میں کوئی جگہ نہ تھی۔

ایک سہ پہر مجھے تیمرڑی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی، وہ میرے خاوند کی توجہ اور
مہربانیوں پہ خوش تھی۔ غصہ میرے پورے وجود پہ چھا گیا۔

دوسری عورتوں کے بارے میں میں بالکل سرد مہر ہو گئی۔ ماں دندناتی ہوتی
میرے ذہن میں آئی، بے وقوف لڑکی وہ تمہیں ایک گلی سے بیاہ کے لایا۔ اب وہ اس سے
شادی کیوں نہیں کرے گا؟ پھر مجھے جھنجوڑتے ہوئے وہ کہتی، تم اس سے نفرت کرتی ہو؟ تو
پھر اس کی نوکرانی بن جاؤ۔ اس کا گھر اور اپنے بچے تم کبھی نہ چھوڑ سکو گی، لیکن چوائس کہاں
تھی؟ گچی؟

کم از کم وہ اب اس کے ذہن سے اتنا دور تھی جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا اور میں
اس لڑکی کے خلاف حسد میں مبتلا ہو رہی تھی جسے میں نے اپنے ہاتھوں اپنے جہنم میں دھکیلا
تھا۔ میں اس سے اس بنا پہ حسد کر رہی تھی کہ وہ میری غلاظتوں میں میری حصہ دار ہو گئی تھی۔
کیا گنجلک صورت حال تھی، اگرچہ میرے خاوند کا میرے ساتھ رویہ کبھی بھی بدل نہ سکا لیکن
سالہا سال بیت جانے کے بعد میرا مقام کچھ نہ کچھ مستحکم ضرور ہو گیا تھا، اور اب ایک بچی مجھ
سے آگے نکلی جا رہی تھی۔ میری ذلت اور بے عزتی کا باعث اس کی نسبت اب وہ تھی۔ بڑی
عمر کے مالکوں اور چھوٹی عمر کی خادماؤں کی بہت سی کہانیوں نے خودرو جنگلی پودوں کی طرح
میرے سر میں جڑیں چھوڑنا شروع کر دیں۔

میرے خاوند نے مجھے حکم دیا "تیمڑی کو نئے کپڑے بنا کے دو اور اس سے زیادہ کام مت لیا کرو۔" میں حیران تھی وہ کس طرح اس کے ذہن پہ سوار ہو گئی تھی کہ آخر کار پیر سائیں کو میرے ساتھ بات کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

فتح کا نشہ معدوم ہو چکا تھا، اب رعیت خطرہ بن کے کھڑی تھی۔

"تمہارا اُس کے متعلق کیا خیال ہے؟" میں نے اسے زندگی میں پہلی دفعہ مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرا تجسس بڑھتا چلا گیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کہوں۔ میں ہتھیلیوں کا پسینہ اندر ہی اندر ملتے ہوئے بڑبڑائی "سائیں وہ بہت چھوٹی ہے۔ میرے لئے تو وہ ابھی بچی ہی ہے۔"

"جوانی کا کوئی متبادل نہیں ہوتا۔" اُس نے اعلان کیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گھر کی ہر چھوٹی لڑکی میرے مقابلے میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ جب عمر رفتہ واپس نہیں آسکتی تو میں ان کا مقابلہ کیوں کر کر سکتی تھی۔

وہ مجھے گنگ بے حس و حرکت چھوڑ کر چلا گیا۔

چھوٹا سائیں اپنے باپ کے کاغذات اٹھائے لڑھکتا ہوا اندر آیا اور ساتھ ہی باہر بھاگ گیا۔ میرا دل اپنے بڑے لڑکے کے لئے پگھل گیا۔ جب سے اس نے چلنا سیکھا تھا میں اسے شاذ و نادر ہی دیکھ پاتی۔ اُس کا تمام دن اپنے باپ کی جابرانہ نگاہوں تلے مزار پہ ہی گزرتا۔ جب دونوں کی واپسی ہوتی تو میں اپنے خاوند کی خدمت میں یوں لگ جاتی کہ میرے لئے بیٹے کی جھلک پانا بھی ناممکن ہو جاتا۔

اگرچہ چھوٹے سائیں کی تمنا اور ارادے یہی تھے کہ باپ کی رضا حاصل کرے لیکن یہ ناممکن الحصول ہدف تھا۔ میرے لئے یہ دلی اذیت کا باعث تھا۔ جس دباؤ کے عالم میں وہ پروان چڑھ رہا تھا۔ وہ اسے ایک انتہائی افسردہ اور خوف زدہ بچہ بنانے کے لئے کافی تھا۔

میرے ذہن نے چھوٹے سائیں کو دھکا دے کے باہر کیا اور ان احساسات سے نپٹنے لگا جو تیمڑی نے پیدا کئے تھے۔

کمرے سے باہر نکلتے ہوئے وہ نیچی نگاہوں اور تیز قدموں کے ساتھ لڑکھڑاتی ہوئی میرے پاس سے گزرتی۔ صاف ظاہر تھا اب وہ پسندیدہ تھی اور میں محض ایک استعمال شدہ بیوی۔ نوکرانیوں نے سرگوشیاں شروع کر دیں جو میرے کانوں میں ڈھول بن کے بجنے

لگیں۔ میں جس طرف کا رخ کرتی مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے مجھے بھرپور طمانچہ جڑ دیا تھا۔

چیل ہر سمت مسلسل پہرے پہ دکھائی دیتی۔

ایک روز تیمڑی نے اپنی پلیٹ میں سے کھا لینے پہ دوسری نوکرانی کو گالی دی۔ ساتھ ہی اس نے ایک لڑکی کو اس بنا پہ تھپڑ مارا کہ اس نے اس کے نئے سلیپر پہن رکھے تھے۔

میں نے اسے چلاتے ہوئے سنا "میں مالک سے تمہاری شکایت کروں گی۔ میری چیزیں چرانے پہ وہ تمہاری خوب خبر لے گا۔" درمیانی عمر کی ایک خادمہ قدم آگے بڑھاتے ہوئے جواباً چیخی "چھوٹی کنجری، تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو۔ ہم تمہارے متعلق سب کچھ جانتی ہیں۔"

تیمڑی نے چلاتے ہوئے کہا "ذرا رکو میں مالک کو بتا لوں۔ وہ میرے متعلق یہ کہنے پہ تمہاری خوب پٹائی کرے گا۔" دوسری عورتوں نے ادھیڑ عمر خادمہ کو پرے دھکیلتے ہوئے اُسے نتائج سے ڈرایا۔ "وہ مالک کے منہ چڑھی ہے، وہ اسے بتا دے گی کہ تم نے کیا کہنے کی جرأت کی تھی۔"

اِدھر مجھے اس بات پہ غصہ آ رہا تھا کہ گھر کی نوکرانیاں مجھ سے زیادہ تیمڑی سے ڈرتی تھیں۔ میں قدم بھرتے ہوئے ان کی منڈلی کے پاس پہنچی اور کوئی وجہ پوچھے بغیر جوتا اتار کے اُسے دے مارا۔ مجھے یہ خیال بھی نہ آیا کہ چیل دیکھ رہی تھی اور وہ مالک کو یہ سب کچھ ضرور بتاتی۔

پیر سائیں کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے میں نے بہر حال جھوٹ بولا "سائیں تیمڑی نے نوکرانیوں کو اپنے متعلق تمہاری دلچسپی کے بارے میں بتا دیا ہے۔ میں نے اس کی پٹائی اس لئے کی کہ وہ دوبارہ ایسی غلطی نہ کرے۔ مجھے امید ہے سائیں میرے اس عمل سے آپ ناراض نہیں ہوں گے۔"

اس کی خاموشی میرے دل کو چاروں سمت پھڑکنے پہ مجبور کر رہی تھی۔ جب اس نے کہا "تم نے بروقت کارروائی کی۔" تو میں نے سکون کا سانس لیا، اس نے میری کہانی قبول کر لی تھی۔

میں نے بات مزید بڑھانے کے لئے کچھ اور جرأت کی "سائیں تیمڑی دوسری

نوکرانیوں کو گالیاں دیتی ہے جیسے اسے بڑا خاص مقام حاصل ہے۔ اس کا رویہ شکوک پیدا کر رہا ہے۔" "اسے پیش کرو۔" اُس نے حکم دیا۔

میں نے قدم باہر نکالا، تیمبڑی دروازے کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پہ جیسے کسی کامیابی کی چمک تھی۔ یقیناً اس کے پاس بھی کچھ بتانے کو تھا۔ میرے لئے اس کی کوئی اہمیت نہ تھی کہ بلاوے نے اسے خوفزدہ نہ کیا تھا، لیکن اس کے چہرے کا یہ تاثر کہ، تم جو بھی کہہ لو بالآخر یہ میرے حق میں ہی جائے گا، میرے لئے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

دروازہ مجھ پہ بند ہو گیا لیکن ساتھ ہی پیر سائیں کے طمانچے کی چٹاخ پٹاخ سنائی دی۔ میں اپنی فتح کے احساس میں مگن تھی۔ یہ زندگی کا وہ لمحہ تھا جب توقعات، صدمے اور خوف کے سب ہی احساسات ایک دھاکے کے ساتھ اس کے شوخ اور گستاخ چہرے پہ پھیل گئے ہوں گے۔

پیر سائیں نے تیمبڑی کو باہر پھینکا تو وہ سیدھی میرے قدموں میں آن گری۔ وہی خوفزدہ نگاہیں ایک بار پھر ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس دفعہ میرے دل نے خون کا کوئی آنسو نہیں گرایا۔ چیل نے اس تبدیلی کو ضرور نوٹ کیا ہوگا۔ میں یہ سوچتے ہوئے تیزی سے چل دی کہ وہ اپنے مالک کے اس جرم کے بارے میں کیا سوچتی ہوگی۔

کیا خانقاہ سے اس کی اندھی عقیدت نے اس کی بینائی، سماعت اور قوت گویائی سب کچھ چھین لیا تھا؟ وہ یہاں کی ہر برائی سے آشنا تھی۔ کیا وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہاں کوئی اچھا عمل بھی ہو؟

تیمبڑی کو جب تک مالک کے بستر تک رسائی حاصل رہتی وہ میرے لئے خطرہ تھی۔ مجھ سے جب بھی بن پڑا میں نے اس کا حوصلہ توڑنے کی کوشش کی، اگرچہ وہ مجھ سے اسی طرح دور رہنے کے لئے کوشاں رہتی جیسے گھمی اپنے باپ سے، لیکن اس کے برعکس میری نگاہیں دن بھر اس کے تعاقب میں رہتیں۔

میں تیمبڑی کی چھوٹی سے غلطی پکڑنے کے لئے جھپٹتی رہتی۔ صرف گھمی ہی اس وقت میرے دل میں اُمڈتے ان لاکھوں جذبات کو سمجھ سکتی جو میری فرسٹریشن کا نتیجہ تھے۔ میں کسی نہ کسی طرح روزانہ مالک تک اس کے خلاف شکایتیں پہنچاتی رہتی، لیکن پیر سائیں کے دن کبھی بھی اس کی راتوں پہ حاوی نہ ہو سکے تھے اور اس کی غلطیوں کے باوجود اس کے

لئے اس کی ہوس میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔

ایک روز گھمی نے مجھے کہا "اماں جب انسان کے پاس کوئی چوائس نہ ہو تو پھر کچھ نہ کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اسے اسی طرح رہنے دو۔ اپنے آپ کو اتنے نمایاں طور پہ تیمبڑی کے معاملے کا روگ نہ لگاؤ۔"

بچوں کی طرح میرا ہاتھ تھامے اُس نے کسی بوڑھی عورت کی طرح پوچھا، یہ بتاؤ کہ میرا باپ تمہارے لئے بڑی خاص اہمیت رکھتا ہے؟ نہیں وہ ایسا کہاں تھا لیکن اس کے باوجود اس کا وجود تضادات کا ایسا مجموعہ تھا جس سے میری پوری زندگی عبارت تھی۔

عید سے ہفتہ بھر قبل اُس نے مجھے قیمتی کپڑوں کا ایک جوڑا دیا اور بالکل ویسا ہی ایک تیمبڑی کے لئے۔ مجھے گھمی کی نصیحت یاد تھی۔ میں احتجاج کی آگ کو تو پی گئی لیکن پھر بھی تیمبڑی کا تحفہ اسے دینے کا حوصلہ نہ کر سکی۔ اس کے بجائے میں نے اسے بھی وہی کچھ دیا جو دوسری نوکرانیوں کو ملا تھا۔

جب مجھے اندر بلایا گیا تو وہ وہیں تھی۔ "تم نے لڑکی کو وہ کچھ دیا جو میں نے اس کے لئے تمہیں دیا تھا؟" اس نے پوچھا میں خوف سے تھرتھرائی "سائیں میں نے اُسے دوسرے کپڑے دیئے تھے۔ مجھے ڈر تھا دوسری نوکرانیاں اس پہ شک کریں گی۔" اس کے تھپڑ نے مجھے کمرے کے ایک طرف دے مارا۔ اب یہ اس کی باری تھی کہ مزے لیتی، احساسِ ذلت خوف پہ غالب ہو گیا۔ مہینوں اسے لگام دیئے رکھنے کے بعد شکست تسلیم کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ دوسری بار میری طرف بڑھا تو میں چیخی

"تم چیخ رہی ہو؟" وہ دھاڑا

ہاں، ہاں میں اسے کہنا چاہتی تھی۔ مجھے قتل کر ڈالو، لیکن خدا کا شکر ہے اس نے تیمبڑی کو باہر نکال دیا اور مجھے ڈریسنگ روم میں دے مارا۔ چارپائی اٹھاتے ہوئے اُس نے حکم دیا "اپنے ہاتھ اس کے نیچے رکھ دو۔" لکڑی کے بھاری پائے میری ہتھیلیوں پہ رکھ دیئے گئے میں تلملائی۔ میری آنکھیں اوپر کو مڑ گئیں۔ میرے ہونٹ سل گئے۔ میں درد کی آگے پیچھے اٹھتی خوفناک لہروں کو پیتی گئی۔

"ذرا آواز نکالی تو میں تمہاری گردن توڑ کے تمہاری کھوپڑی کے دو حصے کر دوں گا۔" اس نے مجھے خبردار کیا۔ سیدھی ہتھیلیوں اور دُہری ٹانگوں کے درمیان میں چُر مُر ہو رہی

تھی، میرا سر کہیں درمیان میں پھنسا ہوا تھا۔ کوئی طریقہ ایسا نہ تھا کہ میں سیدھی بیٹھ سکتی، گھٹنوں کے بل ہو سکتی یا آلتی پالتی مار کر بیٹھ سکتی۔ یہ بڑی خوفناک پوزیشن تھی۔

ہر حرکت ناقابلِ برداشت تھی، ہلکی سی چوں چراں بھی اذیت کی لہریں اٹھا دیتی۔

اپنی پوزیشن اور درد دونوں کے خلاف جدوجہد میں کبھی ایک اور کبھی دوسرے کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے اسے چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے دیکھا۔

پائے میری ہتھیلیوں میں دھنستے چلے جا رہے تھے، ہڈیاں چیخ رہی تھیں۔ وہ میرے کراہنے کی آواز سننے کے لئے کوشاں تھا تاکہ سزا میں اضافہ کر سکے اس کے سننے کے لئے وہاں کچھ بھی نہ تھا، اس کی ٹانگیں اوپر اٹھیں۔ وہ چت لیٹ گیا، پائے میرے گوشت میں مزید اترے۔

درد کو اندر ہی اندر بند کر دینا ممکن نہ تھا۔ میری ہتھیلیوں سے اُٹھتے ہوئے وہ میرے بدن سے گزرتا اور سر میں داخل ہو کے نکل جاتا، چھت کی پچی کاری میں مجھے اس ہفت رنگ نظارے کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔

ایک بلا خراٹے لے رہی تھی۔ اس کے پاؤں تلے ایک عورت کنڈلی مارے ہوئے تھی۔ اس کے بازو آخری حدوں تک پھیلے ہوئے اور ہتھیلیاں اوپر کو تھیں، شیطان کی کسی پجارن کی مانند جسے اذیت دی جا رہی ہو۔

وہ بلا۔

ایک لمحے کے لئے امید کی کرن ..... جو بجھ گئی۔

جب تک وہ بیدار نہ ہوتا ہر چیز کو اسی طرح رہنا تھا۔ میں وقت کے خلاف جدوجہد میں تھی جو گذر ہی نہ رہا تھا اور پھر بھی کئی بے آواز گھنٹے گزر گئے۔

بالآخر وہ اٹھ گیا۔

اس کا بوجھ اتر جانے کے باوجود درد کم نہ ہوا۔ چارپائی کے پائے اٹھ گئے، لیکن درد ختم نہ ہوا۔ "کھڑی ہو جاؤ" اس نے حکم دیا اور میری روح ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے ڈربے میں لوٹ آئی۔ کیا میں کچھ دیر کے لئے مر گئی تھی؟ اس کے پاؤں دکھائی دیئے تو میں سہارے کے لئے اُن پر گر پڑی۔

میں نے اپنی اکڑی اکڑی روح کی طرف توجہ کی۔ صرف وہ ہی مجھے ان حالات

سے نجات دلا سکتی تھی جن سے بچنا مشکل تھا۔ جب بھی کوئی مصیبت کھڑی ہوتی میں گم صم ہو جاتی۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا جیسے میری کھوپڑی میں کچھ بھی نہ تھا۔ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ میرا دماغ ختم ہو گیا تھا۔ میں ہمیشہ اپنے اندر ہی اندر گھٹتی اور جدوجہد کرتی رہی تھی۔ صرف تیمڑی کے معاملے میں میں نے کھلی اور بیرونی جنگ لڑی تھی اور اب میں پسپا ہو رہی تھی۔

عید سے پہلے چوڑیوں والی رنگ برنگی چوڑیاں لئے حویلی میں آئی، نوکرانیاں غریب تو تھیں ہی اماں سائیں نے بھی انہیں ایسی زیب و زینت کی کبھی اجازت نہ دی۔

"اس طرح وہ اپنا مقام بھول کے بیگمات سے مقابلے پہ اتر آتی ہیں۔" وہ اکثر کہا کرتیں۔

لیکن تیمڑی نے پیر سائیں کی عطا کی ہوئی رقم سے ویسی ہی چوڑیاں خریدنے کا فیصلہ کیا جیسی میں نے گُلّی کے لئے خریدی تھیں۔ بات اماں سائیں تک پہنچی تو انہوں نے لڑکی کے منہ پر تھپڑ جڑتے ہوئے چوڑیاں ضبط کر لیں۔

پھر ممکنہ نتائج سے خوفزدہ ہوتے ہوئے انہوں نے وہ اسے واپس کر دیں۔ "اس دفعہ میں تجھے چھوڑ رہی ہوں، تو نے آئندہ اگر ایسی حرکت کی تو میں مالک کو بتا دوں گی، وہ نوکرانیوں کو اپنے گھر والوں سے مقابلے کی کبھی اجازت نہیں دیتا، وجہ خواہ کچھ بھی ہو" لاج رکھنے کے لئے اماں سائیں نے اسے دھمکی دی۔

مجھے اس کی اب کوئی پرواہ نہ تھی، لیکن تیمڑی تو جیسے میرا منہ چڑانے کے لئے جہاں میں جاتی وہیں ہو لیتی۔ مجھے اس کا جائزہ لینے کی کیا ضرورت تھی لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے دیکھا کہ وہ گُلّی سے بہت زیادہ عمر کی دکھائی دینے لگی تھی۔ وجہ سب پہ عیاں تھی لیکن مجھے کیا۔

اماں سائیں نے مجھے راضی بہ رضا ہوتے محسوس کیا تو وضاحت کے لئے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"یہاں مردوں کے لئے یہ بڑی عام سی بات ہے۔ تقریباً سب ہی بیویوں کو اپنے خاوندوں اور نوکرانیوں کے آپس کے تعلقات کی ذلت سے گزرنا پڑتا ہے۔ دراصل ان عورتوں کو ان کی جگہ پہ رکھنا بڑا مشکل ہے۔ یہ اپنا مقام بڑی جلدی بھول جاتی ہیں۔ اپنی خوش قسمتی کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ یہ سوچ بیٹھتی ہیں کہ وہ پیدا ہی ایسے گھرانوں میں ہوئی تھیں اور ان کا تعلق گھٹیا اور نیچ ذاتوں سے نہیں۔"

انہوں نے مجھے مشورہ دیا "تم اسے تبدیل کر دو۔ اتنی اولاد کی بدولت تمہاری پوزیشن بہت اچھی ہو چکی ہے، اپنے میاں کی نگاہوں میں آنے کی کوشش کرو" میری طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے بات جاری رکھی "اس کے ساتھ جو وقت ملتا ہے اسے قیمتی جانو اور ضائع مت کرو۔ یہ دیکھو کہ وہ کن چیزوں سے خوش ہوتا ہے اور وہی کرو۔ وہ ایک بیمار عورت کے پیچھے کیوں جائے؟ اپنے آپ کو ذرا دیکھو تو، بے جان اور بجھی ہوئی، کون مرد تمہیں چاہے گا۔ وہ کسی نوجوان تیمڑی کی طرف کیوں نہ جائے؟"

لیکن میری ہمت جواب دے چکی تھی۔ گمی کا یہ مشورہ کہ میں چیزوں کو جیسی وہ ہیں اسی طرح قبول کرتی جاؤں میرے لئے آسان راستہ تھا۔ اماں سائیں مجھے ایک تاریک جنگل میں داخل ہونے کو کہہ رہی تھی۔ مجھے کسی فتح کی نہیں امن کی تمنا اور ضرورت تھی۔ میں نے اپنی ساس سے پوچھا "کیا ان کا بیٹا تیمڑی سے شادی کر لے گا؟" "وہ جس سے چاہے شادی کر سکتا ہے۔ یہ تو اس کی رضا کا معاملہ ہے، اسے راضی رکھنے کا تو ایک ہی راستہ ہے کہ اس کے بستر میں کوئی اسے یہ یقین دلا دے کہ اُس جیسی کوئی اور نہیں۔"

میری نگاہوں نے یتیم لڑکی کا پھر سے تعاقب شروع کر دیا۔

چاند رات ماں کے گھر کی میٹھی میٹھی یادیں اپنے ساتھ لائی۔ ماں کے گھر میں خوشیوں کا مطلب نئے کپڑے، چوڑیاں، مہندی اور عیدی تھا۔ اس روز ہم اپنے فلیٹ کو سجایا کرتے تھے، کپڑوں کی استری، سویاں اور مٹھائی کی تیاریاں کتنے مزے کی ہوا کرتی تھیں۔ اب سب کچھ ہی تو بدل گیا تھا۔ ہر سال میں گھر کی عید کی یادوں میں کھو جاتی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یادیں بھی تو دھندلی پڑتی جا رہی تھیں۔ صرف آرائشی قمقمے، پریوں کے دیس کی روشنیاں ہی تر و تازہ رہیں، لیکن پھر وہ بھی اچانک بجھ جاتیں اور میری زندگی گہری تاریکیوں کی نذر ہو جاتی۔

میں اپنی زخمی ہتھیلیوں پہ مہندی نہ لگا سکی۔ میں لگانا چاہتی ہی نہ تھی۔ گمی میرے ہاتھوں کی مرہم پٹی تازہ کر رہی تھی اور میں اپنی ننھی بیٹی کا دکھایا ہوا راستہ چھوڑ کے تیمڑی کی اس شیطینیت کی طرف دوڑ کے بارے میں سوچ رہی تھی جس کے حوالے میں نے اسے خود کیا تھا۔ وہ اس مقام پہ قابض ہو رہی تھی جس سے مجھے نفرت تھی، لیکن اس کا وہاں قبضہ مجھے کب گوارا ہو سکتا تھا۔

میں جہاں جاتی بھڑکیلے نارنجی کپڑے مجھ پہ لپکتے اور میرے دل میں آگ لگاتے ہوئے محسوس ہوتے۔ اس کی سرخ لپ اسٹک دیکھتے ہی میں لال بھبھوکا ہو جاتی۔ اس کے بادامی چہرے پہ دو روشن چمکتی ہوئی آنکھیں ایسے تھیں جیسے دو بھنورے کیچڑ کے جوہڑ میں پُھدکتے پھر رہے ہوں۔

اس کی دنبے جیسی سرین دائیں بائیں ہلتے ہوئے دل فریب انداز میں درمیان میں رُکتیں۔ اس رات میں نے دیکھا وہ پیر سائیں کی موجودگی میں لاجونتی ہو گئی۔ اس کے پاؤں چھونے کے لئے جھکتے ہوئے وہ مُسکرا اٹھی تھی۔ اس کے جوتے اتارنے کے لئے تیزی دکھاتے ہوئے، سلیپر لانے کے لئے بھاگتے ہوئے انہیں اس کے پاؤں پہ چڑھاتے ہوئے وہ اتنی ہی تیزی دکھا رہی تھی جتنی میں، لیکن میں اس کی طرح خوش کبھی نہ نظر آئی تھی۔ پیر سائیں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا، کبھی اسے کبھی مجھے۔

مجھے ..... اسے ..... کیا وہ دونوں کا فرق محسوس کرتے ہوئے مجھے مسترد کر رہا تھا؟ میرے اندر سے کہیں گہرا احساسِ ذلت اٹھا، میں سمجھی تھی وہ ختم ہو چکا تھا۔ حسد میرے دل میں سوئے کسی سر سبز سانپ کی طرح بیدار ہوا۔ اس کی نگاہوں میں بیزاری اور بے آرامی کی کیفیت مجھے مجبور کر رہی تھی کہ میں غائب ہو جاؤں، لیکن اس کے بجائے میں دروازے میں کھڑے کھڑے اس وقت تک پس و پیش میں مبتلا رہی جب تک اُس نے مجھے رُکنے کو نہیں کہا۔

تیمڑی کے پاس اُس کی الماری کی چابی تھی۔ اسے کھولتے ہوئے اس نے وہسکی کی ایک بوتل، باہر نکالی۔ اسے دو گلاسوں میں انڈیلنے کے بعد اس نے ایک ڈراپر سے دونوں میں کوئی اور محلول ڈالا اور ایک گلاس میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے مجبوراً اس کا ایک گھونٹ لیا جب کہ وہ اُسے مزے لے لے کر پی رہی تھی۔ پیر سائیں کے کمرے سے اس کے جھومتے جھامتے نکلنے کا راز آج کُھل گیا تھا۔

قول و فعل کا ایک اور خوفناک تضاد مجھ پہ جھپٹا ..... پیر سائیں کی بیوی تو شراب پی رہی تھی، لیکن وہ خود بکری کا تازہ دودھ نوش جان کر رہا تھا۔ تیمڑی میری زندگی کا حصہ تو تھی ہی لیکن میرا اس کا ایسا تعلق بھی بنے گا یہ کبھی میرے ذہن میں نہ آیا تھا۔ کیا یہ رات میرے تجسس کی تخلیق کردہ تھی؟

تیمبڑی کے وجود کے تصور سے میری ریڑھ کی ہڈی میں کوئی سرد لہر سی دوڑ گئی۔
اس کی بے تکلفی مجھے گوارا نہ تھی، میرا اختلاط اسے قبول تھا۔ اس کا بدن گھٹا ہوا اور مضبوط تھا میرا پلپلا اور نرم۔ اس میں ایسی نرمی اور تازگی تھی جو مجھے کالی کی یاد دلاتی تھی لیکن میں اُسے اس لئے تسلیم نہیں کر سکتی تھی کہ وہ کالی نہیں تھی۔ اس وحشت میں ڈوبے ہوئے بھی وہ فرق اتنا گہرا اور نمایاں محسوس ہو رہا تھا۔

کالی سے میری قربت کی سزا میرے لئے بے معنی تھی۔ آنکھوں میں بڑھتی ہوئی دھند کے باوجود میں نے محسوس کیا اس کی نگاہیں مجھ پہ ہی تھیں۔ تیمبڑی سے کہیں زیادہ مجھ پہ ہی، پھر میرا سر چکرانے لگا اور ہر چیز غیر حقیقی سی ہو گئی۔ وہ منکوحہ جسے اُس نے ایسے بندی خانے میں ڈال دیا تھا جو اس کے بدن کی طرح بند اور محفوظ تھا آج آزاد ہو گئی، جذبات بھڑک اٹھے، خوف غائب ہو گیا۔

مجھے قدریں بھول گئیں، وہ بھی انہیں بُھلائے بیٹھی تھی، اگر میں نے مالکن کا خطاب اتار پھینکا تھا تو تیمبڑی نے خادمہ اور میرے درمیان کا فاصلہ مٹا ڈالا۔ رات جسموں کا چارا بنی یا جسم رات کا چارا ہوئے۔

کھیل ختم ہوا تو میں علیل تھی۔

بعد میں اذیت کا شکار رہی۔

اگر اماں سائیں کا مشورہ درست تھا تو دُکھ درد اور خوف کی راتیں ختم ہو سکتی تھیں، اگر جہنم ہی وہ واحد جگہ تھی جہاں میرا شوہر میرا شریک ہو سکتا تھا تو میں اس آگ کے مزے کیوں نہ لیتی جو اس سے قبل مجھے جلاتی رہی تھی، لیکن حقائق کی دنیا میں واپسی کا عذاب ناقابلِ برداشت تھا۔

ایک نفیس اور مہذب عورت کے کردار کی طرف واپسی ناممکن ہو گئی۔

"یااللہ!" میں جائے نماز پہ چلائی، کسی روح کے لئے ایک وقت میں کتنی زندگیاں گزارنا ممکن ہو سکتا ہے؟ کتنے احساسات وہ بیک وقت رکھ سکتی ہے؟ وہ کتنے روپ، کتنے لوگ ہو سکتی ہے؟ میرے دو روپ ہو گئے تھے۔ میں اپنے اس وجود کو ختم کر دینا چاہتی تھی جو احساسِ گناہ میں ڈوبا رہتا تھا۔

ضمیر کے لئے میری زندگی میں اب کوئی جگہ نہ رہی تھی۔ جب میں نے گُلّی کے

اس تازہ صورتِ حال میں ملوث ہونے کے بارے میں سوچا تو کوئی شک تھا بھی تو وہ رفع ہو گیا۔

خدا کا شکر ہے گُلّی کو یہ احساس نہیں ہوا کہ میں نے ایک عیاش عورت کے روپ میں عید کا تہوار منایا تھا۔ اُس نے میرے پٹیاں بندھے ہاتھوں کو چوما اور فرطِ محبت اور عقیدت سے کہا "اماں تمہارے دل کی بھلائی تمہارے چہرے پہ لکھی رہتی ہے۔ کوئی تمہیں جتنا بھی دیکھے تم آسمانوں سے اترا کوئی فرشتہ لگتی ہو۔" پھر اس نے ہنستے ہوئے شرارتاً کہا "اس حقیقت کا اس کرماں بھرے مزار سے کوئی تعلق نہیں۔" مجھے یقین نہیں آ رہا تھا!
جب میں نے خبر سنائی کہ میں پانچ ماہ کی حاملہ ہوں تو اماں سائیں نے مشورہ دیا "اپنے آپ کو پابند کر لینے کا یہ بڑا غلط وقت ہے۔ یوں تو تیمبڑی اس پہ پورا غلبہ پا لے گی۔"
پیر سائیں میرے بڑھتے ہوئے پیٹ کو دیکھتے ہوئے غرایا اور مجھے حکم دیا کہ میں اس رکاوٹ کو گرا دوں۔ کونین کی بیس گولیاں ہفتہ بھر روزانہ کھانے کے باوجود میرا حمل نہ گرا۔ میری کھال سوکھے ہوئے چھوہارے کی مانند خشک اور سخت اور سر کسی چٹان کی طرح بھاری ہو گیا، بالآخر جب لہو میرے اندر سے چشمے کی طرح پھوٹ پڑا تو تیمبڑی نے جیسے حتمی طور پہ میری جگہ سنبھال لی۔

میرا دل ڈوب گیا، نیم بے ہوشی کے عالم میں نوکرانیوں نے مجھے کار میں ڈالا، جو مجھے گاؤں کے ہسپتال لے گئی۔ میرے چہرے پہ چادر اور باقی بدن ڈاکٹر کے سامنے کھلا تھا۔ ڈاکٹر نے میرے بطن میں ایک بڑے سوراخ کی نشاندہی کی تھی جو ضرورت سے زیادہ کونین کھانے سے ہوا تھا۔ ہوا بند ہسپتال میں مجھے دو ہفتے تک خون لگایا گیا اور پھر میں ایک بار پھر کار میں واپس ہوئی۔ اس کے شیشے گہرے رنگ کے پردوں میں ڈھکے ہوئے تھے۔ میرے اور ڈرائیور کے درمیان کسی جانور کی کھال لٹک رہی تھی اور اس دنیا کی وہاں کوئی جھلک دکھائی نہ دی جسے دیکھنے کی میں مشتاق تھی۔ مجھے یوں ہی واپس بندی خانے میں لے آیا گیا۔
نوکرانیاں مجھے مبارک سلامت کہنے دوڑیں۔ گُلّی کی زندگی کے یہ پہلے ماہانہ ایام تھے جو گزرے۔ چودہ سال کی عمر میں وہ مکمل عورت بن گئی۔ پیر سائیں نے اس کی شادی میسنی کے بھائی سے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
میری بیٹی کا مستقبل مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ مجھے لڑکے سے خوف آتا تھا۔ اس کا

خاندانی پس منظر اس کا گواہ تھا کہ وہ مصائب میں داخل ہونے کو تھی۔ اس کا چچا اس سے اپنی وہ خواہش پوری کرسکتا تھا جو اس کے باپ کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا باپ اسی طرح راضی بہ رضا ہو سکتا تھا جیسے اس کی ماں ہو گئی تھی۔ اس کی نندمیسنی یقیناً گناہ کی حوصلہ افزائی کرتی۔

میں اپنے خاوند کو کہنا چاہتی تھی کہ وہ گُمی کو ایسے خاندان کے حوالے نہ کرے جہاں محرمات سے زنا کا چلن عام تھا۔ میں اُسے اس جال کے حوالے کرنے سے روکنا چاہتی تھی جس میں پھنسنے سے میں اسے بچا چکی تھی، لیکن مجھ سے بوجھ اٹھایا نہ گیا نہ میرے خیالات لفظوں کا روپ دھار سکے۔

میں نے سُنا کہ لڑکے نے اس قدر عیش و عشرت میں زندگی گزاری تھی کہ وہ بالکل بے کار ہو کے رہ گیا تھا۔ شادی بیاہ کی روایات بہر حال اس کے لہو میں رچی بسی ہوئی تھیں۔ یہاں مرد اپنی عورتوں پہ جتنا زیادہ غلبہ اور قابو رکھتے اُن کی اتنی ہی تعریف ہوتی۔ عرصہ دراز کی مدھم سی اک یاد میری آنکھوں میں لہرائی میں سوچتی ہی رہی یہ کہاں محفوظ تھی۔ رانجھے کی شادی ہو چکی ہوگی، میرے دل میں اسے کھو دینے کے درد کی ٹیس اٹھی۔

میں گُمی کے ایک وحشی جانور کے حوالے ہونے پہ افسردہ تھی، لیکن اماں سائیں چہک رہی تھیں "اللہ کے کرم سے اپنے خاندان میں بہت لڑکے ہیں، ہمیں اپنی کسی بیٹی کو باہر بیاہنے کی ضرورت نہیں۔"

میری چھوٹی بیٹی دیا دس سال کی تھی۔ یہ نام اسے اس لئے دیا گیا تھا کہ اس کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی تھی۔ دیا اور منی، گُمی کی سی روح، جذبوں اور سوجھ بوجھ سے خالی تھیں۔ میں نے انہیں پرواز سکھانا چاہی تو ان میں سے کسی نے کوئی سوال نہ کیا، وہ بچوں کے سے تجسس سے عاری تھیں اور میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ میں ان کے ذہنوں کو پختہ کرتی۔ میں انہیں جتنا نظرانداز کر رہی تھی اماں سائیں اُن سے اتنا ہی پیار کرتی تھیں۔ دیا اور منی کا زیادہ وقت انہی کے کمرے میں گزرتا تھا۔ وہ حلوا پکانے کی کوشش کرنے والوں کی صفائی اور آٹے کی چھنائی میں خوش رہتی تھیں۔

میں بچوں کے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں میں اپنی علالت اور خاص ایام گزارا کرتی تھی۔ میں نے گُمی کے خوبصورت نقش و نگار والے چہرے پہ نگاہ ڈالی۔ اس

نے باپ سے کچھ بھی نہ لیا تھا۔ اس کا ہر عضو مجھ پہ تھا۔ زرد اور شاہانہ، وہ اپنا سر اور شانے نیچے دیکھتے وقت بھی بلند اور اوپر ہی رکھتی تھی۔

میں نے اُس سے پوچھا "گُمی تمہارا شادی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اپنے گھر کی مالکہ ہونا کیسا لگے گا؟" "کیا یہ اس سے مختلف ہو سکتا ہے جیسا یہاں ہے؟" اس نے دانش مندی سے جواباً سوال کیا۔ مجھے میری اپنی شادی یاد آئی۔ میری منگنی پہ جو خوشیاں منائی گئیں وہ ایک "جوئے" کا پیدا کردہ ہنگامہ تھیں۔ کامرانی کے ابتدائی آثار نے فتح کے فریب کی شعبدے بازی کر دکھائی تھی۔

اس وقت آرائشی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔
وہ بجھ گئیں تو حقائق کی سنگینی عیاں ہوئی۔
گُمی کے بیاہ سے کوئی خوشیاں نہ پھوٹیں۔

تاریخ طے ہوئی تو ہم کچھ نہ کرتے ہوئے بھی دوڑے پھرے۔ اس کا جہیز تیار رکھا تھا۔ اماں سائیں دربار کی سالانہ آمدن سے ایک حصہ اس کی پیدائش کے ساتھ ہی علیحدہ رکھتی گئی تھیں۔ وہ تمام زیورات جو میں نے پہننے بند کر دیئے تھے اور وہ جو اماں سائیں نے اپنے دوسرے بچوں میں تقسیم نہ کئے تھے، گُمی کے ہوئے۔ ٹیلی وژن یا ریڈیو قسم کا کوئی تحفہ تو نہ تھا البتہ کار ضرور دی گئی۔

کار پہ اُسے کہاں جانا تھا؟ میں سوچتی رہی

گُمی کی شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں ایک ہی کام کرنے کو رہتا تھا اور وہ تھا مہمانوں کی فہرست کی تکمیل۔ مجھے اپنے جہیز کی یاد آئی اور میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اُس نے مجھے ہر ماں کو پیش آنے والی اس مصیبت سے بچا رکھا تھا۔ کم از کم ایک مسئلہ تو تھا جس سے میں محفوظ تھی۔ تیاریاں اتنی مکمل تھیں کہ اس کے باپ نے ہفتے بھر کے اندر اسے رخصت کرنے کا فیصلہ دے دیا۔

میری تینوں بیٹیاں میری طرف بڑھیں تو میرے ذہن میں چھلکی، ننھی اور اپنے ساتھ کی مٹی ہوئی یادیں پھر سے اُبھر آئیں۔ جدائی اب میری بیٹیوں کے تعاقب میں تھی اتنی واضح کہ اس کے متعلق کسی پیشین گوئی کی ضرورت نہ تھی۔ اللہ نے ان تینوں کی حیا اور عزت رکھتے ہوئے شیطان کو میری طرف بھیج دیا تھا۔ یہ بہرحال ایک قابل قبول معاہدہ تھا۔

ممی نے اپنے بازو میرے گرد حمائل کرتے ہوئے مجھے تسلی دی "اماں میرے متعلق فکر مت کیا کرو، میری زندگی تمہاری زندگی سے بدتر نہیں ہو سکتی۔ میرے لئے یہاں کا معمول کوئی نیا نہیں، میں تو اس کی عادی ہوں۔" جب میں نے اُسے خوش رہنے کے لئے کسی راستے کی تلاش کے لئے کہا تو وہ ہنس دی "میں دنیا جہان کو چھان ماروں گی۔ میں بڑے آرام سے اس کی حویلی سے سفر پہ نکل جایا کروں گی۔"

پھر اُس نے میرا دل چور چور کر دیا "اماں تم نے جو انتخاب کیا تھا اس کے لئے اپنے اندر کوئی احساسِ جرم پیدا نہ ہونے دینا۔ تم نے صرف ناممکن کی جگہ ممکن کو دی تھی۔ تیمڑی میرے باپ کے لئے جائز ہو سکتی تھی، میں نہیں۔ وہ حلال ہو سکتی ہے کہ وہ اس سے شادی کر سکتا ہے، میں تو صرف حرام ہی ہوں۔"

گناہِ عظیم کے لئے کس طرح جواز پیدا ہوئے تھے، میں سوچتی اور پھر دل چاہتا زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ میرے وجود میں تیمڑی کے ہاتھوں کے نہ مٹنے والے لمس کے احساس نے آگ لگا دی۔ میری روح شرمندگی کی آگ میں جل کے سیاہ ہو گئی۔ ممی آگ کو بھڑکائے جا رہی تھی "اماں عیسیٰ اور اس کی ماں جو کچھ کر رہی ہیں اس سے تو یہ بہتر ہے۔ اللہ نے ہمیں اس حشر سے بچا لیا ہے تم ایسا کیوں نہیں سوچتیں؟" میرے لئے بہر حال تحفظ کا کوئی بھی احساس اس وقت تک نامکمل تھا جب تک دیا اور منی بیاہی نہ جاتیں۔

اس سہ پہر جب اماں سائیں سرکش درخت کے نیچے عورتوں کی منڈلی میں براجمان تھیں درمیانی عمر کی ایک بیوہ اور اس کی فرشتہ صورت دو بیٹیوں نے ہجوم میں سے نکلتے ہوئے اسے دہائی دی۔ مجھے فوراً اپنی ماں کے ساتھ پیر سائیں کے سامنے پہلی حاضری کی یادوں نے آ لیا۔

بیوہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ بی بی جی اللہ نے مجھے آپ کے پاس پناہ کے لئے بھیجا ہے۔ میری بچیاں جوان ہو رہی ہیں۔ انہیں مردوں کی ہوس بھری نگاہوں سے بچانا میرے بس کی بات نہیں۔ ہمارا آپ کے سوا کوئی نہیں۔"

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے یہ پیغام دینے کی کوشش کی کہ یہ جگہ ان سب جگہوں سے زیادہ خطرناک تھی جہاں کسی کو اپنی عزت لٹ جانے کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس پہ آنکھیں جمائے میں دل ہی دل میں کہہ رہی تھی فوراً چلی جاؤ، کبھی واپس نہ آنا، نکل جاؤ، اس

سے پہلے کہ شیطان تمہاری بچیوں کو چھین لے چلی جاؤ، لیکن وہ رُکی رہی۔ جب پیر سائیں نے مجھ سے پوچھا کہ "آیا میں بیوہ سے ملی تھی" تو میں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

"لڑکیوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟" حیرت زدہ میں تھرتھرائی "میں نے انہیں غور سے نہیں دیکھا سائیں۔" میرے دل میں اس وقت کوئی نشتر داخل ہوا جب اس نے حکم دیا "آج رات کے لئے اُسے تیار کرو۔ ہاں ہاں بڑی والی کو۔ چھوٹی والی تو میرے لئے بھی بہت چھوٹی ہے۔" میں اس کی بھیانک حسِ مزاح پہ دہشت زدہ رہ گئی، لیکن جب اس نے ہدایت کی کہ تیمڑی کو خبر نہ ہونے دینا، وہ غیر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کر سکتی ہے تو مجھے اماں سائیں کی نصیحت یاد آئی، تیمڑی کو نکال باہر کرنے کے لئے وہ کچھ بن جاؤ جس کے بغیر بن نہ پڑے۔

یہ ممکن تھا لیکن صرف جرم میں ساجھے داری کے ذریعے میں اب سمجھ چکی تھی کہ انسان کی فطرت میں جرم اور گناہ کا خاصا ذخیرہ ہوتا ہے جو حالات کے تقاضوں پہ باہر نکلتا رہتا ہے۔ کچھ لوگوں کے حالات ان کے خوابیدہ ذخیروں سے محض چھوٹے چھوٹے تقاضوں پہ ہی اکتفا کرتے ہیں۔

میرے حالات میرے وجود کی پوری بہیمیت کو آواز دے رہے تھے۔ شیطان میری فطرت کے منفی پہلو کو بھرپور انداز میں چھیڑ رہا تھا۔

میں اپنے خاوند کے جہنم میں جتنی گہری چھلانگ لگا سکتی میری بچت کے مواقع اتنے ہی زیادہ ہوتے، لیکن اس کے اندر کے زہریلے مادے اور ہوائیں بنا کسی وقفے کے مجھے بے قرار اور بے سکون رکھتیں۔

انہی سوچوں میں غلطاں میں نے تینوں نوواردوں کو چائے میں مسکن دوائیں پلا دیں اور سونے کے لئے انہیں سٹور کے عقبی کمرے میں بھیج دیا۔

پیر سائیں خواب گاہ میں ہمارا منتظر تھا اور میں اُن کی طرف جا رہی تھی۔ وہ تینوں ایک ساتھ ڈھیر ہوئی سو رہی تھیں۔ جس بچی کو مجھے لے جانا تھا وہ اپنی ماں اور بہن کے درمیان سوئی ہوئی تھی، سب کو جگائے بنا اسے اُٹھانا ناممکن تھا۔

کھلے فرش پہ جمائے میں اسے بازو سے پکڑ کے اس وقت تک ہلاتی رہی جب تک وہ بیدار نہ ہو گئی۔ مجھے پہچانتے ہوئے اس نے اپنی ماں کو آواز دی۔ "اسے چھوڑو میرے

ساتھ آؤ اور میری ٹانگیں دباؤ۔" میں نے سرگوشی کی۔ نیند میں ڈوبی بچی کسمساتی ہوئی ان کے بازوؤں اور ٹانگوں میں سے نکل آئی۔ میں نے اسے اپنے آگے لگا لیا۔ اس کا بدن ابھی کسی شکل میں نہ آیا تھا۔ وہ تیمیڑی سے بھی چھوٹی تھی شاید بارہ سال کی ہو گی۔

احساسِ جرم نے میرے ذہن پہ دستک دی میں نے ٹھوکر مارتے ہوئے اسے نکال باہر کیا۔ دیا اور منی جوان ہو رہی تھیں اور مجھے اپنی بھیڑوں کے بجائے بیوہ کی بھیڑ کو قربان گاہ کی طرف لے جانا تھا۔

پیر سائیں آلتی پالتی مارے بستر پہ بیٹھا تھا۔ لڑکی نے اس کے پاؤں چھوئے تو وہ ہلکے سے مُسکرا دیا۔ ننھی پری شاید سمجھی ہو خدا کی نظریں اس پہ مہربان ہو گئی تھیں۔ اُس نے جب گلاس اُسے تھمایا تو اس کی آنکھوں میں اظہارِ تشکر ابھرا۔ اس کے پاس اس خوش قسمتی کی اطلاع ماں کو دینے کے لئے انتظار کی تاب نہ رہی تھی۔ میں کڑوی شراب غٹاغٹ چڑھا گئی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ میرے اردگرد کی دنیا کو دھند میں غرق کر ڈالے۔

بچی نے اپنے مشروب کو چکھا۔ وہ اسے پھینکنے کو تھی کہ پیر سائیں دھاڑا "اسے پی جاؤ" اور وہ پی گئی۔ وہ چارپائی پہ لیٹ گیا اور اسے اپنے پاؤں دبانے کو کہا۔ فرش پہ گھٹنے لگائے وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کا پورا زور لگاتے ہوئے اسے خوش کرنے کی کوشش کر رہی تھی، وہ دیا سے چھوٹی تھی۔

اسے قابو میں رکھنے والی میں شیطان ماں تھی۔ مسرتوں کے حصول کے اس عمل کا مزا ختم ہوتے ہی پیر سائیں نے وہیں دراز ہو کے زوردار خراٹے لینا شروع کر دیئے۔ اس کی آواز میں سور کی سی غرغراہٹ تھی۔

میں بچی کو خالی کمرے میں لے گئی جہاں اُس نے شراب کی قے کی۔ بحال ہوتی ہوئی یادداشت اسے لرزا رہی تھی۔ زہر کے گھونٹ کی سب سے بڑی خامی یہی تھی کہ وہ یادداشت کو ختم نہ کر سکا تھا۔ اس نے جو زخم چھوڑا وہ ناقابل برداشت تھا۔ میں نے سیاہ رات کو اپنی مٹھیوں میں بھینچ لینے کی کوشش کی تا کہ اُسے کسی اور وقت میں دھکیل دیا جائے۔

اگلی صبح پیر سائیں نے مجھے بیوہ کو عطیہ دینے کے لئے ایک ہزار روپے دیئے۔ "اور ہاں اس کو کپڑے، گندم اور چینی بھی دینا۔" اللہ کے ننانوے ناموں والی چادر اپنے کندھوں پہ ڈالتے ہوئے اُس نے حکم دیا۔ میں اس دھوکے اور منافقت، اللہ کے پاک نام کے استحصال،

اپنے پردے جو شیطنیت کو چھپائے ہوئے تھا، گناہ کے معمول ہو جانے اور اپنے ہاتھوں میں کراہتی معصوم لڑکیوں کے بدلتے چہروں کا احساس کرتے ہوئے لرز اٹھی۔

بیوہ نے فریاد کرتے ہوئے کہا "بی بی جی میرے مسائل اس قدر ہیں کہ اس رقم سے تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ آپ ہمیں کوئی کام دلا دو۔ ہم سب آپ کو خوش رکھنے میں کبھی تھکیں گی نہیں۔ میری دو جوان بیٹیاں ہیں اور دنیا بڑی ظالم ہے۔ ہمیں آپ کی پناہ چاہیئے۔ خدا کے لئے ہمیں یہیں رہنے دو......"

میں چاہتی تھی کہ وہ یہاں سے فوراً چلی جائیں، لیکن اس سے خوفزدہ بھی تھی کہ اسے فوراً پتہ چل جاتا کہ میں اس کے عیش و عشرت میں حائل ہوئی تھی۔ جب بیوہ نے کہا "بی بی جی میری بیٹی ہر رات آپ کی ٹانگیں دبا دیا کرے گی۔" تو میں شرم سے لال ہو گئی۔ کیا بچی نے اسے بتا دیا تھا؟

ماں، ننھی اور چھٹکی، گُگی کی شادی میں شرکت کے لئے پہنچ گئیں۔ جہیز کا شاندار سامان میرے خاندان والوں کو یہ یقین دلانے کے لئے کافی تھا کہ باقی ہر چیز بھی بے مثال تھی۔ باہر جہاں مردوں کا استقبال تھا، میرے بہنوئی سر جھکائے شاید زمین پہ رینگتے ہوئے پیر سائیں کی خوشامد میں مصروف ہوں گے۔

یہ خزاں کا موسم تھا۔ گگی کا پیلا جوڑا درختوں کے زرد پتوں جیسا تھا۔ جب وہ سرخ جوڑا پہن کے دلہن بن گئی تو میں ایک عورت کو مرد کی قربان گاہ پہ چڑھانے کے احساس سے رو پڑی۔ چھوٹا سائیں اپنی بہن کے بازوؤں میں اسی طرح رویا جس طرح بھائی میرے ساتھ لگ کے رویا تھا۔ راجہ جی مختلف تھا۔ واحد جذبہ یا احساس جسے میں نے اس کے چہرے پہ کبھی ابھرتے دیکھا تھا وہ اس شادمانی کا اظہار تھا جو باپ کے ہمراہ حویلی کے اندر باہر آتے جاتے عیاں ہوتی تھی۔

کیا یہ خوشیوں کا مقام تھا یا سوگ کا موقع؟

میرے خاوند کے گھرانے میں بیٹیوں کی شادی پہ ناچ گانا نہیں ہوتا تھا اپنی بیٹی کے کسی دوسرے مرد کے بستر پہ جانے کو منانا یہاں باعثِ شرم سمجھا جاتا تھا۔

بہنوں اور کزنز میں گھری گُگی اپنے کمرے سے اس سفر پہ نکلی جسے ہمارے بیرونی دروازے کے سامنے ایک اور دیوار کے پیچھے ختم ہو جانا تھا۔ اس گھرانے کی شادی شدہ

عورتوں کو میں نے سوائے کسی تقریب یا مرگ کے کبھی ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی گپّی کب مجھے ملنے آتی۔ اس کے عقب میں چلتے ہوئے مجھے اس بیج کا خیال آیا جو میرے بطن میں پھوٹا اور بڑھا۔ مجھے اس کی پیدائش یاد آئی، وضع حمل کے درد کی ٹیسیں، اُسے میرا دودھ پلانا، عورت ہونے کے خطرات سے اس کا بچاؤ' اپنی کمزوریوں میں اس کا تحفظ' میرا اسے ذہنی شکست خوردگی اور خودکشی کے خلاف کھڑا کرنا اور پرواز پہ نکلنا سکھانا' مجھے یہ سب یاد آ رہا تھا۔ اب وہ مجھے چھوڑ کے جا رہی تھی۔

دیوار کے پاس کھڑے ہو کے ہم دونوں گلے لگیں اور رودیں۔ گپّی کے کندھے سے مجھے چیل نظر آئی جو ٹکٹکی باندھے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کوئی آنسو تھا نہ کوئی مسکراہٹ' اُس نے گپّی کو خداحافظ کہنے کے لئے بھی اپنے بازو نہیں کھولے۔ میری توجہ پھر اپنی بیٹی کے الوداع کے دردناک لمحے کی طرف لوٹ آئی۔ کہنے کو وہ کوئی میل بھر دور ہی تو جا رہی تھی، لیکن میرے لئے یہ فاصلہ بے پایاں ثابت ہوتا۔ جب اس نے چھوٹے سائیں کے ساتھ قدم باہر رکھا اور دروازہ بند ہو گیا تو میرا ایک خوف یقیناً دور ہو گیا۔

اس لمحے میرا جی چاہا میں ناچوں اور گاؤں، لیکن میں نے اپنی بچی ایک پاپی مجرم کے گھر ہی تو بھیجی تھی۔ میرے دل میں آئی کہ بین کرتے ہوئے میں اپنی چھاتی پیٹ ڈالوں اور اپنا دل کاٹ کے باہر پھینک دوں۔

اس رات حویلی کے ہر کونے میں عورتیں سوئی پڑی تھیں اور میری بہنیں بچوں کے کمرے میں سوئیں۔ پیر سائیں کی آمد کے انتظار میں تھکن سے چور میں صوفے پہ ہی ڈھیر ہو گئی۔ "تم نے کوئی دوا دارو چڑھا رکھی ہے؟" وہ چیخا۔ میں نے چھلانگ ماری۔ "یہ مُردوں کی طرح سونے والی رات نہیں ہے' جاؤ اور تیمیڑی کو حاضر کرو۔" میری آنکھیں بھر آئیں۔ مجھے گپّی کا سوال یاد آ رہا تھا' اماں یہ ادھر ہی ختم ہو جائے گا یا تمہیں دیا اور منّی کو بچانے کے لئے بھی یہی کچھ کرنا ہوگا؟ پیاری گپّی اگر مجھے تمہارے اور تمہاری بہنوں کے متعلق کوئی ڈر فکر نہ بھی ہوا تو بھی میں نہیں جانتی جو قدم میں اٹھا چکی ہوں اس کی واپسی کیسے ہو گی۔ میں کیسے انکار کروں گی۔

تیمیڑی کا بستر خالی پڑا تھا۔ میدانِ جنگ میں کھیت رہے سپاہیوں کی طرح ڈھیر ہوئی عورتوں میں میں نے اُسے ہر جگہ تلاش کیا۔ میں سوچ رہی تھی جہنم پورے کا پورا اب اس پہ

ٹوٹ پڑے گا۔ اس کے غیض و غضب کا نشانہ کوئی بھی ہو یہ ناقابل برداشت ہوتا تھا۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ اگر وہ نہ ملی تو اس کی غیر حاضری کو بھی کوئی رنگ دے کے مرا ہی جرم سمجھا جائے گا۔

ننگ دھڑنگ وہ کشتہ ہاتھ میں اٹھائے ہوئے تھا لیکن اس کے پروگرام کا اگلا حصہ غائب تھا۔ سلسلہ ٹوٹ گیا تو وہ غرایا۔ غصے میں اس کا منہ جھاگ چھوڑنے لگا۔ صبر تو اسے چھو کے بھی نہ گزرا تھا۔ میں نے بیوہ کی چھوٹی بیٹی کا نام لیا جس کے متعلق خود اس نے کہا تھا کہ وہ اس کے لئے بھی چھوٹی تھی۔ "لاؤ" وہ چیخا اور میں دوڑی' ڈھیر ہوئے جسموں کو پھلانگتی نیم خوابیدہ ننھی لڑکی کو لئے واپس لوٹی۔ میں نے گپّی کی پہلی رات کے بارے میں سوچا لیکن میرے پاس اس کے بچاؤ کے بارے میں سوچنے کا وقت نہ تھا۔ میری اپنی زندگی داؤ پہ لگی ہوئی تھی۔ پیر سائیں نئی بھیڑ کو دیکھتے ہی پُرسکون ہو گیا۔

کمرے میں دھند چھا گئی۔ خوف کی جگہ بے حسی نے لی پھر وحشت اور دیوانگی نے بے حسی کو بے دخل کر دیا۔ ہم سب آگ کے طوفان میں چکر کھا رہے تھے۔ جہنم کے شعلے لپک رہے تھے' اور ساتھ ہی بھیڑیوں کی چیخیں بھی۔

یہ سب کچھ ایک بار پھر اپنے اختتام کو پہنچا اور میں لنگڑاتی ہوئی بچی کے ساتھ باہر نکلنے کی کوشش میں لگ گئی۔

باب ۸

چھوٹے سائیں

فجر کی اذان کے ساتھ ہی پیر سائیں کی طرف سے تیمیڑی کے لئے بلاوا آیا۔ "تم کہاں تھیں؟" وہ غصّے سے بولا۔ پیشانی سے پسینے کے قطرے ہٹاتے ہوئے وہ ہکلائی "سائیں میں سو گئی تھی، بی بی نے مجھے جگایا ہی نہیں۔"

میں دَھک سے رہ گئی۔ میں اپنے دفاع میں اور وہ اپنے موقف کا اعادہ کرتے ہوئے ایک ساتھ پھوٹ پڑیں۔ ہم دونوں یوں بول رہی تھیں کہ کسی کی بات سمجھ آ رہی تھی نہ آوازوں کی کوئی تمیز رہی تھی، وہ ٹھہرے ہوئے سمندر کی طرح پُر سکون تھا۔

"تم جیسی معذور بیوی میرے مہمانوں کی خاطر داری کیسے کر سکتی ہے، آج رات میں اس معاملے کا حتمی فیصلہ کر دوں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

لڑکی کو تھپڑ رسید کرنے کے لئے میں نے تیزی سے قدم بھرا۔ "مجھے ہاتھ مت لگانا، میں مالک کو بتادوں گی۔" طیش میں جلتے بُھنتے میں نے اُسے اپنے کمرے سے فوراً نکل جانے کو کہا۔ مجھے لباس تبدیل کر کے سینکڑوں مہمانوں کے لئے کھانے کا بندوبست کرنا تھا۔ نئے شادی شدہ جوڑے کو بھرپور قسم کا ناشتہ بھی مجھے ہی بھجوانا تھا۔ میں نے ایک بار پھر لڑکی کے بارے میں خوف اور خدشات کو مسترد کر دیا کہ نہ جانے اس پہ کیا گذری ہو گی، بلکہ یہ وقت تھا کہ میں ماں اور اپنی بہنوں سے مل کر انہیں پیار کرتی' اپنے آنسو پی جاتی اور خوف اور اندیشوں کو چُھپا ڈالتی۔ یہ جاننے کے لئے کہ تیمیڑی رات کو کہاں تھی میرے پاس کوئی وقت نہ تھا۔ نہ ہی مجھے اِسے ثابت کرنے کی کوئی ضرورت تھی۔ مجھے خیال آیا کہ حقائق اُس کو ہی معلوم ہونا چاہیے، لیکن وہ پیر سائیں کو باخبر کیوں نہیں رکھ رہی تھی؟ میں بھاگی بھاگی اماں سائیں کے پاس پہنچی۔ چیل سے بات چیت اور پوچھ گچھ کا اختیار تو انہیں کے پاس تھا۔

میرے میاں کی واپسی سے چند لمحے قبل اماں سائیں نے مجھے بُلا بھیجا۔ "تیمیڑی دھوبن اور اس کی بیٹیوں کے پاس سوئی تھی۔ وہ اس کے وہاں موجودگی کے بارے میں قسمیں اُٹھا رہی ہیں کیونکہ بہت رات گئے تک وہ آپس میں باتیں کرتی رہی تھیں۔"

اس کے پاس اپنی عدم موجودگی کی شہادت اور عذر موجود تھا۔ مصیبت میری راہ

میں کھڑی تھی۔

انتظار نے دہشت کو دُگنا چوگنا کر ڈالا مستقبل پیچھے کو پھلانگتا ہوا حال سے گتھم گتھا ہو گیا۔ "گذشتہ شب کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

میرے ذہن میں تیزی سے ایک خیال آیا۔ ایک معجزہ رونما ہو گیا۔ میں اسے دیکھتے ہوئے مسکرا دی۔ تیمیڑی کی طرح دوپٹے سے انگشت کرتے ہوئے میں نے کہا "سائیں مجھے افسوس ہے، میں تو آپ کے لئے ایک نئی لڑکی کی تلاش میں تھی' تیمیڑی کے پاس اب آپ کو دینے کے لئے کیا رکھا ہے؟"

میری بات بڑھتی گئی اور اس کا غصہ ٹھنڈا ہوتا گیا۔ "جھوٹ؟ میں نے تمہیں جھوٹ بولنے کی کبھی اجازت نہیں دی۔" وہ چیخا، لیکن میں نے طوفان کا رخ بدل دیا تھا۔

اگلی صبح جب میں نے ماں اور بہنوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو میں نے سکھ کا سانس لیا۔ ان کی موجودگی میں ملی سزا یقیناً تباہ کن ثابت ہوتی۔ بھائی کو تو ابھی تک میری خوشیوں کا اعتبار اور یقین ہی نہ تھا۔ یہ امر اس پہ اچھی طرح عیاں تھا کہ ہمارا خاندان میری قیدوبند کی قیمت پہ زندگی کے مزے لے رہا تھا۔

"تمہیں اپنے بھائی کی پریشانیاں ختم کرنے کے لئے کچھ کرنا چاہیے، ماں نے مجھ سے کہا۔ "ہم لوگ جب بھی اللہ کے اس کرم کا ذکر کرتے ہیں جو تمہاری شادی کی بدولت ہم پہ ہوا وہ کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ تمہارے خاوند کے متعلق تو وہ کبھی کوئی بات کرتا ہی نہیں، بلکہ تمہاری بہنوں کی شادیوں کے دوران ہر معاملے سے الگ تھلگ رہتے ہوئے وہ ہمارے لئے بڑی بے عزتی اور شرمندگی کا باعث بنا رہا۔ تم جانتی ہو ہماری کامرانیوں نے ہمارے کتنے نئے دشمن پیدا کر دیئے ہیں۔ اب وہ سب لوگ ہم پہ ٹھٹھا کر کے ہنستے اور ہمارا تمسخر اڑاتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں ہم نے جھوٹ کی ہنڈیا چڑھا رکھی ہے، ہماری واپسی سے پہلے تمہیں اس سے یہ سب باتیں کرنا چاہئیں۔"

مجھے یہ جان کے بڑا دُکھ ہوا کہ بھائی نے تعلیم میں دلچسپی لینا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اس سے پیشتر وہ ہمیشہ کسی ایسے میدان میں مہارت حاصل کرنے کے خواب دیکھا کرتا تھا جو اسے معاشی قوت عطا کرتا اس کے بجائے اس نے ایک دُکان پہ ملازمت کر لی لیکن وہ اس ملازمت میں بھی دلجمعی سے کام نہ کر رہا تھا۔ گھر سے تو وہ رات گئے جب تک ممکن ہوتا باہر

ہی رہتا۔

ماں یقیناً بہت پریشان تھی۔ اس کا اکلوتا بیٹا بگڑ رہا تھا۔ مایوسی کے عالم میں وہ اسے ہر وقت ٹوکتی اور نکتہ چینی کرتی رہتی۔ "جب کوئی لڑکی پیدا ہو تو ہم اُسے اپنے وقار اور عزت کے لئے خطرہ سمجھتے ہوئے ماتم اور واویلے میں لگ جاتے ہیں، لیکن بیٹے کی آمد ہمیں احساسِ تحفظ دیتی ہے اور اُسے ہم جشن کی صورت میں مناتے ہیں۔ میری تین بیٹیوں کے تم اکلوتے بھائی ہو، لیکن تم کیا ہو؟ ڈر خوف، مصیبت اور بے شرمی! تم پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہ گئے۔" وہ اس پر لعن طعن کرتی اور وہ ذلت محسوس کرتے ہوئے کئی کئی دن نظروں سے اوجھل رہتا۔

بھائی خالی کمرے میں آیا تو میں نے اُس کی پریشانیاں کم کرنے کی کوشش کی "بھائی دیکھو تو سہی ہم کتنے خوش نصیب ہیں۔ تمہاری بھانجی کیسے عظیم الشان طریقے سے بیاہی گئی ہے۔ ہماری بہنیں بھی اچھی طرح آباد ہو گئی ہیں۔ اب یہ تم ہی پر ہے کہ ابا کا نام بلند رکھو اور اپنی زندگی ضائع نہ کرو۔ کنبے کا بوجھ تو اب تمہارے کندھوں پہ رہا ہی نہیں۔"

اس کے لبوں پہ مصنوعی سی ہنسی ابھری "آپا یہاں آنکھیں ہیں کسی کے پاس جو کوئی میرے کندھوں کا بوجھ بھانپ سکے۔ یہ لوگ تو صرف اسی بوجھ کو دیکھتے ہیں جو کندھوں سے اُٹھ گیا۔" "تم کیوں پریشان ہو؟ مجھے بتاؤ۔" میں نے پوچھا۔ اس نے اپنا سر سختی سے نفی میں ہلاتے ہوئے جواب دیا "تم پہ پہلے تھوڑی مصیبتیں ہیں جنہیں نظرانداز کرنا ماں کے لئے تو کتنا آسان ہے۔ وہ دُکھ جنہیں ہمارے بہت سے دکھوں کو دور کر کے تم نے اپنے گلے لگالیا۔"

بھائی نرا بابا کی طرح تھا۔

میں اگرچہ اس کے لئے فکرمند تھی، لیکن یہ امر میرے لئے باعثِ اطمینان تھا کہ نہ تو وہ ماں کی طرح لالچی نکلا تھا اور نہ ہی بہنوں کی طرح گول مول اور مبہم، اگرچہ میں اس کے لئے کچھ کرنے کے قابل نہ تھی۔ میں گپی کے لئے کیا کر سکتی تھی؟ یا چھوٹے سائیں کے لئے؟

بھائی چلا گیا۔ کمرہ میرے اندر کی طرح خالی تھا تاوقتیکہ بیوہ کا لالچی چہرہ ظاہر ہوا۔ "بی بی جی ہم تو آپ ہی کے خیر خواہ ہیں۔ ہم دعاگو ہیں کہ آپ کے سائیں کا سایہ آپ اور بچوں کے سروں پہ ہمیشہ قائم رہے۔"

"چھوڑو، چھوڑو میرے پاس تمہارے قصیدے سننے کے لئے کوئی وقت نہیں۔" وہ منہ بسورتی ہوئی بیٹھ گئی۔ وہ میرے قریب جُھکی تو اس کے سانس کی بدبو کے جھونکے میرے

چہرے سے ٹکرائے۔ "تیمبڑی رات کو چھوٹے سائیں کے پاس تھی۔" اس نے سرگوشی کی، "اس نے دھوبن کو یہ جھوٹ بولنے کے لئے پیسے دیئے تھے کہ وہ رات کو اس کے پاس تھی۔"

"لیکن وہ تو ابھی صرف تیرہ ہی سال کا ہوا ہے۔" میرا منہ کھلا رہ گیا۔ اُس نے اپنے ابرو کھینچے "اور وہ صرف چودہ سال کی ہے۔ کیا یہ اس کے لئے اچھا نہیں کہ کسی بوڑھے کے بجائے کوئی جوان ساتھی ملے۔" "یا اللہ ہم پہ رحم کر، میں نے دل ہی دل میں دعا کی اگر پیر سائیں کو پتہ چل گیا تو وہ چھوٹے سائیں کو ہلاک کر دے گا۔"

"اور کون جانتا ہے؟ تم اس کے متعلق کسی سے بات نہ کرنا، کیا چیل کو اس کی خبر ہے؟ تمہیں کس نے بتایا؟" میں نے پوچھا۔ اس نے سودا بازی ہوتے دیکھ لی تھی اور پھر تیمبڑی کو چپکے سے میرے بیٹے کے کمرے میں جاتے ہوئے بھی۔

میں موت اور اذیت کے ایک وار سے بچتی تھی تو دوسرا تیار ہوتا تھا۔ میری تمنا تھی کہ دور کہیں دفن ہو جاؤں، لیکن مجھے اپنے بیٹے کو بچانا تھا۔ بیوہ اس معاملے کی پردہ پوشی کے سلسلے کی دشواریوں کا ذکر کر رہی تھی۔ بڑے طریقے سے مجھے بلیک میل کرتے ہوئے وہ رقم اینٹھنے کی کوشش میں تھی۔ میں نے اسے ہزار روپے دیئے، لیکن اس کے نزدیک یہ بہت تھوڑی رقم تھی۔ میں نے اسے پانچ سو مزید دیئے۔ مجھے احساس تھا کہ یہ سودا بازی مسلسل جاری رہنا تھی۔ میرے گھر کے اوپر اُمڈتے خطرات اس کی نگاہ میں تھے۔ میں سوچتی رہی کیا اسے اپنی بیٹیوں کے جسموں میں ہونے والی تبدیلیوں کی خبر تھی؟ یقیناً اُسے اِس کی خبر بھی تھی۔ اس تصور نے میرے ایک اور ماں کو دھوکہ دینے کے احساسِ جرم کو دھندلا دیا، اگرچہ ساتھ ہی مجھے یہ احساس بھی رہا کہ ہم غریب غرباء اور ضرورت مندوں کا استحصال کرنے کے عادی تھے۔

میرے بلانے کے دو گھنٹے بعد چھوٹا سائیں آ پہنچا، اگرچہ وہ پہلے سے ہی دوسروں کے مقابلے میں اپنے باپ سے زیادہ خوفزدہ رہا کرتا تھا، لیکن اس کی آمد تک میں نے اسے مزید خوفزدہ کرنے کے لئے سینکڑوں راستوں پہ غور کیا۔

آستانے کے وجود کو برقرار رکھنے والے ظالمانہ نظام کے مقابلے میں میرا یہ بیٹا ازحد نرم دل اور کمزور تھا۔ کسی ملازم کی پٹائی ہو رہی ہوتی تو وہ راجہ جی کے برعکس چیخنا چلانا شروع کر دیتا۔ بالآخر سزا کے طور پہ اسے زنان خانے بھیج دیا گیا۔ کچھ عرصہ وہ وہاں خوش د

خرم رہا، لیکن پھر نظر میں آجانے پر اسے واپس اپنے باپ کی دنیا میں گھسیٹ لیا گیا۔ پیر سائیں کی طرف سے ہر آزمائش اور امتحان میں ناکام رہنے کے نتیجے میں خوف اور دہشت اس کے رنگ ڈھنگ کا سب سے نمایاں پہلو ہو گیا تھا۔ چھوٹا سائیں وہ ستارہ تھا جو ٹوٹ گیا، وہ سورج جو ڈوب گیا تھا اور وہ ماہِ ناتمام جسے کبھی مکمل نہ ہونا تھا۔ خوشیوں اور مسرتوں کا موقع دکھ اور افسردگی میں ڈوب گیا تھا۔ اس کی زندگی کے دُکھ درد مجھے کھائے جا رہے تھے۔ انہیں کم کرنا میرے بس میں نہ تھا اسی طرح جیسے اپنے بچے کے مزاج اور طبیعت میں کوئی تبدیلی لانا میرے لئے اب ناممکن تھا۔ سچ تو یہ ہے میں ایسی کسی تبدیلی کے حق میں ہی نہ تھی۔

وہ بابا جی کی طرح تھا۔ میری دعاؤں کی باریابی کا ثبوت، لیکن مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح اپنے بیٹے کو بھی بچانا تھا۔ میں نے اُسے اپنے قدموں میں بٹھاتے ہوئے کہا "تمہاری زندگی پہ پڑنے والے بوجھ میرے ہی بوجھ ہیں۔ میں اُن سے نہ اپنے آپ کو بچا سکی نہ تمہیں۔" اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں کتنی افسردگی تھی "شاید راجہ جی کے علاوہ کوئی دوسرا تمہارے باپ کے معیار پہ پورا نہیں اتر سکتا۔"

"لیکن تمہیں کسی شے سے شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم نرم دل ہو لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تم کمزور ہو۔ تم ان ساری قوتوں کے مالک ہو جن کے مالک بابا جی تھے، جو خدا کو پسند ہیں۔ قدرت کے اس عطیے کو اسی کی راہ میں استعمال کرنا سیکھو۔ تمہیں یہ سب کچھ اس گھرانے میں رہتے ہوئے ملا ہے جہاں اللہ کی فرمانبرداری ایک دور کا خواب رہی ہے۔"

میرے بیٹے کو میری باتیں سُن کے یقیناً بہت حیرانی ہوئی، لیکن اگر وہ خطرے میں نہ ہوتا تو شاید میں کبھی اُس سے ایسی باتیں نہ کرتی۔ "تمہاری زندگی اللہ کی راہ میں وقف ہو جانی چاہیے، شاید کسی روز تم ہی وہ پیر بن جاؤ جس کے لوگ منتظر ہیں لیکن اپنے باپ کی راہوں سے دور رہنا۔ ان لوگوں کے راستوں سے بھی دور رہنا جو اس کے قدموں میں کتوں کی طرح لوٹتے پوٹتے رہتے ہیں۔"

وہ میری باتوں کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ اس معصوم بچے کا ارادتاً بھٹک جانا میرے لئے ایک معمہ تھا۔

"اپنے باپ کے غیض و غضب کا شکار ہونے سے بچو۔" میں نے اُسے خبردار کیا۔

"ان عورتوں سے پرے رہو جنہیں اُس نے گھر میں ڈال رکھا ہوا ہے اگر اُسے کبھی بھی یہ پتہ چلا کہ تم بیاہ سے پہلے کسی اور عورت کے قریب ہو رہے ہو تو وہ تمہیں قتل کر ڈالے گا۔"
چھوٹے سائیں کا بدن تن سا گیا۔

کیا اس کا سادہ لوح ذہن اس عمل کے نتائج بھلا بیٹھا تھا؟ کیا اسے یاد دہانیوں کی ضرورت تھی؟ کیا فضا ہر وقت خبردار رہو، ہوشیار رہو، کی تنبیہ سے اٹی نہ رہتی تھی؟

"جس لڑکی کو تم اپنے بستر میں لے گئے تھے وہ تمہارے باپ کی ساتھی ہے۔" میں نے سختی سے کہا۔

"جس عورت کو تم نے پیسے دیئے کسی نے اسے دیکھ سُن لیا تھا۔" اب وہ پسینے میں شرابور ہو گیا۔ لڑکی کو الزام دیتے ہوئے وہ رو پڑا "میں نے کسی کو پیسے نہیں دیئے۔ وہ تو خود میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور زبردستی میرے کمرے میں آ گھسی تھی۔ اللہ کی قسم میں نے اسے باہر نکالنے کی کوشش کی تھی۔ اُس نے مجھے قابو کر لیا۔ میں تو کبھی بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ وہاں ہوتی۔"

تصدیق ناممکن تھی۔

میں نے اسے اطمینان دلایا "اب تو میں نے اس معاملے کو طے کر دیا ہے۔ تم نہیں جانتے اگلی دفعہ کون تمہاری شکایت لگائے گا۔ پیر سائیں کی نگاہِ التفات کے حصول کی خاطر کوئی پھر اسے تمہاری باتیں بتا سکتا ہے۔ کوئی اور لڑکی بھی ایسی حرکت کر سکتی ہے۔ اللہ تمہیں صرف اسی صورت اپنی پناہ میں رکھے گا اگر تم ایسا چاہو گے۔"

شرمندگی سے نظریں چھپائے چھوٹا سائیں میرے پاؤں چھوتے ہوئے باہر نکل گیا۔ میں خاموش بیٹھی یہ سوچتی رہی کہ جس گھر کی بیٹیاں اپنے باپ کی بُری نگاہوں سے محفوظ نہ ہوں اس گھر کے لڑکوں کو شرم و حیاء اور اپنی عزت کی حفاظت کا سبق کیسے دیا جا سکتا تھا۔

کم از کم گُپی کی شادی تو مبارک ثابت ہوئی تھی۔ اس کا میاں ایک ایسا کاہل الوجود انسان تھا جس کے شب و روز کھانے پینے اور اپنے خوشامدیوں سے گپیں ہانکتے یا لطیفے سنتے گذر رہے تھے۔ وہ رات کو نشے کی حالت میں لڑکھڑاتے ہوئے خواب گاہ میں داخل ہونے کے بعد کبھی کبھار ہی اپنی بیوی کی طرف بڑھتا۔ گپی کے اقرار کے بجائے انکار پہ شاید وہ زیادہ سکون محسوس کرتا تھا۔ گپی اس کے بجائے اس سے بیرونی دنیا کی تصویروں کے تقاضے کرتی۔ کبھی

کبھی وہ سوچتا وہ نری دیوانی ہے، لیکن اُسے اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ وہ ان تصویروں میں کیوں گم رہتی تھی، جن کے درختوں، پھولوں اور فیروزی سمندروں سے اس کی نگاہیں ہٹائے نہ ہٹتیں۔

مَردوں کی تصویریں، اُن کی آوازیں اور سائے یہاں نہ صرف ممنوع تھے، بلکہ ان کا ذکر بھی ممکن نہ تھا۔ گپی کو یہ کہتے ہوئے سُنا گیا تھا کہ میں کسی مرد کو برداشت نہ کروں گی۔ میرے لئے تو پھول اور پودے ہی کافی ہیں۔

جہاں تک میرا تعلق ہے دن اور رات کی طرح میں تو دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔

جب تینوں لڑکیوں پہ یہ راز کھلا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ ایک ہی بستر پہ تھیں تو وہ کچھ دیر کے لئے حیران و ششدر ہوئیں، لیکن مالک کی اطاعت میں شرمندگی سے نجات تھی۔ ہر رات میری روح جہنم میں اترتی، ہر صبح چھوٹے سائیں کی تلاوت قرآن کا پیغام سنتے ہوئے وہ اس سے نکل آتی۔ میں یک گونہ بے خودی کے عالم میں اپنے آپ کو کئی رات کے گناہوں سے پاک کرنے چل نکلتی۔ جائے نماز پہ اللہ کے سامنے کھڑے کھڑے میں اس سے یہ جاننے کے لئے التجائیں کرتی کہ گناہ کس کا تھا؟ میرا؟ اس دنیا کا مالک کون تھا؟ وہ ہی تو تھا؟

پیر سائیں کو چھوٹے سائیں کے جرم کے بجائے یہ خبر ملی کہ ان کا یہ بیٹا ایک سچا بزرگ تھا۔ ساتھ ہی ہر طرف یہ شور اٹھا کہ باباجی کا حقیقی وارث ظاہر ہو گیا تھا۔ وہ لوگوں کو جس طرف کا اشارہ دے رہا تھا میرے خاوند کے لئے انہیں اس طرف جانے سے روکنا ممکن نہ تھا۔ باپ بیٹا دونوں اللہ کے نام پہ بول رہے تھے۔ دونوں کتابِ مقدس میں سے ہی آیات اور سورتوں کی نشان دہی کر رہے تھے۔ دونوں زعفران کی سیاہی میں تعویز لکھ رہے تھے اور دونوں ہی ان ہجوم پہ دم کئے جا رہے تھے جو ان کے پاس اکٹھے ہوتے، لیکن ایک مزار پہ کسی بادشاہ کی طرح بیٹھتا تھا تو دوسرا برگد کے درخت تلے کسی فقیر کی طرح بیٹھا ہوتا۔ ایک شاہانہ وقار سے چلتا لیکن دوسرا خاموشی کے ساتھ آتا جاتا۔

باباجی کے درخت تلے ہجوم شروع ہو گیا۔

بے سکون گھر سیاست کی نذر ہونے لگا۔ میرا میاں گھر لوٹتا تو پہلے سے کہیں زیادہ غیظ و غضب سے بھرا ہوا اور پھر وہ مسلسل گرجتا برستا ہی رہتا۔ اب تو چھوکریاں بھی اس کی توجہ کا مرکز نہ رہیں۔

ایک شب میں جائے نماز پہ تھی کہ اچانک اذیت ناک چیخ و پکار فضا میں بلند ہوئی۔

میں تیزی سے اُٹھتے ہوئے کھڑکی کی طرف لپکی اور وہاں جیسے منجمد سی ہو کے رہ گئی۔

باہر کھڑکی کے فریم میں کوئی سایہ لہرایا۔ عورتیں درخت کے پیچھے چھپی کھڑی تھیں۔ کسی ادھ کھلے دروازے سے مجھے کوئی ہاتھ دکھائی دیا جو اسے تھامے ہوئے تھا، کوئی سایہ باورچی خانے کی جالی کے پیچھے معدوم ہوتا ہوا کسی کھڑکی کی دوسری سمت سے جھانکتی ہوئی کسی کی آنکھیں، کپڑوں کے گھیراؤ سے باہر نکلے ہوئے کسی کے پاؤں۔

چھوٹے سائیں کو رسوں کی مدد سے سرکش درخت سے جکڑ دیا گیا تھا۔ کبجی کے چابک اس کی ننگی پیٹھ کو ادھیڑے جا رہے تھے۔ کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ میرے بیٹے کی مدد کو آتا۔ کسی میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ وہ میرے خاوند کو روکتا۔

پیر سائیں کے انتقام کے زہر کی آگ اس وقت بجھی جب چھوٹے سائیں کی اذیت ناک چیخیں تھم گئیں۔ میں نے اُسے اُس جگہ سے جاتے ہوئے دیکھا۔ نوکرانیاں اپنی اپنی پناہ گاہوں سے نکلتی چاروں طرف سے لپکیں۔ میرے دیکھتے دیکھتے انہوں نے چھوٹے سائیں کو رسوں کی گرفت سے آزاد کیا، کسی نے اُسے کمبل میں لپیٹا، کسی نے پانی کے چھینٹے مارے۔ وہ سب دعائیہ لہجے میں بڑبڑا رہی تھیں۔

"ہیر" میرا میاں چلایا اور میں کھڑکی سے ہٹ کے بھاگی "تمہارے بیٹے میں اتنی جرأت؟ اس نے تیمڑی سے زنا کیا ہے۔" اس نے قالین پہ تھوکا اور میرا دل ڈوبتا چلا گیا۔ "دفع ہو جاؤ" اُس نے حکم دیا اور میں قدم ناپتی دروازے کی طرف بڑھی۔ میرے عقب میں دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور اب میں کسی ماں کی طرح دوڑ پڑی۔

چھوٹا سائیں اوندھا پڑا ہوا تھا اور اس کی کمر کے گرد ایک کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ میں نے اس کمرے میں بہت سی چھوکریوں کو یونہی پڑے دیکھا تھا۔ اس کی زخم آلود کمر پر اس کے باپ کے جنون کا نقشہ اترا ہوا تھا۔ اسے خون کی قے آئی تو اُسے ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔

اس روز اذانِ فجر اس امر کی گواہی دے رہی تھی کہ میرے بیٹے کو اپنے دفاع کا کوئی موقع نہ ملا لیکن اس کے باوجود ہر طرف اس کے تیمڑی سے زنا کا چرچا پھیلا ہوا تھا۔ تیمڑی نے قرآن کی قسم اٹھا کے کہا تھا کہ چھوٹا سائیں اسے کھینچتا ہوا اپنے کمرے میں لے گیا تھا، جہاں اس نے اسے خواب آور دوا دے کے اس سے زیادتی کی۔ لوگوں کو پیر سائیں کے

کھیل کی سمجھ آئی کہ نہیں یہ کوئی اہم بات نہیں تھی۔ اصل بات تو یہ تھی کہ میرے خاوند نے اپنے خلاف سر اُٹھاتے خطرے کو کچل ڈالا تھا۔

تیمھڑی اب اماں سائیں کے نزدیک ایک چڑیل بن گئی تھی، اسے سزا دینا توان کے بس میں نہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے نوکرانیوں کے ذریعے اس دھمکی پہ ہی اکتفا کیا کہ وہ ان سے دور رہے، اگر کہیں سامنے آگئی تو اس کا منہ توڑ دیا جائے گا۔ بارہ سالہ راجہ جی نے بڑے فخر و مباحات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے باپ کے پہلو میں بھائی کی جگہ سنبھال لی۔ میں اسے کیا الزام دیتی، اس کی تربیت ہی ایسی تھی۔

چھوٹا سائیں دو ماہ تک ہسپتال میں بے ہوشی کے عالم میں ہی رہا۔ وہ واپس آیا تو کسی کام کا نہ رہا تھا۔ اب وہ باباجی کے بڑھ تلے چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ اس کے باپ کو تو کیا پریشانی ہوتا تھی، میں بھی یہ سوچ کے چپ ہو رہی کہ شاید خدا نے ہی وہ سکوت اس کا مقدر کر دیا تھا، جس کی زبان صرف میں ہی سمجھ سکتی تھی۔

میں تیمھڑی کے خلاف نیلی پیلی ہو رہی تھی، لیکن میرا میاں اب مکمل طور پہ اس کے تسلط میں آچکا تھا۔ دوپہر سے غروب آفتاب تک، عشائیے کے بعد اور پھر شب بھر دونوں ایک ساتھ ہوتے۔ وہ ہر وقت اس کے پاس ہوتی۔ بیوہ کی دونوں بیٹیاں مسلسل باورچی خانے اور حجرے کے درمیان بھاگتی دکھائی دیتیں، یا تو وہ کچھ لا رہی ہوتیں یا لانے جا رہی ہوتیں۔ گھر کا کاروبار اب بستر سے ہی چل رہا تھا۔ ہماری طرف سے بندوبست میں کوئی سستی یا ڈھیل عشرت کدے کو قتل گاہ میں بدل دیتی۔

اماں سائیں بوڑھی اور کمزور تو تھیں ہی اب وہ چھوٹے سائیں کے لئے بہت غمگین رہنے لگیں۔ حویلی اپنے منتظم سے محروم ہوگئی۔ اس کا بندوبست اب ویسا نہ تھا جیسا میرے آنے کے موقع پر تھا۔ باورچی خانہ اور کمرے اب صاف ستھرے نہ رہے تھے بلکہ اب اُن کا حال بھی مالک سا ہی تھا۔ میرے ناخنوں کی سرخ پالش گھر کے صحن کی طرح بدحال دکھائی دیتی۔ دالان کی اُکھڑی ہوئی مٹی کے پاپڑ پاؤں تلے چرچراتے تو نیل پالش ناخنوں سے اُتر اُتر جاتی۔

پیر سائیں کے ذاتی معاملات اور ان کی دیکھ بھال توجوں کی توں تھی، لہٰذا معیار کی یہ گراوٹ کسی کو محسوس ہوئی نہ اس کا کوئی فوری ردِعمل ہوا۔ جنسی اشتہا میرے میاں کے سر پہ بری طرح سوار تھی۔ کمرے میں ہر وقت جنس، شراب اور مُشک کی گہری باس پھیلی ہوئی ہوتی۔

میری الماری کے سب ہی قابل نفرت کپڑوں میں یہی بو رچی بسی ہوئی تھی۔ میں نہاتی تو پانی سے یہی بو اُٹھتی، میں جس تولیے سے بدن خشک کرتی وہ بھی ایسا ہی ہوتا۔ میں اپنے جوتے ناک کے قریب لاتی تو ان سے بھی وہی گاڑھی بو آ رہی ہوتی۔ میں اسی بو میں سانس لے رہی ہوتی۔ میرے بالوں، میرے ہاتھوں، حتیٰ کہ میری سانسوں میں بھی یہی بو تھی۔

پیر سائیں بات کرتا تو صرف جنس کے متعلق، اگلے "معرکے" کی منصوبہ بندی یا پچھلے کے متعلق تبادلہ خیال، کسی نئے طریقے کے متعلق میرا خیال پوچھتے ہوئے یا گذرے ہوئے کے اثرات کے بارے میں یا آج کے جنسی عمل کا کل والے کے ساتھ تقابل کرتے ہوئے حتیٰ کہ میری زندگی صرف اسی ایک عمل تک محدود نظر آنے لگی۔ میرا صرف ہاں یا ناں میں جواب اسے کبھی نئے طریقوں پہ سوچ بچار اور اُن کے اظہار سے باز نہ رکھ سکا۔

کسی جنگلی کتے یا پاگل بھیڑیئے کی طرح وہ ڈھیروں گوشت کھا جاتا، گاڑھے دودھ کے کئی جگ چڑھا لیتا، دہی کے کئی پیالے چٹ کر جاتا اور درجنوں آم ہضم کر جاتا۔ وہ حاملہ سؤرنی کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ جنسی طاقت کے لئے وہ کشتے یوں نگلتا کہ وہ جنس کے علاوہ اس کے ذہن سے زندگی کے باقی سب ہی پہلوؤں کا صفایا کر دیتے، پھر اس کے جذبات وحشت اور دیوانگی کو چھو رہے ہوتے یہاں تک کہ وہ بجھی ہوئی پیاس والے کسی شیطان کی طرح ڈھیر ہو جاتا اور پھر یوں لگتا کہ کچھ دیر کے لئے زندگی اُس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔

میرا خیال تھا وہ اپنا ذہنی توازن کھو رہا تھا۔ اب تو اس کی نمازیں بھی چھوٹ جاتی تھیں۔ کسی کسی روز تو وہ کمرے سے نکلتا ہی نہیں تھا اور وہ دن تو کسی پہاڑ کی طرح ہوتا جو کٹ نہ رہا ہو۔ پیر سائیں کو مشغول رکھنا ناممکن تھا۔ بوریت کے پہلے آثار کے ساتھ ہی اس کے صبر و ضبط کے بند اگر کوئی تھے تو ٹوٹ جاتے۔ اس کی دلچسپی کے اسباب مہیا کرتے کرتے اور پھر اسے اُن میں لگائے رکھنے کے لئے میں ایک خوفناک صورتِ حال سے دوسری میں ابھرتی ڈوبتی رہی۔

شہر سے نئے ملبوسات آپہنچے۔ تیمھڑی چست کالی پتلون، سفید شفاف بلاؤز اور اونچی ایڑی کی جوتی پہنے ڈریسنگ روم سے نکلی۔ اس کے بالوں میں ایک بڑی سنہری کمان لگی ہوئی تھی۔ وہ بڑی عجیب لگ رہی تھی اور شاید اُسے اِس کا احساس تھا جب ہی تو وہ اس تک پہنچتے پہنچتے کئی بار لڑکھڑائی اور ڈگمگائی۔ میری شکل و صورت تو بگڑ ہی چکی تھی۔ میرا وجود وہ کہاں

رہا تھا جو کبھی تھا۔ گھٹنوں سے اوپر ایک تنگ و چست سرخ قمیص میرے بڑھتے ہوئے پیٹ کو کہاں تک چھپاتی اور میں مالک کے حکم کی تعمیل میں کمرے کے اندر بھاگتی پھرتی۔ غلامی میں کوئی گنجائش نہ تھی۔

اگرچہ میں پانچوں وقت اللہ کے سامنے جھکا کرتی تھی لیکن یہ تو محض ایک رسم سی تھی۔ میرے قبلہ رخ ہونے کا باعث کیا تھا؟ میں اس سے بے خبر تھی۔ میرا رخ تو میرے خاوند کی طرف ہی ہونا چاہیے تھا۔

بھائی کو نئی ملازمت ملی تو وہ مٹھائی لیے مجھے ملنے چلا آیا، لیکن اسے دروازے کے باہر پردہ دیوار کے پیچھے ہی روک دیا گیا۔ پیر سائیں نے کمرے سے باہر نکلتے نکلتے اپنے دھلے ہوئے رومال پہ کوئی مادہ چسپاں محسوس کیا اس نے اس پہ اپنی زبان پھیری اور ساتھ ہی اس کے چہرے پہ ایک لمحے کے لیے جیسے سیاہی پھر گئی۔

"یہ کیا ہے؟" اُس نے مجھے پوچھا۔ مجھے کیا خبر ہو سکتی تھی؟ میں نہ تو اسے چھونے کی جرأت کر سکی اور نہ ہی مجھ میں اتنی ہمت تھی کہ میں اس کے بارے میں کوئی سوال کرتی۔ اس کا ہیرے موتیوں جڑا ہاتھ پڑا اور میں چکراتی ہوئی برآمدے میں جا گری۔ ایک ٹھڈے نے مجھے صحن میں جا پھینکا اور دوسرا مجھے اس کے عین درمیان لے آیا۔

میں نے اوپر دیکھا...... مجھے بھائی کا چہرہ دکھائی دیا جو غائب ہو گیا ایک ماہ بعد میں نے سُنا کہ وہ اعصابی شکست و ریخت کی بدولت ہسپتال میں تھا۔

انہی خوفناک اور اذیت بھرے لمحات میں گُمی اپنے پہلے بچے کی پیدائش کے لئے حویلی میں آئی۔ کم از کم وہ اتنا خوش تھی کہ مجھے کہہ سکے، میری دنیا خوشیوں کے وجود اور پھیلاؤ کے لئے تو محدود اور تاریک ہی ہے، لیکن اتنی سیاہ نہیں کہ موت کی تمنا کی جائے۔ میں نے افسردگی کے عالم میں اضافہ کرتے ہوئے کہا "زندگی یا تو ساکت ہوتی ہے یا طوفان کی طرح بپھری ہوئی۔ تمہاری اول الذکر کے مانند ہے اور میری آخر الذکر کی طرح۔ جب اپنے آپ کو سنبھالا نہ دیا جا سکے تو زندہ رہنے کے لئے انسان کو لہروں پہ سوار ہو جانا چاہیے، لیکن ڈوب جانا یقیناً سرکش لہروں پہ سواری سے آسان تر ہے۔"

چھوٹا سائیں جو ہر ذی روح سے دور ہو چکا تھا، مقناطیس کی طرح گُمی کے نومولود کی طرف کھنچا چلا آیا۔ اُسے اپنے بازوؤں میں جھولا جھلاتے ہوئے وہ گھٹنوں چوکور صحن کے چکر

لگاتا رہتا۔ وہ میری ہی طرح اپنی دنیا کو دوسروں کی دنیا کے مانند گولائی میں کرنے کے لئے کتنا بے تاب تھا۔ گُمی اپنے بھائی کو دیوانوں کی طرح دائرے میں چکر پہ چکر لگاتے ہوئے دیکھتی اور پھر رو پڑتی کہ اسے کیا ہو گیا تھا، لیکن میں یہ سوچ کے کپکپا جاتی کہ اگر وہ باباجی کے بجائے اپنے باپ پہ گیا ہوتا تو اس کا کیا بنتا۔

چھوٹا سائیں کبھی کبھی ہمارے لئے کھیتوں سے مکئی کے بھٹے یا قبروں سے مرجھائے ہوئے گلاب اُٹھا لاتا، لیکن باپ پہ نظر پڑتے ہی وہ بھاگ اُٹھتا۔ تھکا ہوا اور بے دم وہ گھر سے میلوں دور کہیں کسی کونے میں گھس بیٹھ کے سردی میں ٹھٹھرتا رہتا۔

چھوٹے سائیں کی حالت زار سے اپنی اور گپی کی توجہ ہٹانے کے لئے میں نے اس سے میسنی کا احوال دریافت کیا۔

"اس کی ماں اُس سے اتنی ہی نفرت کرتی ہے جتنا اس کا باپ اس سے پیار کرتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "چونکہ میسنی کو باپ کی قربت حاصل ہے لہٰذا اس کی کوئی پوچھ پرتال نہیں۔ لوگ کہتے ہیں اس نے باپ کو قبضے میں رکھنے کے لئے اس پہ کالا جادو کر رکھا ہے، لیکن اس کی ماں کا کہنا ہے کہ مرد کو دعوتِ گناہ دینے والی کسی چڑیل کو کالے جادو کی کیا ضرورت تھی؟"

گُمی اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے توبہ توبہ کر اٹھی۔ "اماں اسے پتہ ہے کہ سب لوگ جانتے ہیں پھر بھی اسے کوئی شرم و حیا نہیں۔" میں نے گپی سے پوچھا کہ آیا اس کے خاوند نے کبھی اس معاملے میں اس سے بات کی تھی تو اس نے جواب دیا "ایک بار میں نے اس سے اس کا ذکر کرنے کی کوشش کی تھی تو اس نے مجھے اتنا سخت تھپڑ مارا کہ پھر میں نے اپنی زبان سی ڈالی۔ ایک ماہ تک تو میں کچھ کھا بھی نہ سکی تھی۔"

تھوڑا سا وقت جو گُمی اور مجھے اپنی باتیں کرنے کو مل سکتا تھا ایک اور کہانی کی نذر ہو گیا جو ان دنوں ہر چھوٹے بڑے کی زبان پہ تھی۔ پیر سائیں کی کراماتی دعاؤں کے طفیل کسان کے دو بیٹوں سے بیاہی، دو بہنوں کے گھر پیدا ہوئے مہاراجہ اور مہارانی کی کہانی کسی سنسنی خیز فلم کی کہانی کی طرح حویلی میں سنائی جا رہی تھی۔ مہاراجہ اور مہارانی جنم دن سے ہی آپس میں منسوب تو ہو ہی چکے تھے، اب ان کی شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی اور دونوں گھرانے پیر سائیں کی دعائیں لینے آستانے پر پہنچے۔ غیر متوقع طور پر اس نے اپنی دعائیں دینے سے انکار

کر دیا۔

پیار کرنے والی جوانیوں کے دل ٹوٹ گئے۔ ان کی مائیں صبح شام حاضر ہونے لگیں "سائیں کرم کرو، ہماری حاضریاں، ہمارے نذرانے قبول کرلو۔ خدا کے لئے ہمیں بتادو آپ کی رضا نہ ملنے کا سبب کیا ہے؟" انہوں نے منتیں اور ترلے کئے، لیکن پیر سائیں نے اپنا حتمی فیصلہ سناتے ہوئے کہہ دیا "میرے لئے اس سے بڑی ناراضگی اور کوئی نہ ہو گی۔ یہ شادی بربادی ثابت ہو گی۔"

چند روز بعد ہم نے سُنا کہ وڈی مکانی، جو مہاراجہ کی ماں تھی اپنا برقعہ پیر سائیں کے قدموں پہ اتار پھینکتے ہوئے سب کے سامنے یہ کہتے ہوئے رو پڑی "سائیں اس معاملے نے ہمارے پورے کنبے کو بدحال کردیا ہے۔ خوشیوں سے بھرے گھروں میں غم اور اداسیوں نے ڈیرے ڈال دیئے ہیں، خدا کے لئے سائیں ہم سے راضی ہو جاؤ، اپنی دعائیں ہمارے شامل حال کردو۔ کرم کرو اور ہماری تمنائیں پوری کردو۔" لیکن اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے اس نے اُسے اپنے سامنے سے ہٹا دیئے جانے کا حکم دے دیا۔

چند روز بعد ہم نے سُنا وہ روتی پیٹتی زبردستی اس کے کمرے میں گھس گئی اور ایک بار پھر اس کی منتیں کرنے لگی "میرا بیٹا جو تم نے مجھے عطا کیا تھا بیمار پڑ گیا ہے۔ نہ وہ کچھ کھاتا ہے نہ کسی سے کوئی بات کرتا ہے۔ سائیں، خدا کے لئے اس رشتے پہ راضی ہو جاؤ۔" جب پیر سائیں بضد رہا تو وڈی مکانی نے اس سے اس کی وجہ پوچھنے کی جسارت کی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ جب تک وجہ نہ بتائی گئی وہ کمرے سے نہیں نکلے گی۔ وہ دن بھر وہیں رہی یہاں تک کہ پیر سائیں اس کے اصرار سے تنگ آتے ہوئے غصّے میں اُسے ایک طرف لے گیا۔

پھر جلد ہی ہم نے سُنا کہ کہانی نے نیا موڑ لیا تھا۔ مراثن نے دائی کو بتایا کہ پیر سائیں کی بات نے مکانی کو بھی قائل کرلیا کہ یہ شادی ناممکن تھی۔ اب اگرچہ اس کا خاندان اپنے بچوں کی خوشیوں کے لیے پیر سے تعلق توڑنے کو تیار ہو گیا تھا، لیکن وڈی مکانی نے انہیں خبردار کرتے ہوئے ڈرادیا ہے کہ اگر انہوں نے پیر سائیں کی بات نہ مانی تو تباہی آ کے رہے گی۔ انہیں وہ دونوں بچے پیر سائیں نے ہی دیئے تھے اور اس کی حکم عدولی گناہِ عظیم اور بڑی حماقت ہوتی۔

ہم نے سُنا کہ مہاراجہ نے مہارانی کو اس کے ساتھ بھاگ نکلنے کو کہا تھا لیکن وہ پیر

کی پیشین گوئی سے خوف زدہ تھی۔ پھر ہم نے سُنا اس نے خودکشی کی دھمکی دی۔ اس کی ماں کا دل پھر بھی نہ پسیجا اور اس نے اسے جواب دیا کہ "تم مر بھی جاؤ تو ہمیں پیر سائیں کی حکم عدولی نہیں کرنا۔"

گُھی اور میں حیران تھیں کہ پیر سائیں نے آخر اجازت دینے سے انکار کیوں کیا تھا۔ اس نے وڈی مکانی کو کیا بتایا تھا۔ گُھی کا خیال یہی تھا کہ اس کے باپ کو اس میں بدشگونی نظر آئی تھی۔

میرا خیال مختلف تھا۔ "تمہارے باپ کے پاس بدشگونیاں دیکھنے کی طاقت کہاں ہے؟ میرا خیال ہے یہ سوائے اپنا غلبہ برقرار رکھنے کے اور کچھ نہیں۔"

دائی کا اپنا خیال تھا "بی بی جی مالک کی دعاؤں نے ہی تو یہ بچے ان کی ماؤں کو عطا کئے تھے۔ اب ان کے مقدر کا ہر فیصلہ بھی تو اسی کے پاس ہونا چاہیے۔" جیسے ماں نے میرا فیصلہ کیا تھا، مجھے خیال آیا۔ اس پیر کی طرح جو نومولود بچوں کے سر لوہے کے سانچوں میں جکڑ کر انہیں بے مغز چوہے بنا ڈالتا تھا۔ میں نے سوچا۔

ہونی ہو کر رہی۔ مہاراجہ نے ایک ویران برآمدے میں اپنی نبضیں کاٹ ڈالیں اور جریانِ خون سے مر گیا۔ پورا گاؤں دُکھ درد سے کراہ اُٹھا۔

حویلی افسردگی میں ڈوب گئی۔

چالیس روز بیت گئے۔ گُھی کو اپنے میاں کے گھر واپس جانا تھا۔ ہم دونوں کسان گھرانے کی زندگی میں ایک بڑے المیے کے روز جدا ہو رہی تھیں۔ میں اس کے ساتھ دروازے کے سامنے والی پختہ دیوار کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک فضا میں پردے کا حکم سنائی دیا اور ہر کوئی منتشر ہو گیا۔

ہم دونوں اماں سائیں کے کمرے میں بھاگ آئیں۔ میں نے حیرت سے گُھی کو دیکھتے ہوئے کہا "ڈاکٹر کے علاوہ تو کوئی مرد کبھی اندر نہیں آتا۔ آج یہ کون آرہا ہے؟"

رونے دھونے کی تیز چیخیں اماں سائیں کے کمرے کی دیواروں سے ٹکرائیں ہمارے زنداں خانے میں جیسے غم اور صدمے کا بم پھٹ گیا تھا۔ گُھی اور میں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا لیکن ہمیں دروازہ کھولنے کی جرأت اس وقت تک نہ ہوئی جب تک پردے کا حکم منسوخ کرنے کی آواز نہ آگئی، پھر مجھے کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔

"ہم لٹ گئے، ہمارا کچھ نہ رہا۔" میں نے مزید جاننے سننے کے لئے کانوں پہ زور دیا۔

وہ چلا رہی تھیں "خدایا ہمیں صبر دے، خدایا ہماری مدد فرما۔" میں نے گُھی کا بازو تھام لیا۔ "کون ہے؟ کون؟" اور اگلے لمحے ہم دونوں کچھ سوچے بنا باہر بھاگ نکلیں۔ بین کرتی عورتوں کے درمیان میں گھستے ہوئے میرے دل کی دھڑکنیں بند ہو رہی تھیں۔

میں جاننا چاہتی تھی۔

نہیں میں کچھ بھی نہیں جاننا چاہتی تھی۔

چھوٹا سائیں مر گیا تھا۔

یہ اللہ کی مہربانی تھی کہ اُسے بالآخر سکون مل گیا۔ اب وہ کالی اور طوطی کی طرح باتیں کر سکتا تھا، گیت گا سکتا تھا۔ وہ آزاد ہو گیا تھا۔ گُھی اپنے بھائی کی صرف جسمانی جدائی کے صدمے سے بے حال تھی۔ دوسروں کی طرح میری چھوٹی بیٹیاں بھی دکھ اور صدمے سے روتی، چیختی چلاتی اور اپنے بال نوچتی بے ہوش ہو رہی تھیں۔ میں نے راجہ جی کو دیکھا تو اسے گلے لگانے کے لیے دوڑی۔ صدمے پہ حاوی ہونے کے لئے اس کا بدن کپکپایا۔ میں اسے مضبوط گرفت میں لئے ہوئے تھی۔ میں اُسے اپنے سے کبھی جدا نہ ہونے دیتی۔ اس کے کندھوں سے اوپر عقب میں مجھے چیل نظر آئی۔ اسی طرح بازو سینے پہ باندھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نام کی کوئی شے نہ تھی۔ میرے دل میں اس کے خلاف نفرت کی کالی گھٹا تھی۔

اماں سائیں سکتے کے عالم میں تھیں۔ ان کی خاموشی ان کے پوتے کے قتل کے خلاف شدید ترین احتجاج ثابت ہوئی۔ وہ قبلہ رو ہو گئیں یوں کہ پھر انھوں نے مڑ کے اپنی دنیا کی طرف کبھی نہ دیکھا۔

پیر سائیں بُجھا بُجھا سا تھا لیکن اس نے بڑے وقار اور تحمل سے جنازے کی رسومات ادا کیں۔ اس کے چہرے پہ دکھ کا کوئی نشان نہ تھا، نہ ہی اس نے مجھ سے میرا دکھ درد بانٹا، اگرچہ میں نے اس کی طرف دیکھا تو نہیں لیکن میرا بس چلتا تو میں اس کا کلیجہ نکال کے گدھوں کو ڈال دیتی۔ میں اس کی دونوں آنکھیں نوچ لیتی تاکہ وہ پھر کبھی بھی کسی یتیم لڑکی پہ ہوس بھری نگاہیں نہ ڈال سکتا۔

کہا یہ گیا کہ چھوٹے سائیں کو کھیت میں کسی سانپ نے ڈس لیا تھا۔ میں سوچتی رہی وہ سانپ تو اس کے باپ کا زہر بھرا دل ہی ہو سکتا تھا۔

میرے نزدیک میرا خاوند میرے بیٹے کا قاتل تھا۔

اسی کے ناپاک ہاتھوں نے میری بیٹی کو بے عزت کیا تھا۔

اللہ کے مُقدس نام پہ پلتا ہوا وہ غلیظ طفیلی کیڑا یقیناً ابلیس تھا، جس نے مجھے میری گردن سے قابو کیا ہوا تھا اور ہر رات مجھے گناہوں کی غلاظت میں دھکیل دیا کرتا تھا۔ وہ بھائی کی بربادی کا باعث اماں سائیں کا اذیت رساں، ماں کے گھٹنے لگانے والا اور لوگوں کا استحصال کرنے والا تھا، وہ یتیم لڑکیوں سے زنا بالجبر کرنے والا وہ بدمعاش تھا جو ناداروں کا لہو چوس چوس کے پلا ہوا تھا، لیکن اس کے باوجود لوگ کہتے تھے وہ اللہ کا مُقرب تھا اور صرف وہی ہماری نجات کے لئے اس تک پہنچ سکتا تھا۔

اب راجا جی وہ چھوٹا دیوتا ہو گیا جو میرا بڑا بیٹا کبھی بھی نہ بن سکتا۔ میں نے اسے بارہا نوکروں کے بچوں کے درمیان پیر بن کے کھیلتے دیکھا تھا، کھیل اب حقیقت میں بدل رہا تھا۔

اس میں لوگوں پہ حکومت کرنے کی پیدائشی صلاحیت موجود تھی، اگرچہ وہ اپنے پاؤں پہ جھکے ہوئے لوگوں کی طرف متوجہ ضرور ہوتا تھا، لیکن وہ اتنا عقلمند بھی تھا کہ اُن کے دکھ درد کو محسوس نہ کرتا۔ وہ اسلامی نظریات کو بخوبی سمجھتا تھا لیکن انہیں اپنی ضرورت اور سوچ کے مطابق ڈھال لینے کی روایتوں کا بھی امین تھا۔ وہ چھوٹے سائیں کی طرح بے وقوف نہ تھا، بلکہ اس کے بجائے اس نے اپنے بھائی کو ناکامی اور نامرادی کی مثال بنا دیا۔ اس نے چھوٹے سائیں کی اختیار کردہ راہ مسترد کرتے ہوئے وہ راستہ اختیار کیا جو قبر پرستی، شرک اور زناری کی طرف راہنمائی کرتا تھا۔

وہ لوگ جن کے لئے چھوٹے سائیں کا زنا جیسے جرم میں ملوث ہونا ناممکن تھا اس پورے معاملے پہ اس وقت تک حیران و ششدر رہے، جب تک بے حسی نے انہیں سب کچھ بھلا نہ دیا۔ بہت جلد ان مٹے ہوئے لوگوں کے دلوں سے اس کی یاد بھی مٹ جاتا تھی۔

گُھی اور چھوٹا سائیں جو میرے لئے خوشیاں اور دُکھ لائے تھے جا چکے تھے۔ وہ جو میرے نواسے کی پیدائش کی مبارک اور میرے بیٹے کی موت پہ تعزیت کے لئے آئے چلے گئے۔ وڈی مکانی میرے بیٹے کے قتل کی تعزیت کے لئے میرے پاس نہیں آئی۔ میں اس کے بیٹے کی ہلاکت پہ نہ جا سکی تھی۔

میرا وجود صحن کی ٹھہری ہوئی ہوا کی مانند ساکت تھا۔

جھکی ہوئی چلتی پھرتی عورتوں کے طویل تر سایوں کے آگے وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

موت اور درد کا یہ منظر کسی اور کی زندگی کا پیغام تھا۔ سبز گھاس میرے پاؤں تلے چہکارے مار رہی تھی۔

دوسرے ملکوں کے لمبے درختوں پہ کھلے گلابی، سفید اور نارنجی پھول فضا میں آسمانوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ارغوانی انگوروں سے لدی پھندی شاخیں نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ لال، پیلے اور نیلے شوخ رنگ کے کپڑوں میں ملبوس عورتیں اپنے کولہوں پہ گھڑے یا بازوؤں میں بچوں کو اٹھائے اِدھر سے اُدھر ہو رہی تھیں۔

کالی نے سر پیچھے پھینکا اور اس کے گلے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

طوطی دلہن بنی اپنے خاوند کے ساتھ خوشیاں مناتی ناچ رہی تھی۔ اماں سائیں مسحور بیٹھے بچوں کو لمبی لمبی کہانیاں سنا رہی تھی۔ گھمی کے خاوند نے اس کے جوڑے میں ایک پھول لگایا تو وہ لال ہو گئی۔

چھوٹا سائیں ابھی بھی میرے بازوؤں میں غوں غوں کرتا ننھا سا بچہ تھا۔ ایک ندی، دریا کے بہاؤ کی آواز۔ میرے پاؤں پانی کے چھینٹے اُڑا رہے تھے اور ہر چیز کہر میں معدوم ہوتی چلی جا رہی تھی۔

میں جس ہوا میں سانس لے رہی تھی، وہ چاندی کے بھائی رانجھا کے لئے درد کے پیغام میں بدل رہی تھی۔

پیار کا نام میرے مقدر کی لکیر میں گندھا جا رہا تھا۔ میری نگاہ اس مقام پہ اٹکی ہوئی تھی، جہاں سے اُسے ظاہر ہونا تھا۔ مجھے قدموں کی وہ چاپیں سنائی دے رہی تھیں جنہوں نے ابھی جنم نہیں لیا تھا۔ میں انہیں اس وقت تک گنتی رہی جب تک دنیا میرے قدموں اور رانجھا میرے دل میں نہ پہنچ گیا۔

ایک لمحہ آیا اور بیت گیا۔ ماضی بھی تھا، مستقبل بھی اور اُن کے درمیان تاریک گڑھا۔ ایک منجمد کر دینے والی سیاہ لہر اتری اور میں پیر سائیں کے عقب میں پیدا ہوتے گرداب میں چکرانے لگی۔

دروازہ زور سے بند ہوا، اب وہ تھا اور میں۔

”تم کسی دوسرے مرد کے لئے سوچ رہی تھیں؟“ اُس نے پوچھا۔ میری سانس

اُوپر کی اُوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ اُسے کیسے خبر ہوئی؟ میں اتنی خوفزدہ نظر آ رہی تھی کہ وہ شہ پاتے ہوئے گرجا ”تم دوسرے مردوں کے متعلق سوچتی ہو؟“ میں نے سوچا وہ مجھے قتل کر دے گا۔

”کیا تمہیں دوسرے مرد کی اسی طرح ضرورت ہے جیسے مجھے دوسری عورت کی؟“ وہ دھاڑا۔ کسی غیر مرد کے ذکر سے میرے اندر خوف اور دہشت پھیل گئی۔ میں اس کے پاؤں پہ گرتے ہوئے گڑگڑائی میں نے ہر اس شے کی قسم کھائی جسے وہ مقدس اور متبرک سمجھتا تھا کہ میں نے کبھی کسی دوسرے مرد کا نہیں سوچا تھا۔

”بولو میں جھوٹ قبول نہیں کرتا۔“ وہ چیخا، لیکن صفائی پیش کرنے میں کسی صورت، کسی پہلو بھی تحفظ اور بچت نہ ہوتی۔ دل ہی دل میں میں نے چھوٹے سائیں کو پکارا کہ وہ میرے لئے اللہ کی مدد کے نزول کے لئے دعا کرے۔

باب ۹

شوریدہ لہریں

میری زندگی متلاطم، پُرآشوب اور ڈانواڈول تھی، لیکن دیا اور منی کی زندگیوں میں ٹھہراؤ اور سکوت تھا۔ تیرہ اور چودہ سال کی عمر میں ہی ان کی شادیاں ان کے عیاش طبع چچا کے دو بیٹوں سے کر دی گئی تھیں۔ جب اسی قسم کے خطرات، اسی قسم کی دیوانگیوں اور وحشتوں اور اسی قسم کے مردوں اور عورتوں کے درمیان اُن کی رخصتی کا وقت آیا تو پریوں کے دیس کی جادوئی روشنیوں کی کبھی نہ بھولنے والی یادوں نے مجھے آن گھیرا، وہ میرے ذہن کے دریچوں میں جلتی بجھتی رہیں۔

چھوٹے سائیں اور تینوں بیٹیوں کے وداع ہو جانے کے بعد میں راجہ جی اور اس کے باپ کے درمیان رہ گئی، اُن میں سے ایک دوسرے کا پرتو تھا۔

غیر مردوں کے موضوع پہ اُسے روکتے روکتے تین سال گذر گئے۔ کئی راتوں کو وہ جیسے منتوں پہ اتر آتا کہ میں اُسے بتاؤں کہ مجھے دوسرے مردوں کی ضرورت تھی۔ دوسری راتوں کو طیش میں بھرا ہو وہ مجھے تاکیداً کہتا "تمہیں دوسرے مرد کی ضرورت ہے، کہہ دو ورنہ میں تمہاری گردن کسی چوزے کی طرح مروڑ ڈالوں گا۔" کیا تمہیں دوسرے مرد کی ضرورت ہے؟ میں اس سوال کا ہزار ہا بار جواب دے چکی تھی، لیکن وہ اس سے کبھی بھی مطمئن نہ ہوا۔

میرے خاوند کے اس وہم و خیال اور جنون نے بہر حال میرے دل میں خوابیدہ رانجھا کے متعلق خوابوں کو ضرور بیدار کر دیا۔ اس کی کہانی اس کی کار کے سٹیرنگ پہ یک دم ختم ہو گئی تھی۔ اس کے متعلق مزید سوچنے کی کوشش میں میں نے پرواز شروع کر دی۔ میں ایک ستارے سے دوسرے تک پہنچی اور کبھی وسیع و بسیط آسمانوں پہ تیرتی پھرتی۔ میرا خاوند میری ہڈیوں سے ان کا جوس اور روح سے زندگی چھین چکا تھا لیکن اس کے باوجود یہ ممکن تھا۔

ایک روز اس نے اعلان کیا "میں کوئی نئی چیز لایا ہوں۔" ہر نئی چیز جو وہ مجھے متعارف کرواتا ایک بھیانک سپنا ثابت ہوتی۔ اُسے قبول کرنا میرے لئے ممکن ہوتا نہ وہ مجھے اس سے نباہ کرنے کے لئے کوئی وقت دینے کو تیار ہوتا۔ گتے کے دو ڈبے جن میں سے ایک دوسرے

سے بڑا تھا ہمارے کمرے میں کھولے گئے۔ میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ ان میں ایک ٹیلی وژن اور دوسرا وڈیو ریکاڈر تھا۔ نوکرانیوں کے لئے یہ کسی اجنبی مرد کے حویلی میں گھس آنے کے مترادف تھا، لیکن یہ مالک کی رضا کا مسئلہ تھا۔ وہ ان تمام اصولوں اور قاعدوں کو جنہیں وہ کسی سے بنا پوچھے نافذ کر سکتا تھا مسترد کرنے کا اختیار بھی رکھتا تھا۔ وہ غسل خانے میں گیا تو میں اس مشین کی طرف دوڑی جو پوری دنیا کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ میں اسے جگہ جگہ سے چھو کے یقین کر رہی تھی کیا یہ واقعی وہی تھی۔

تاریں اور پلگ سیٹ کرنے کے بعد پیر سائیں کرسی پہ بیٹھ گیا۔ حجرہ باقی سب عورتوں کے لئے ممنوع قرار دے دیا گیا۔ مجھے فرش پہ اپنے قریب بٹھانے کے بعد اُس نے بٹن دبایا اور سکرین روشن ہو گئی۔ میری آنکھیں تو جیسے اس سے چپک ہی گئیں۔ ایک گلی دکھائی دی جو ایک گھر کی طرف راہنمائی کر رہی تھی۔ ایک عورت نے کسی مرد کے لئے دروازہ کھولا اور پھر میرے ہاتھ میری آنکھوں پہ چلے گئے۔ میرے خاوند نے انہیں پرے ہٹا دیا تاکہ میں دیکھتی رہوں۔ مرد اپنے کپڑے اتار کے بالکل برہنہ ہو گیا۔ عورت بھی جیسے شرم و حیاء سے عاری تھی۔ میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی لیکن میرے لئے منہ دوسری طرف موڑنا بھی ممکن نہ رہا۔ پیچ و تاب کھاتے ہوئے میں شرم سے جل اُٹھی۔ میرا چہرہ لال ہو گیا۔ میرا میاں مسلسل مجھے ہی دیکھے جا رہا تھا۔

ہر روز میں سحری کے وقت مشین کو ایک سفید چادر تلے ڈھک دیتی لیکن تصویریں مسلسل میرے ذہن میں لہراتی رہتیں اور میں دل ہی دل میں توبہ توبہ کرتی رہتی۔

جب اس نے تینوں چھوکریوں کو یہی شو دکھایا تو وہ بھی میری ہی طرح دھک سے رہ گئیں۔ مرد اور عورتیں گھاس پر جڑی بوٹیوں کی طرح آپس میں گتھم گتھا نظر آتے۔

ہوس اور نفسانی خواہشات سمندر کی لہروں کی طرح اٹھتی، گرتی، رینگتی، تڑپتی، تھرتھراتی اور پھر واپس ہوتی دکھائی دیتیں۔ شو ختم ہوتا تو مشین بند کر دی جاتی۔

ہمارا پردہ اتر چکا تھا۔

لیکن اگلی صبح ہر چیز ویسی کی ویسی ہی ہوتی۔

حویلی کے تالے اور چٹخنیاں اسی طرح رہتیں اور ہمارے سروں کے آسمانی قطعے میں بھی کوئی اضافہ نہ ہوتا۔ اس کے زنداں کی چار عورتیں شب بھر آنکھوں کے زنا میں مبتلا

رہنے کے بعد علی الصبح اپنی اپنی جائے نمازوں پہ جا گرتیں۔ میرے میاں کے لئے یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی نہ وہ اس سے کبھی کنفیوژ ہوتا۔ وہ وقت کو مجموعاً لینے کا عادی نہ تھا۔ وہ زندگی کو مختلف حصوں میں یوں گذار رہا تھا جیسے یہ ایک دوسرے سے مختلف لوگوں کی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے تضادات کو اپنی شعبدہ بازیوں سے چھپائے ہوئے تھا۔ بالکل جیسے خالق کائنات مخلوق سے۔

"تمہارا کیا خیال ہے چرواہا یتیمڑی کے لیے کیسا رہے گا؟" اُس نے مجھ سے ایک روز پوچھا۔ مجھے یقین نہیں تھا، میں متذبذب رہی۔ دائی نے مجھے پیر کی اونٹنی کی روایت کے متعلق بتایا تھا کہ جب بھی ضرورت محسوس ہوتی پیر کی اونٹنی کو گاؤں میں کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ جس گھر کے سامنے وہ بیٹھتی اس گھر کی نوجوان ناکتخدا دوشیزہ کو دلہن بنا کے پیر کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ اس کی دوشیزگی کے خاتمے کے بعد لڑکی کو واپس اس کے گھر بھیج دیا جاتا۔ باقی زندگی اُسے کسی مرد کو چھوئے بنا وہیں اسی عالم میں گذارنا ہوتی تھی۔ یوں جو پیر کے لئے حلال تھا وہ باقی سب کے لئے حرام ٹھہرتا۔

پیر سائیں بڑبڑایا "میں نہیں چاہتا کہ یتیمڑی میرے دروازے پہ ہی بوڑھی ہو جائے۔ یہ میرے لئے الٰہی فریضہ ہے کہ میں اس کے لئے بر تلاش کروں" جب اُس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ "لڑکا نامرد ہے اس کی پہلی بیوی کسی مسافر کے ساتھ بھاگ گئی تھی" تو اس شادی کے مقاصد عیاں ہوگئے۔ لیکن شکوک اب بھی اس کا گھیراؤ کئے ہوئے تھے۔ یتیمڑی بھی کسی مسافر کے ساتھ بھاگ سکتی ہے۔ میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ وہ شادی نہیں کر سکتی، اور یہ موضوع دفن کر دیا گیا لیکن یہ صرف چند روز کے لئے تھا۔ اُسے پھر سر اٹھانا تھا۔

کبھی کبھار وہ اُس سے بھی پوچھتا لیکن وہ اپنے مقدر کے بارے میں کسی رائے کے اظہار کی جرأت کبھی نہ کر سکی۔ کئی مہینے گومگو کی کیفیت میں رہنے کے بعد اس نے بالآخر یتیمڑی کی چرواہے سے شادی کا فیصلہ کر ہی دیا، لیکن اُسے رہنا اسی حویلی میں ہی تھا۔ عدم تحفظ کے بارے میں یہ اس کا یہ احساس میری کمر میں خنجر کی طرح لگا۔ مجھے اس کی اس لڑکی سے اتنی گہری وابستگی کا احساس نہ ہو سکا تھا۔ وہ میرے بیٹے کی قاتل تھی۔ میں سوچا کرتی تھی کہ اس کے ان تینوں چھوکریوں سے تعلقات کسی نہ کسی طرح میرے مرہونِ منت تھے۔ میں اس کے لئے اماں سائیں کے خیال کے مطابق ناگزیر ہو چکی تھی لیکن میں تو محض ایک شریکِ کار

نکلی تھی۔ میں اماں سائیں سے مزید کوئی مشورہ بھی نہ لے سکتی تھی کہ انہوں نے تو چھوٹے سائیں کی موت کے بعد چپ کا روزہ رکھ لیا تھا۔

میرے خاوند نے یتیمڑی کو سونے کے جڑاؤ سیٹ، ملبوسات، بستر اور باورچی خانے کا سارا سامان عطا کیا۔ ایک بستر اور ایک صوفہ سیٹ احاطے کے ایک خالی کمرے میں بھی بچھا دیئے گئے جہاں یتیمڑی کو رہنا تھا۔ حویلی کے باہر پیر سائیں کی اس خدا ترسی کے چرچے ہوئے جو اس نے اس یتیم لڑکی کے لئے دکھائی تھی، جس سے اس کا بیٹا زنا بالجبر کا مرتکب ہوا تھا۔ حویلی کے اندر ہر کوئی اس کے حسد میں مبتلا دکھائی دے رہا تھا۔

پیر سائیں اس کی رخصتی کے روز تک ہر شب آہیں بھرتا اور کراہتا رہا۔ شادی کے روز بھی کسی کو کوئی خوشی منانے کی اجازت نہ ملی۔ اس کا موڈ ہر شے کو مسترد کر رہا تھا۔ عورتیں تنے ہوئے بدن اور چست و ہوشیار نگاہوں کے ساتھ بلیوں کی طرح پنجوں پہ چلتی نظر آئیں۔ یتیمڑی تو صبح تک اسی کے کمرے میں اس کے ساتھ بند رہی۔ بالآخر اس نے اُسے موقع کی مناسبت سے تیار ہونے کو کہا۔ کچھ دیر بعد ایک خوفزدہ دلہن میرے ڈریسنگ روم سے باہر نکلی۔

اس کے پلنگ کے پائینتی نصب شوخ سرخ جوڑے میں ملبوس بت پہ ان لمحوں میں کچھ بھی بیت سکتی تھی۔ پیر سائیں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ پنجوں کو گھماتے ہوئے اپنی ڈاڑھی میں خلال کرتے ہوئے، اپنے باہر نکلے پیٹ پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ کبھی گہری گہری سانسیں لیتا اور پھر اتنی ہی آواز کے ساتھ انہیں باہر نکالتا۔ پورا گھنٹہ گذر گیا، پھر وہ اچانک چھلانگ لگاتا کھڑا ہو گیا "نکل جاؤ، نکل جاؤ، نکل جاؤ" اس نے چیختے ہوئے ہمیں اپنے سامنے سے چلے جانے کو کہا۔ ہم دونوں دوڑتی ہوئی دروازے سے نکل گئیں۔ جب اس کے بند ہونے کی آواز آئی تو ہم دونوں نے ایک ساتھ سانس لی۔

پیر سائیں کی ہدایت کے عین مطابق جونہی بارات صحن میں داخل ہوئی میراثنوں نے سوگوار دھنوں پہ بیاہ اور دچھوڑے کے گیت چھیڑ دیئے۔ دُلہا کے گھر والے مرعوبیت سے مر رہے تھے۔ بیوہ کی لڑکیوں کی خوشی تو چھلک چھلک پڑتی تھی۔ ان کے لئے میدان صاف ہو گیا تھا۔ چیل ہمیشہ کی طرح بازو سینے پہ باندھے کھڑی تھی۔ میں کچھ کنفیوژ سی تھی اور اسی عالم میں میں نے دُلہن کو اس کے حوالے کیا۔ دُلہن یا دوسری عورت؟ میرے پاؤں

چھوتے ہوئے جب وہ چلنے لگی تو میرا دل اس کے لئے بھر آیا، لیکن ساتھ ہی مجھے چھوٹے سائیں کی یاد آئی اور وہ پتھر ہو گیا۔ کچھ دیئے بنا وہ مجھے صرف کر چکا تھا۔ میں نے آئینے میں اپنے عکس پر نظر ڈالی میری آنکھیں اپنے اندر ہی اندر دھنستی دلدل کی طرح ہو چکی تھیں۔ میرے ہونٹوں کی شوخی اور چاشنی ختم تھی۔ میرا بدن بے حس اور کسی کوڑے دان کے کچرے کی طرح ہو چکا تھا۔ گوشت ہڈیوں سے اور ہڈیاں کھال سے الگ ہونے کو تھیں، لیکن مالک اب بھی ہمیشہ رہنے والی جوانی کا متقاضی تھا۔ آئینہ بتا رہا تھا کہ جوانی قصۂ پارینہ ہو رہی تھی۔

یہ عورت میں ہی تھی؟

یہ کون تھی؟؟

میں کون تھی؟؟؟

پیار اور محبت کے عدم وجود نے مجھے علیل کر ڈالا۔ میرے لئے اپنے خاوند سے محبت کا تصور بھی ناممکن تھا۔ وہ بالادست تھا اور میں نہیں جانتی تھی کہ اس کی غلامی اور محبت ایک ساتھ کیسے چل سکتی تھیں۔ اس نے پیار تو کجا مجھے کبھی عورت بھی نہ سمجھا تھا۔ میں اس کے دل میں کبھی کوئی جذبہ بیدار نہ کر سکی نہ کبھی اُس نے مجھے محبت کی نظر سے دیکھا تھا۔ میں کبھی اُس کے دل میں داخل ہو کے دستک نہ دے سکی تھی۔ تیمڑی کے لئے یہ ممکن تھا۔

اس رات پیر سائیں کسی اور موضوع پہ بات نہ کر سکا، اُسے یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ تیمڑی پہ کیا بیت رہی ہو گی۔ جب میں اس کے خاوند کی نامردی کے حوالے سے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تو وہ چیخا "تم اس سے نجات حاصل کر کے خوش ہو؟ تمہیں اپنی فتح کی خوشی ہے؟" میرا منہ اس کے زوردار تھپڑ سے بال بال بچا۔ اس کا کب سے جمع ہوتا ہوا غصہ اب مجھ پہ نکل رہا تھا میں نے سانچہ خراب کرنے کی جسارت کی تھی۔ کیوں؟ وہ جاننا چاہتا تھا۔ پھر اچانک وہ دوبارہ اس فکر میں ڈوب گیا کہ تیمڑی پہ کیا بیت رہی ہو گی۔ دوسرے لمحے وہ بھوت پریت کے شکار کسی دہشت زدہ انسان کی طرح چھلانگ مارتا پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ خدا کا شکر ہے اگلی صبح ہی تیمڑی لوٹ آئی۔ اس کے خاوند کو حکم ملا کہ وہ حویلی کے صدر دروازے پر ٹھہرے۔

میری توجہ اپنے عکس سے جبراً ہٹ گئی۔ عورتیں شور مچا رہی تھیں "سخی بابا کے گھر کو آگ لگ گئی۔ سب مر گئے۔ آگ، آگ پورا گھر آگ کی لپیٹ میں ہے۔"

ہونی ہو کے ہی رہی تھی۔ میں پتہ کرنے باہر بھاگی کیوں؟ کیسے؟

حویلی کے اندر پہنچنے والی اطلاعات ایک منہ سے دوسرے تک پہنچتے پہنچتے بدلتی اور گمبھیر ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ پہلے پتہ چلا کہ گھر کا ہر فرد آگ کے اندر پھنسا ہوا تھا، پھر کسی نے بتایا کہ وہ سب باہر ہونے کے سبب بچ گئے تھے۔ میں نے سُنا کہ باورچی خانے میں کوئی چولہا پھٹ گیا تھا اور پورے گھر نے اُسی سے آگ پکڑی۔ پھر یہ خبر سخی بابا کے حقے کی چلم تک پہنچی جہاں سے کسی جن کی طرح کے شعلے اُٹھے اور گھر کوئلہ ہو گیا۔ کوئی یہ خبر لایا کہ کسی آنکھوں دیکھے شاہد نے پورے خاندان کو جل کے راکھ ہوتے دیکھا تھا۔ کسی اور عورت کو یہ پتہ چلا کہ مزارعوں نے پورے خاندان کو آگ سے نکال لیا تھا اور اسے پائپوں کے ذریعے ٹیوب ویل کے پانی سے بجھا بھی دیا۔ مصلن بہ اصرار کہہ رہی تھی کہ وہ مصدقہ خبر لائی تھی۔ سخی بابا اپنے کام میں لگا ہوا ہے، اس کی بیوی نماز پڑھ رہی ہے اور اُن کا بیٹا کھیل رہا ہے۔

ہر کوئی اس المیے کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کے لئے کوشاں تھا۔ ہر عورت حسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہی تھی "یہ اللہ کی سزا ہے۔ سخی بابا نے جس طرح آستانے کی توہین کی یہ اس نتیجہ ہے۔" وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتیں اپنے سر وائے افسوس میں ہلا رہی تھیں جیسے اُن سب کو یقینِ کامل تھا کہ اللہ کے پیاروں کی توہین کے نتیجے میں باباجی کا غیض و غضب نازل ہو رہا تھا۔

دائی نے جو کچھ کہا وہ مجھ پہ صورتِ حال کی وضاحت کے لئے کافی تھا۔

درگاہ کی حدود میں رہنے والے ہر فرد پہ لازم ہے کہ وہ اس کی تعظیم کرے۔ جب بھی کسی نے اس کی خلاف ورزی کی جلد یا بدیر وہ برباد ہوا، اگر لوگوں کو کلمۂ کفر کی سزا نہ ملے تو درگاہ کا وقار اور قوت ختم ہو کے رہ جائے گی۔

اس احساس کے ساتھ کہ کہیں مجھ سے بھی اس جرم کا ارتکاب نہ ہو جائے میں نے الفاظ کا محتاط انتخاب کرتے ہوئے دائی سے پوچھا "کلمۂ کفر تو اس وقت بنتا ہے جب اللہ، پیغمبرؐ اور اُن کے اصحابؓ کی توہین کی جائے۔ اس کا دوسرے لوگوں سے تو کوئی تعلق نہیں۔"

میرے خاوند کی بوڑھی آیا نے میرے ہی طرح محتاط انداز میں جواب دیا "اللہ کے بندوں کی توہین کی بھی تو اجازت نہیں۔"

بالآخر حقائق کھل کے سامنے آگئے اور افواہیں دم توڑ گئیں۔ سخی بابا کی جلی ہوئی

نعش کواس کے چشمے کے آہنی فریم سے پہچان لیا گیا۔ بڑی طرح جلی ہوئی سخی بی بی کو ہسپتال لے جایا گیا۔اس کے بیٹے کواپنے باپ کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ایک ہی گھر کے سات افراد اسی قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔

میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ میں چیل کی خطرناک نگاہوں سے دور ہٹ گئی۔ میں سوچ رہی تھی اس کے آباؤاجداد اس کی طرف سے ایک مجرم کی ایسی خاموش خدمت گذاری پہ اپنی قبروں میں تڑپتے رہتے ہوں گے۔

یوں لگتا ہے اپنے تمام پیاروں کے گذر جانے کے بعد سخی بی بی کو اپنی بقایا زندگی اللہ کے انتقام کی کہانیاں سنتے سنتے گذارنا تھی۔ وہ تمام لوگ جو اللہ کے پیاروں کی توہین کے مرتکب ہوسکتے تھے اس دنیا سے رخصت ہوگئے تھے۔ درگاہ کے خلاف اگر کسی کے ذہن میں کبھی کوئی سوال ابھرا تھا تو بھی اب وہ ان کے دلوں اور دماغوں میں ہی دفن ہو گیا۔ لوگوں کو ایک مکمل اور حتمی سبق سکھادیا گیا تھا۔

لیکن زندہ رہنے کے تمام تر عذاب کے باوجود زندگی رواں دواں رہی اور پھر اس دنیا میں جہاں خوابوں کی کوئی وقعت نہ تھی اس بھیانک سپنے کے دوران ایک خواب کی تعبیر نکل آئی۔ بیرون ملک سے کسی مہمان کی آمد ہوئی۔ ہمیں دالان کو جھاڑ جھنکار سے صاف کرنے کو کہا گیا۔ کمروں سے کرسیاں باہر نکالی گئیں اور مرچوں کے بغیر سالن پکانے کا حکم صادر ہوا، اگرچہ ان حالات میں سخی بابا کے المیے سے توجہ ہٹانے کے علاوہ تیمبرڑی کے خلاف حسد کے جذبات کو نظر انداز کرنا مجھے کچھ مناسب نہ لگا، لیکن پھر بھی میں عین نصف النہار کو بروکیڈ کا جوڑا اور خوشنما فینسی جوتے پہنے تیار ہو گئی۔

میری آنکھیں اینٹوں کی پختہ دیوار پہ جمی ہوئی تھیں، میں منتظر تھی۔ گوری میم محبوس عورتوں سے بھرے دالان میں داخل ہوئی وہ یقیناً کسی ہوائی پرواز سے آئی ہوگی، سمندر کے اوپر آسمان کی آزادیوں کو چھوتے ہوئے، میں سوچ رہی تھی۔

یہاں پہنچنے کے لئے اُس نے گاڑی پہ صحرا عبور کیا ہوگا۔

وہ کہاں رہتی تھی؟

اگر وہ شادی شدہ تھی تو اس کے خاوند نے اسے یوں تنہا سفر کی اجازت کیسے دی تھی؟

اس کے باپ نے کیسے ہاں کی ہوگی؟ میں حیران تھی۔

اس نے چادر اتاری تو اس پہ مرکوز آنکھوں کو وہ اپنی ننگی پنڈلیوں کے ساتھ عریاں لگی۔ چیل ہونق دکھائی دی۔

میں خود دہشت سی محسوس کر رہی تھی، حالانکہ میں تو ایسی ننگی ٹانگیں بارہا اور بار بار ٹیلی وژن کی سکرین پہ دیکھتی چلی آرہی تھی۔ ہم ایک دوسری کو دیکھتے ہوئے مسکرائیں اور مصافحہ کیا۔ اس نے انگلش میں کچھ کہا، یہ وہ زبان تھی جو میں نے اَدھ سکھلائی میں چھوڑ کے بھلادی تھی لیکن پھر بھی میں نے جواباً سر ہلا دیا۔

گوری کی سفید چمڑی بہت نازک تھی۔ ہماری دھوپ میں وہ یقیناً جل جاتی۔ یوں لگتا تھا وہ بھلی سردیوں کو بھی دقت اور بے آرامی سے گذارتی ہوگی۔ یہاں کی سرد اور تیز ہواؤں میں تو اس کی کھال پھٹ جاتی۔ کسی آدمی کا زہر تو اس کے لئے بالکل نئی چیز ہوگی۔ پیر سائیں کا زہر اسے یقیناً موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ گوری مجھے کمزور، نازک اور بے یار و مددگار دکھائی دی۔

اُس کی دنیا نے اُسے کمزور کر دیا تھا۔

میری دنیا نے مجھے تپا تپا کے مضبوط کر ڈالا تھا۔

اس نے مجھ سے پوچھا کہ "ہمارے ہاں کوئی پڑھی لکھی عورت بھی تھی۔"

تو مجھے اماں سائیں کے ہم سب کے متعلق الفاظ یاد آئے جو میں نے دُہرا دیئے،

"ہم پڑھی ہوئی تو نہیں گڑھی ہوئی ضرور ہیں۔" اس کی ترجمان نے میری بات کا ترجمہ کیا۔

گوری کا خیال تھا کہ میں بہت ہوشیار اور ذہین تھی۔ میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ آیا وہ بھی ہوشیار اور ذہین تھی؟ اس کی نقل و حرکت پہ نگاہیں رکھتے ہوئے اور ہر لفظ کو دھیان سے سنتے ہوئے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی اخبار والی تھی۔

"میں پیر سائیں کی عورتوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھ سکتی۔ میں نے حلف اُٹھایا ہوا ہے۔ اُس نے مجھے صرف مردوں کے بارے میں لکھنے کی اجازت دی ہے۔" اس کی اس بات سے مجھے تحریک ملی کہ میں اس سے درگاہ کے بارے میں اس کی رائے پوچھوں۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ دنیا سے اس کے آزادانہ اور کھلے میل جول اور روابط نے اس کی سوجھ بوجھ میں کیا اضافہ کیا تھا۔ میں یہ بھی جاننا چاہتی تھی کہ ان کی عدم موجودگی نے میرا کیا حشر کیا تھا۔

گوری کا چہرہ چمک رہا تھا۔ "لوگ تمہارے میاں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ان

کی آنکھیں اس کی ایک جھلک پاتے ہی روشن ہو جاتی ہیں" میرے کان کھڑے ہوگئے۔ اس کی نگاہوں میں گہرائی نہیں تھی۔ "وہ اس کے کتنے معتقد اور دیوانے ہیں۔" اس نے جیسے غشی کھاتے ہوئے کہا۔ میرا خیال تھا کہ اُس نے یہ فیصلہ بڑی عجلت میں یہ احساس کیے بنا کر دیا تھا کہ ایسے اعتقاد اور دیوانگی کو وجود میں لانے کے لئے کتنے ظالمانہ اور بے رحمانہ طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ کیا اسے ہماری آنکھوں میں خوف اور دہشت کے سائے نظر نہیں آئے تھے؟

"تمہارا خاوند اس جاہ و حشم کے باوجود کتنا منکسرالمزاج ہے۔ اس سے ملاقات کتنا بڑا اعزاز ہے۔" گوری نے اعلان کیا۔ "اور کیا؟" میں نے پوچھا اور وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان رہی۔ "اس کے چہرے پہ کتنا تقدس ہے۔ وہ کتنا متین اور پرسکون دکھائی دیتا ہے۔ وہ معجزہ اور کرامتوں والا ہے۔ مجھے کتنے ہی مریدوں نے یہ سب بتایا ہے۔" میں چبھتی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی اور وہ کہہ رہی تھی "غربت کے سمندر کے درمیان اس سکون کا مطلب تو صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ وہ لوگوں کو ان کی روحوں کی غذا مہیا کر رہا ہے۔"

گدھی، میں نے دل ہی دل میں کہا۔

وہ بہرحال ایک انگریز تھی۔ اس کے آباء نے بڑی چالاکی سے مسلمانوں کو قبر پرستی میں مصروف کر دیا تھا خود حکومت کرتے رہے اور پھر غائب ہوگئے۔ کیا اُس کو اپنی تاریخ کا علم نہ تھا؟ میں اُسے طوطی کی کہانی سنانا چاہتی تھی لیکن حوصلہ نہ کر سکی۔ اپنی اس بے بسی پہ کہ اتنا کچھ ہوتے ہوئے اور چاہتے ہوئے بھی میں کچھ کہہ نہ سکتی تھی میں تلملا کے رہ گئی۔ کسی سوکھے ہوئے پتے کی طرح اٹھتے ہوئے میں دھڑام سے اپنی کرسی میں غرق ہوگئی۔ میرے لئے یہی کافی تھا کہ میں سخی بابا کی موت کا سوگ مناؤں اور ایک بار پھر تیمرّی کے خلاف حسد کی آگ میں جلتی رہوں۔

اس کی رخصتی سوائے میرے کسی کے لئے کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔ دنیا احمقوں پہ مشتمل تھی اور گوری ان کی نمائندہ تھی۔ اس نے میری پرواز کی ضرورت ختم کر کے رکھ دی تھی۔ اس نے بیرونی دنیا سے بندھی میری زندگی کی ڈور کاٹ ڈالی۔

میرا ذہن مجھے کھانے کو دوڑ رہا تھا، تم زندگی بھر کے لئے اسی قفس میں رہو گی، نہ تمہیں کہیں جانا، نہ کچھ دیکھنے کو ہے اور نہ ہی کچھ ایسا ہے جس کے متعلق تم خواب دیکھ سکو۔ میری ملکیت ایک واہمہ کچھ خیال ہی تو تھے اُن کے چھن جانے کے خوف سے گھبرائے ہوئے

میں نے کوشش کی کہ میں دنیا کے بارے میں نہ سوچوں۔ یہ اسی طرح تھا جیسے ابھی ابھی میں نے اپنی ٹانگوں سے گذرنے والے ایک چوزے سے پاؤں بچایا تھا۔

میرے لئے واحد راہِ فرار اپنا ہی وجود تھا، لیکن اس کے اندر کی ہر چیز بھی تو کتنی بور تھی۔

مجھے سورج کے ڈھلنے اور چاند کے چڑھنے کے اوقات ازبر تھے۔ موسم پچھلے پچیس سالوں سے سرکش درخت پہ رنگوں اور اُداسیوں کا کھیل کھیلتے آ جا رہے تھے۔ اوپر اپنے آسمان کے چھوٹے سے ٹکڑے پر ایک وقت میں کتنے بادل سما سکتے تھے۔ اس کا حساب میرے دل میں کندہ تھا۔ میری ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ کاش یہ تنہا درخت ہزاروں میں اور حویلی کے اوپر آسمان کا قطعہ بہت سے آسمانوں میں تبدیل ہو جاتا، میرے پر پھوٹ پڑتے اور وسیع و عریض دنیا کی طرف پرواز کر جاتی۔

لیکن اب نہیں۔

کبھی کبھی مجھے یوں لگتا جیسے میرا ذہنی توازن ختم ہو رہا تھا، لیکن یہ احساس اسی وقت ہوتا جب مجھے بدترین کا سامنا نہ ہوتا، خاوند کا خوف کسی وقت پیچھے ہٹتا تو اس کی جگہ میرے اپنے ذہن کی دہشت لے لیتی۔ بابا ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ایسی صورتِ حال انتہائی حساس ہوتی ہے۔ میرا ذہن اور میرے تصورات میرا مستقل دردِ سر تھے۔ انہیں قابو میں رکھنے کے لئے میں اپنا دوپٹہ سختی سے سر پہ باندھے رکھتی۔ اس کے اندر ہی اندر میں اس مملکت میں سرگرداں ہو جاتی جہاں زماں و مکاں کا کوئی تصور نہ رہتا، جہاں کہانیاں اتنی طویل ہوتیں کہ مجھے انہیں سننے کے لئے بسترِ علالت پہ صاحبِ فراش رہنے کی ضرورت ہوتی۔

کبھی کبھی میرا دل چاہتا کہ میں رِوں رِوں کرتی رینگتی ہوئی کنڈلی مارے خوف اور دہشت کے اس دائرے میں جا گھسوں جس کا کوئی وجود نہ ہوتا۔

گوری نے میری جس دنیا کو تباہ کر دیا تھا اس کا کوئی متبادل نہ تھا۔ خلا پُر کرنے کے لئے میں نے نکوٹین کا سہارا لیا۔ مجھے اپنی پہلی پٹائی یاد آئی جس کا باعث راکھدان کا تحفہ بنا تھا۔ اب کئی سالوں بعد میں سوچتی بھلا یہ بھی کوئی وجہ تھی جس کے لئے میری پٹائی ہوئی۔ پیر گھرانے کی تقریباً سب ہی عورتیں تمباکو پیتی تھیں۔ نوکرانیوں کے ہاتھوں سگریٹ منگوا لینا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ خود تو جب بھی موقع ملتا عام کاغذ اور تمباکو کی خانہ ساز بیڑی کے کش لگا

لیتیں۔ سگریٹ اب میرے بدن کا حصہ ہو گئے۔ میری انگیا تمباکو، لائٹر اور بیڑی کے پتوں کا گودام ہو گئی۔ مال ختم ہونے سے پہلے ہی اس کی رسد پہنچ جاتی، لیکن جلد ہی یہ سہارا بھی میری ان تنہائیوں اور خلاؤں کا مداوا کرنے سے قاصر ہو گیا جو مجھے کھائے جا رہے تھے۔

مجھے اپنے آپ کو دیوانگی سے بچانا تھا۔ میں نے چیل کے اِرد گرد منڈلانا شروع کر دیا جو میرے حویلی میں قدم رکھنے کے دن سے سینے پہ ہاتھ باندھے خاموش کھڑی نظر آتی رہی تھی۔ اس سے پہلے اور بعد سالہا سال کے دوران نہ کبھی اُسے کچھ کہتے ہوئے سُنا گیا نہ کچھ کرتے ہوئے اور نہ ہی وہ کچھ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی تخلیق صرف اور صرف ہماری نگرانی اور مالک کو ہماری فروگذاشتوں کی رپورٹ دینے کے لئے کی گئی تھی۔

کیوں؟ میں اس سے پوچھنا چاہتی تھی۔

میں اس کی زبان سے اس کی کہانی سننا چاہتی تھی۔ میں اس کی آواز سننا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ اس کی زبان سے گفتگو کی غلطی سرزد ہو۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ وہ بتائے کہ اس نے اپنے خاندان کے عہد و پیان کو کیوں توڑا تھا۔

جب میری تمام کوششیں اُس کی زبان کھلوانے میں ناکام ہو گئیں تو میں نے دائی سے رجوع کیا کہ وہ مجھے اس کے بارے میں کچھ تو بتائے، لیکن اس کے پاس کوئی نئی بات نہ تھی۔

"تیس سال قبل اس نے اپنے خاندان کے پہلے فرد کی حیثیت سے درگاہ میں وفا کا حلف اٹھایا۔" دائی نے کہا "یہی وجہ ہے کہ پیر سائیں اس پہ اعتماد کرتا ہے، اس کی یہاں موجودگی گدی نشین کے حق سچ ہونے کی تصدیق کرتی ہے، لیکن آج تک اُس نے کبھی وہ وجہ نہیں بتائی جو اسے یہاں کھینچ لائی تھی۔ نہ ہی اسے کبھی کوئی ملنے آیا۔ وہ ایسا اندھا کنواں ہے جس سے کچھ نکالنا صرف پیر سائیں کے ہی بس کی بات ہے۔"

اب بھی چکرائے ہوئے میں نے دائی سے پوچھا "وہ اپنی زندگی یوں کیوں گذار رہی ہے؟ کیا دنیا میں کوئی اس کا دوست نہیں؟ اس نے شادی نہیں کی؟" دائی مجھ پہ ہنس دی "کیا تم نے اسے کبھی کسی مرد کے بازوؤں میں جھولتے دیکھا ہے؟" اس کا تو تصور ہی محال تھا۔ چیل میں میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ اس کے وجود اور فیصلے کے بارے میں یہاں کوئی بھی مکمل طور پہ باخبر نہ تھا۔ اس کے اِردگرد کی آہنی فصیل اتنی ناقابلِ عبور تھی کہ میں اس تک پہنچنے کے لئے

چلتی ہی گئی۔ مجھے اپنے تجسس اور دلچسپی کا نتیجہ نکالنے میں اتنی بے قراری تھی کہ میں نے ایک بار پھر اماں سائیں کو بولنے کی ترغیب دینے کی سوچی۔ میں چیل کی پراسرار زندگی کے راز جاننا چاہتی تھی۔ چھوٹے سائیں کی موت سے پہلے تک کے بے شمار راز بھی اس کی موت کے روز جیسے منجمد ہو گئے تھے، لیکن چیل اور اماں سائیں دونوں ساکت و جامد رہیں۔

میں نے پیر سائیں کی بڑی بہن کی طرف رجوع کیا۔ اماں سائیں کی طرف رجوع کرنے والی حاجت مندوں کو تعویز دھاگہ دینے کی ذمہ داری اب اس کے کندھوں پہ تھی۔ وہ تمام زندگی غیر شادی شدہ ہی رہی۔ عرفِ عام میں اسے قرآن سے "بیاہ" دیا گیا تھا جس کا سادہ سا مطلب یہ تھا کہ وہ وراثت، جائیداد اور اپنا گھر بسانے کی ہر انسانی آرزو سے دستبردار ہو چکی تھی۔ قرآن سے بیاہی ایسی عورتیں کھاتے پیتے زمیندار گھرانے میں ہی تھیں۔ اُن کی زندگی جس دُھن پہ شروع ہوتی تھی اسے اُسی پہ ختم ہونا ہوتا تھا۔ میں کئی عشروں سے یہاں مسلسل آتی عورتوں کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ وہ آج بھی انہی مسائل کے دکھڑے رو رہی تھیں جو پچھلے اور اس سے پچھلے سال بھی ان کے سروں پہ سوار تھے، یہاں کچھ بھی تو نہ بدلا تھا۔

یہاں کسی نئی چیز کے کوئی آثار نہ تھے۔ اچانک مجھے بیوہ یاد آئی۔ اس کی کہانی تو میں نے سُنی ہی نہ تھی۔

خدا کا شکر ہے اس کے پاس تو مجھے بتانے کو بہت کچھ تھا۔ "میرا باپ ریلوے اسٹیشن پہ قلی تھا" میرے قدموں میں بیٹھتے ہوئے اس نے اپنی یادوں کو تازہ کیا۔ "میں بارہ سال کی ہوئی تو اس نے چار ہزار روپوں کے عوض مجھے ایک قبائلی بدمعاش کے ہاتھوں بیچ دیا۔ قبائلی نے مجھے پہاڑی پہ واقع ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ اس نے مجھے ہر اُس شخص کے پاس بیچا جو اگر رقم نہیں دے سکتا تھا تو ادلے بدلے کا بندوبست کر سکتا تھا۔"

اس کی کہانی بیک وقت دوسروں جیسی اور اُن سے مختلف تھی، آخر کار کسی نے تو میری دلچسپی کا سامان کیا تھا۔ میرا منتشر اور مصیبت زدہ ذہن گوری سے ہٹتے ہوئے بیوہ پہ مرکوز ہو گیا جو اپنی ہتھیلی اپنے سینے پہ یوں مل رہی تھی جیسے مالش ہی اُسے ان یادوں کے عذاب سے بچا سکتی تھی جنہیں تازہ کرنے کا حکم میں نے دیا تھا۔

"پھر مجھے ریچھ نام کے ایک شخص کے ہاتھوں بیچ دیا گیا۔ وہ واقعتاً جنگلی ریچھ نظر آتا تھا۔ اس نے مجھے بنا معاوضے کے پورے گاؤں کے حوالے کیا۔ حتیٰ کہ اس کے ایک قرض خواہ

نے شب بھر کے لئے ادھار لے کر مجھے واپس اس حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔" بیوہ چلا اٹھی، لیکن اس کے چہرے پہ درد کے کوئی آثار نہ تھے۔ وہ درد کے مرحلوں سے آگے نکل چکی تھی۔ ایک ہی جیسے درد کی شدت ہمیشہ ایک جیسی کیسے رہ سکتی ہے۔ وقت کا مرہم اسے مندمل کر دیا کرتا ہے یا پھر دوسری دردیں اس کی جگہ لے لیتی ہیں اور اس سے بڑھ بھی جاتی ہیں۔ میں سوچ رہی تھی۔

"وہ شخص دن بھر مجھ سے کھیتوں میں اور رات بھر بستر پہ کام لیتا۔ ایک روز اس نے مجھے ایک حقے کے عوض دوسرے شخص کو بیچ دیا اور یوں میری قیمت گوبر کے ان کے اپلوں کے برابر ہو گئی جنہیں میں دیواروں پہ تھاپتی اور چولہے میں جلایا کرتی تھی۔" میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ ان شکاریوں کے ہاتھوں سے کیسے بچ نکلی؟۔ ان بدروحوں پہ تھوکتے اور گالیاں نکالتے ہوئے جنہوں نے بچپن سے اس پہ سایہ کر رکھا تھا وہ بولی "بی بی اس وقت تک میں زندگی اور موت سے بے پرواہ ہو گئی تھی۔ میرے نئے مالک نے چار صندوق مجھ پہ لادے اور مجھے اپنے پیچھے لے چلا۔ موقع پاتے ہی میں نے اپنی کمر کا بوجھ اتار پھینکا اور خود ایک چشمے کے موجیں مارتے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ تیرتے اور بھاگتے ہوئے میں نے سانس تک نہ لی اور پھر ایک ویران درگاہ پہ آرکی۔"

یہ بڑا مایوس کن اختتام تھا "ہماری درگاہ؟" میں نے اُس سے پوچھا اللہ کا شکر ہے اُس نے کہا "نہیں یہ کسی اور گاؤں کی ویران اور بے آباد درگاہ تھی۔" اس امید میں کہ کہانی کبھی ختم نہ ہو گی میں نے اسے جاری رکھنے کو کہا "کئی ماہ تک میں بھکاریوں کے گروہ میں چھپی رہی۔ میں انہی کا بچا کھچا کھا پی لیتی اور وہیں اُن کے درمیان ڈھیر ہو رہتی۔ ایک روز ایک عورت اپنے بیٹے کے لئے دلہن کی تمنا دل میں لئے وہاں پہنچی اور ایک معجزہ رونما ہو گیا۔ اس نے مجھے منتخب کر لیا۔"

وہ شکل و صورت کا کیسا تھا؟ تم نے شادی پہ کیا پہنا؟ شادی پہ کون لوگ آئے؟ میں سب کچھ جاننا چاہتی تھی۔ "میں سمجھی تھی اسے خدا نے میری مدد کے لئے بھیجا تھا لیکن......" اپنا سر تھامے ہوئے اس نے گہری سانس لی اور یہ کہتے ہوئے مجھے دنگ کر دیا کہ شادی میں دولہا کوئی بھی نہ تھا۔

"دولہا نہیں تھا؟" میں نے پوچھا۔ اس نے نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا "نہیں

بی بی اس کی جگہ وہاں عورت تھی۔ کھانا پکانے، برتن دھونے اور صفائی کے بعد وہ ڈائن مجھے زنجیروں میں جکڑ دیتی اور صرف اس وقت آزاد کرتی جب مجھے ہٹے کٹے مردوں کے حوالے کرنا ہوتا تھا۔ مجھے یہ کبھی بھی خبر نہ ہوئی کہ میرے بدن میں کس کس کے جرثومے اور بیج پل رہے ہوتے تھے۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا "اگر تمہاری شادی ہی نہیں ہوئی تو تم اپنے آپ کو بیوہ کیسے قرار دیتی ہو؟" اس کے ہونٹوں پہ عیارانہ مسکراہٹ پھیل گئی "عزت اسی میں ہے ناں۔"
"ماں کے لئے تو ایسا نہ تھا؟" میں نے سوچا۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ جواب میں ضرور جھوٹ بولے گی میں نے اس سے پوچھا "کتنے مرد؟" اپنے اندر سے اس سوال کا جواب اس نے دیانت داری سے ڈھونڈ نکالا "شاید اتنے ہی جتنے کسی گاؤں میں ہو سکتے ہیں۔" میں چکرا گئی۔
بیوہ نے اپنی خوفناک کہانی جاری رکھی "میں چوسے ہوئے گنے کی طرح ہو گئی تو انہوں نے مجھ پر تھوک دیا۔ ڈائن نے مجھے گھر سے باہر نکالنے کی کوشش کی لیکن دو جوان ہوتی ہوئی بیٹیوں کے ساتھ میں کہاں جاتی۔ ایک روز اُس نے مجھ پر مٹی کے تیل کا ڈبہ انڈیلنے کی کوشش کی جو خود اسی پہ جا گرا اور میں نے دیا سلائی کو آگ لگا دی۔ وہ آگ میں جل مری اور میں آزاد ہو گئی۔"

"میں نے شکر کی سانس لی، لیکن قسمت میں آزادی کہاں لکھی تھی۔ میں دونوں بچیوں کے ساتھ پولیس سے چھپتی پھر رہی تھی کہ ایک روز اچانک ریچھ سے ٹکراؤ ہو گیا۔"
خدایا! میں نے سوچا۔

بیوہ کی کہانی ادھوری رہ گئی۔

بیچ میں ایک اور کہانی شروع ہو گئی۔

راجہ جی کو مہارانی سے پیار ہو گیا۔ جب پیر سائیں نے اس شادی کی اجازت دینے سے بھی انکار کر دیا تو راجہ جی متجسس ہوا کہ پتہ کرے کیوں؟ کیا مہارانی کو کسی سے بھی شادی کی اجازت نہ تھی؟ اُس نے اِس معاملے کا پیچھا اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اسے اس کی پوری جان کاری نہ ہو گئی۔

گوری، بیوہ، چیل، بخی بابا کی آگ، میرے پھٹتے ہوئے سر اور پیر سائیں کے پُر ہجوم بستر ہر شے کی یادیں کنارے کر دی گئیں۔ اس وقت تو کچھ بھی اہم اور ضروری نہ رہا تھا سوائے

راجہ جی کے جو مجھے بڑی تیزی سے خالی کمرے کی طرف لے جا رہا تھا۔اُس نے مجھے بیٹھنے کا کہتے ہوئے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔

میں فکر مند تھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔"تم دروازے کو بند کیوں کر رہے ہو؟ تمہارے باپ کو ایسی خفیہ ملاقات پسند نہ آئے گی۔"اس نے مجھے پھر بٹھا لیا"آپ جانتی ہیں والد نے مہاراجہ اور مہارانی کی شادی کیوں نہیں ہونے دی تھی؟"میں نے نفی میں سر ہلایا۔"میں آپ کو جلد ہی بتا دوں گا"پیر سائیں کا اس خاندان سے رشتہ وہیں تک محدود نہ تھا جتنا میں جانتی تھی۔وہ جو کچھ بھی تھا میں نے اللہ سے دعا کی کہ وہ میرے بیٹے کو اس کے باپ کے غیض وغضب سے بچالے۔اس کے من کی موج جنون میں بدلتی دکھائی دے رہی تھی۔

پیر سائیں ہذیانی کیفیت میں گرج برس رہا تھا"وہ اس خاندان کا پہلا سپوت ہے جس نے اپنے باپ کے فیصلے پر سوال کیا ہے۔ایک پاپی نے اپنا سر اٹھایا ہے۔وہ کسی صورت میرا جانشین نہیں ہو سکتا۔"میں اپنے خاوند کو خبردار کرنا چاہتی تھی کہ وہ میرے چھوٹے بیٹے سے بھی وہی کچھ کرنے کا نہ سوچے جو وہ بڑے سے کر چکا تھا۔میں اسے کتیا کے اُن بچوں کی یاد دلانا چاہتی تھی جنہیں چھوڑ دینے کے لئے اس کے باپ نے اُسے مجبور کیا تھا۔میں اسے کہنا چاہتی تھی وہ کسی کو تو یہاں خوش رہنے دے لیکن عملاً مجھے منہ سے ایک لفظ تک نکالنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

اس رات مجھے کمرے سے نکال دیا گیا اور میں باہر برآمدے میں ٹھٹھرتی رہی۔ایک گھنٹہ گذر گیا۔کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں اس خطرے سے اپنی جان کیسے بچاؤں جو پچھلے اڑھائی سالوں سے میرے سر پر لٹکتا چلا آ رہا تھا۔وہی پرانا موضوع اور وہی دوسرے مردوں کے بستر میں سونے کا انتہائی کجر دیانہ اور مخرب تقاضا۔

ابتداء میں مجھے یہ خوف لاحق تھا کہ میرا خاوند یہ بات کہہ کر دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں میں زناکار تو نہ تھی۔مجھے اس کی نیت پہ شک تھا لہٰذا میں ہاں کہنے کی جرأت کیسے کرتی۔اب مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں اسے مسلسل انکار کروں۔دونوں صورتیں خطرناک تھیں۔میں نے اسے بارہا کہا کہ "سائیں، اللہ مجھے کبھی معاف نہ کرے گا"لیکن میں کبھی کھلے الفاظ میں نہیں بھی نہ کر سکی، یہ تو میرے ذہن میں بھی کبھی نہ آیا۔

وہ میری رضا چاہتا تھا۔

اللہ میرا انکار چاہتا تھا۔

راجہ جی کو میری دعاؤں کی ضرورت تھی۔

پیر سائیں اور اللہ دو متضاد مخالف اور ایک دوسرے کے برعکس وہ انتہائیں تھیں جن کی پیروی کی جاتی۔ایک اور گھنٹہ گذر گیا اور پھر اُس نے مجھے اندر بلا لیا۔زندگی کے اگلے لمحے سے میں اسی طرح خوفزدہ تھی جیسے کوئی موت سے ہو۔اللہ سے بخشش اور معافی کے لیے خواستگار ہوتے ہوئے اور یہ دعا کرتے ہوئے کہ وہ میرے بیٹے کو بے یار ومددگار چھوڑتے ہوئے مجھے سزا نہ دے میں نے اپنے خاوند سے بالآخر کہہ دیا"سائیں میں تمہارے حکم کی تعمیل کروں گی۔"

میرے تصور کے مطابق میرا جواب سنتے ہوئے جو پہاڑ اس پہ گرنا چاہیے تھا اس کی اس نے کوئی پرواہ نہ کی، وہ ہلا تک نہیں۔

اس کے پہلو میں لیٹے ہوئے میں نے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا۔مرد کس قسم کے ہوں گے؟ وہ سالہا سال سے اس سوال کا جواب دیتا چلا آ رہا تھا۔میں جانتی تھی کہ وہ جوان ہوں گے، سدابہار۔میں جانتی تھی انہیں برقعہ پہنائے عقبی دروازے اور غسل خانے کے راستے سے خواب گاہ تک لایا جاتا۔

میرے خاوند کی بوریت کے دن ایک بار پھر ختم ہو گئے۔میں دنیا کے پراگندہ فریبِ نظر سے خوفزدہ رہا کرتی تھی۔وہ خوف اب اس ڈر میں بدل گیا کہ میرے جو کور قطعے میں اب کیا گل کھلنے کو تھا۔راجہ جی کی ضد اس گمبھیر صورت حال پہ مستزاد تھی۔

ایک صبح اپنے گیلے سلیپروں کے لئے پیر سائیں مجھ پہ پل پڑا"تم نے یہ دیکھا کیوں نہیں؟"میرے لئے اس کا جواب ممکن نہ تھا۔اس کے دن کا اس کی راتوں سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔اس معمولی فروگذاشت کے لئے مجھے جو قیمت ادا کرنا پڑی اُس نے میرے ذہن پہ چھائے اجنبی مردوں کے خوف کو کچھ دیر کے لئے دور کر دیا۔

اس سہ پہر پیر سائیں جلتا بھنتا بھرا ہوا واپس لوٹا۔مسئلہ راجہ جی کا تھا،"اگر تم نے خالی کھوپڑی والے گدھوں کے بجائے میرے لئے کوئی اور بیٹے جنے ہوتے تو میں اُسے درگاہ سے ہمیشہ کے لئے بے دخل کر دیتا۔اسے یہ احساس ہونا چاہیے کہ وہ کس کی نافرمانی کر رہا ہے۔"

فضا میں چھوٹے سائیں کی روح اترتی محسوس ہوئی۔ میں یہ بھول گئی کہ مجھے کسی بھی ایسے انسان کی حمایت کی اجازت نہ تھی جو اس کی نگاہوں میں مبغوض ہو۔ "میں اس سے بات کروں گی سائیں، میں اس سے حلف لوں گی کہ وہ آئندہ ایسا نہ کرے۔ سائیں خدا کے لئے اُسے اس دفعہ معاف کردو۔" وہ مجھے یوں گھور رہا تھا جیسے میں نے اُس پہ کوڑا برسا ڈالا تھا۔ اس کی آواز تھرائی "تم سمجھتی ہو کہ تم میرے بیٹے کو مجھ سے زیادہ کنٹرول کر سکتی ہو، اور پھر تم میں اتنی جرأت بھی ہے کہ تم اس کا دعویٰ کرو؟" میرے بال مٹھی میں لیتے ہوئے اس نے میرا سر پیچھے کی طرف کھینچا اور میری آنکھوں میں گھورتے ہوئے حکم دیا "راجہ جی سے دور رہو ورنہ اس کے کفن دفن کا بندوبست کر لو۔ میں تم پہ اس سے ملنے کی پابندی لگا رہا ہوں۔"

اس نئے بحران نے مجھے یہ بھی بھلا دیا کہ دن کے بعد کوئی رات بھی آتی ہے۔ مجھے اس کی یاد دہانی اس وقت ہوئی جب وہ سیلاب کی طرح سر پہ آ گئی۔ پیر سائیں مجھے خواب گاہ میں چلے جانے کا کہہ کے چیل کے ہمراہ عقبی دروازے کی طرف چلا گیا۔

میری نگاہیں اخبار کے اس تراشے پہ پڑیں جو اس کے پلنگ کی تپائی پہ رکھا تھا۔ گوری احمقانہ ہنسی ہنس رہی تھی پیر سائیں کی نظریں کیمرے سے چھپنے کی کوشش میں تھیں اخبار کے چوکھٹے میں جلی حروف میں لکھا تھا۔

ایک زندہ ولی اللہ۔ ناامیدوں کی امید، مساکین اور کمزوروں کی پناہ گاہ۔

میں نے نفرت سے کاغذ کو اُلٹا دیا۔ خوف سے مرتے ہوئے میں بستر پہ چلی گئی تحفظ کے لئے...... یا ذبح ہونے۔

لحاف اپنے سر پہ کھینچتے ہوئے میں نے آنکھیں بند کر لیں اور مرنے کا حیلہ کرنے لگی۔

باب ۱۰

ہیرو

مجھے کسی اجنبی کی موجودگی محسوس ہوئی۔ کوئی غیر مانوس سا ہاتھ مجھے اپنے جسم پر رینگتا محسوس ہوا۔ چیخ کو دباتے ہوئے میں نے رضائی کو اپنی مٹھیوں میں بھینچ لیا۔ پیر سائیں نے اسے اُتار پھینکا۔ آنکھیں بند کرتے ہوئے میں نے اپنے اندر سے ابھرتی ایک اور پکار کا گلا گھونٹا کسی کا بدن میرے اوپر آیا، اس کی سانسوں میں ان دانتوں کی بدبو تھی جنہیں کبھی صاف نہ کیا گیا تھا۔ اس کے بدن سے وہ بو اُٹھ رہی تھی جو کبھی نہ نہانے سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ بالوں سے بھرا اور گیلا گیلا سا تھا۔ اس کا ذائقہ منہ موڑ دینے والے خمیر کا سا تھا، اس کی کھال تیل سی چکنی تھی اور بال لیس دار۔

وحشت کا عمل ختم ہوا تو مجھے یقین تھا کہ اس کی بو اب زندگی بھر میرے ساتھ رہے گی۔ مجھے وہیں رہنے کا حکم دیتے ہوئے پیر سائیں لڑکے کو باہر لے گیا، لیکن اگلے ہی لمحے واپس آ کے مجھ سے دل لگی کرنے لگا۔ "لڑکا صرف اٹھارہ سال کا تھا، وہ اپنی جوانی میری خاطر تمہیں دے گیا ہے۔" اُس نے میرے کانوں میں سرگوشی کی۔ تسلّی کے بعد شیطان نے ایک بار پھر راجہ کے متعلق چیخ و پکار شروع کر دی۔

میں اپنے آپ کو یقین دلا رہی تھی کہ کچھ بھی نہیں ہوا، لیکن ہیرو نمبر ایک کے بدن کی سڑاند میری کھال میں داخل ہو گئی تھی۔ میں نے اسے رگڑ رگڑ کر دھویا مگر وہ قائم رہی۔ میری ہاتھوں سے اُس کے پسینے کی بو آنے لگی۔ اس کے گاڑھے تھوک کا بدذائقہ مزا میری زبان پہ رہ گیا جو ہر آتی جاتی سانس کے ساتھ محسوس ہوتا، اس کی پکڑ بھرپور تھی۔ میں اپنی تصوراتی اور وہم و گمان کی دنیا میں نکلتی تو وہاں سے بھی اسی بو کے بخارات اُٹھتے محسوس ہوتے۔

مجھے شہر کی ایک طوائف پیاری کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ جب یہ عمل بار دُہرایا گیا تو میری اصلیت اور حقائق سرے سے اوجھل ہو گئے۔ "وہ تمہیں دوبارہ کبھی نہ دیکھ پائے گا۔" میرے خاوند نے مجھے کہا۔

اُس نے لڑکیوں کو بھی اس راز کی خبر نہ ہونے دی۔ یہ واحد چیز تھی جس میں کوئی تیسرا ہمارا شریک کار نہ تھا۔ لیکن نہیں، مجھے خیال آیا اس معاملے میں بھی چیل اس کی ہمراز تھی۔

وہ راستہ جسے میرے خاوند نے میرے لئے زبردستی منتخب کیا تھا جلد ہی میری گردن کا پھندا ہو گیا۔ میری کمزور فطرت کو کراہیت اور حقارت سے دیکھتے ہوئے اُس نے مجھے گندے خون والی کنجری کہنا شروع کر دیا۔ یہ میرے والد کے نام پہ دھبہ تھا، لیکن اس کے باوجود میں اپنے خاوند کو خوش رکھنے کے لئے کوشاں رہی۔ ہیرو نمبر ایک کے بدن کی بو دوسرے مردوں کی گاڑھی مشک میں گڈمڈ ہوتی میری ہڈیوں کے گودے میں داخل ہو رہی تھی اور میں ایک سے دوسرے مرد کی آغوش میں جا رہی تھی۔

"سرخ جوڑا پہنو" میرے خاوند نے حکم سنایا اور میں تیار ہو کے کسی بدکردار عورت یا خونخوار چمگادڑ کی طرح اس بھدے مرد کی طرف آئی جو بستر پہ اسی انداز میں پڑا ہوا تھا۔ پیر سائیں اس وہسکی کو چھو بھی نہ رہا تھا جس کا گلاس میرے ہاتھوں میں دیکھ کے وہ سراپا مسرت ہو جایا کرتا تھا۔

اس کی حسیں ہمیشہ بیدار اور تیز رہیں۔

دوسری طرف میں نے دھند کی کان میں تیسرا جام انڈیلا اور مدہوش ہو گئی۔ مجھے ہوش آئی تو میں کمرے کے ایک کونے میں اور پیر سائیں بستر پہ خراٹے بھر رہا تھا۔

کیا گذری تھی؟

مجھے چیل یاد آئی جو ایک کالے کلوٹے لڑکے کے ساتھ ڈریسنگ روم کے راستے اندر داخل ہوئی تھی۔ مجھے یاد آیا جب وہ بلا میری طرف بڑھی تو میں فرش پہ گر گئی تھی۔ "اس سے پہلے کہ میں تمہاری گردن توڑ ڈالوں، کھڑی ہو جاؤ" پیر سائیں کی آواز آئی۔

وہ بیدار ہو گیا تھا۔

"تم نے رات کو زیادہ پی تھی" اس کا لہجہ میرے لئے حیران کن تھا۔ وہ کچھ بڑبڑایا۔ شاید اس نے مجھے دودھ پینے کو کہا تھا۔ میں امید و بیم کے کنارے پہ کھڑی سوچ رہی تھی وہ ابھی مجھ پہ پل پڑے گا لیکن وہ خاموش رہا۔

"رک جاؤ" اس رات میں الماری میں چابی گھما رہی تھی کہ اس کی آواز آئی وہ عین نشانے پہ تھا۔

آرزو کو کچلنا مجھے دیوانہ کر سکتا تھا۔ جادوئی دارو اور وہسکی کی عدم موجودگی میں حقائق اتنے ہی عیاں اور واضح ہو گئے جیسے میرا ننگا بدن۔

پانچ نمبر ہیرو کی موسموں کی تپائی ہوئی کھال اس علاقے کی نمائندہ تھی جہاں کا وہ باسی تھا۔ مردہ چمڑی کی تہوں پہ جھیں، گلٹیاں، چنڈیاں، رسولیاں، گوشت کے ڈھیلے ابھار اور کٹی پھٹی کہنیاں جیون بھر نظر انداز ہوا کوئی بدن میرے اوپر سوار تھا۔ میرا ہر خلیہ اور مسام اس کے نیچے دبتا چلا گیا۔

میں لہسن اور پیاز کی بو سے لدی پھندی سانسوں کو پی رہی تھی جب کہ اس کی گرد آلود اور سخت کھردری ایڑیاں کھنکتی ہوئی سوکھی مٹی کی طرح میری نرم و نازک کھال پہ یوں چل رہی تھیں جیسے کوئی زخموں پہ سہاگہ پھیر رہا ہو۔ میری نگاہیں اُس کے پاؤں کے ایک ناتراشیدہ ناخن پہ اٹک گئیں۔ وہ ٹوٹا اور اکھڑا ہوا تو تھا ہی اس میں سیاہ میل بھی بھری ہوئی تھی۔ تصور ہی تصور میں ابھرتا اور پھیلتا وہ میرے پورے ذہن پہ چھا گیا۔ وہ ہاتھ پاؤں مارتا تھا، کبھی مجھے نوچتا کبھی پنجے مارتا۔ اس خوفناک صورتِ حال میں کیا ستم ظریفی پنہاں تھی کہ مجھے اپنے بیٹے سے ملنے کی تو اجازت نہ تھی، لیکن......

پیر سائیں ہماری فلم بنا رہا تھا۔ وہ دھنیں اور ساز تیار کر رہا تھا، ہدایات دیتا، غصہ نکالتا، انسانی ذہن میں جو کچھ بھی آسکتا ہے وہ ہم سے اُس پر عمل کروا رہا تھا۔

جلتا ہوا میرا بدن چھل مارتے ٹھنڈے پانی میں یوں چھن چھنایا جیسے لال انگارہ کوئلوں کو شاور کے نیچے رکھ دیا گیا تھا۔ کیا شیطان کے ساتھ اس معاہدے کو اللہ کا تحفظ حاصل تھا؟ میں سوچتی اور اپنے نصیبوں کو روتی رہی۔

کیا خدا چاہتا تھا کہ میں شیطان کے بندھن میں بندھی رہوں؟

میں کس کی پیروکار تھی؟

پیر سائیں نے ایک رات دو لڑکیوں کی فلم بنائی اور میں چونکہ بناپئے ہوش میں اور سنجیدگی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی مجھے قے آ گئی۔

میں کسی گٹر کی تہہ تک گر چکی تھی۔ زندگی کی رہی سہی قوت کو زیرِ استعمال لاتے ہوئے میں اپنے آپ کو گھسیٹتی رہی۔ بالآخر جب پورے ایک ماہ تک اس نے ہر پوز اور زاویے سے ہماری فلم تیار کر لی تو کیمرہ اور ٹیلی وژن دونوں بند کر دیئے گئے۔

راجہ جی نے آخر کار مجھے کنویں کے عقب میں پکڑ لیا اور حالات کی حقیقت جاننے کے لئے اصرار کرنے لگا۔

"میرا باپ برائی کی کن حدوں تک جانے کی صلاحیت رکھتا ہے؟" اُس نے سیدھے سبھاؤ سوال کیا۔ اس کے الفاظ کسی ٹوٹ پڑنے کو تیار قیامت کا نشان ہو سکتے تھے۔ میں ایک سے زیادہ وجوہات کی بنا پر خاموش تھی۔

"اماں تمہیں یہ بتانے کے لئے تو وقت کی ضرورت نہیں، تم جانتی ہو۔" زور تم جانتی ہو، کے الفاظ پہ تھا یا میرے اعصاب پر۔ میں نے اپنے بیٹے کے سوال پہ غور کیا لیکن جواب دینے سے جھینپ گئی، پھر اچانک سب ہی ہیرو میری نگاہوں میں لہرائے اور میرے دل میں اپنے خاوند کی اصلیت ظاہر کرنے کی تمنا ابھری۔ تمہارا باپ شیطان کے ہر کام کی صلاحیت رکھتا ہے، میرے دل میں جواب ابھرا، لیکن میں خاموش رہی۔ اس کے بجائے میں نے اپنے بیٹے کی منت کی کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کرے، جس سے مالک ناراض ہو۔

"وہ تمہاری کھوپڑی توڑ کے تمہارے مغز کا قیمہ کر دے گا تاکہ تم اپنے بھائی کی طرح تنہائیوں اور ویرانوں میں کھو جاؤ۔" میں نے اسے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ راجہ جی چلا گیا لیکن بدگوئی میرے ذہن پہ چھائی رہی۔

میں اللہ کے حضور روئی اور چلائی۔ "یا اللہ! تو اتنا دور کیوں لگتا ہے کہ لوگ تجھے چھوڑ کے تیرے ہی پیدا کردہ انسانوں کی قبروں کی طرف رجوع کر لیتے ہیں؟ درگاہ کی روحیں اپنے جہنم کے خلاف میرا ساتھ کیوں دیں گی میرے پاس تو یہ چوائس بھی نہیں۔ یا اللہ! تو خود ہی میری دعاؤں کا جواب دے، ابھی جواب دے۔"

بظاہر پیر سائیں اللہ کے تصرف سے باہر تھا۔ کہنے کو وہ اللہ کا سفیر تھا لیکن حقائق تو کچھ اور ہی تھے۔ میں سوچا کرتی کہ خدا اُسے اپنا مُقدس نام یوں استعمال کرنے کی اجازت کیوں دیتا تھا؟ عام فانی انسان بھی اس کی اجازت کہاں دیتے ہیں۔ میری سمجھ سے یہ بات بالاتر تھی کہ اللہ ظالموں کی رسی دراز رکھتے ہوئے انہیں قائم ودائم کیوں رکھتا ہے۔

دائی نے جوبات کی وہ اس کا جواب ہو سکتی تھی، کربلا کے ظالم اور فاسق یزید کو کبھی سر درد تک نہ ہوا تھا اس لئے لوگ کہا کرتے تھے، کہ اس پہ اللہ کی خصوصی رحمت ہے، لیکن یہ صورتِ حال کی غلط اور گمراہ کن ترجمانی تھی۔ درحقیقت اللہ نے اُسے بالکل چھوڑ دیا تھا، میں نے اس سے پوچھا، تو پھر وہ ان ظالموں کو ایسا اقتدار اور قوت کیوں دیتا ہے کہ وہ اس کے پیاروں پہ ظلم وستم ڈھائیں؟

دائی نے جواب دیا، روزِ قیامت سے پہلے یہی تو ترازو ہے۔ اس روز وہ ان طاقتور لوگوں کو ان کے کمزور اور ضعیف لوگوں سے سلوک اور رویے کی بنا پر پرکھے گا۔

میں مطمئن نہ ہوئی اور پھر اسی سوچ میں ڈوب گئی خدائی تائید آیا میرے مصائب کے پیچھے تھی یا پیر سائیں کی طاقت اور خوشحالی کو حاصل تھی، اگر نہیں تو کیا یہ سب کچھ بنا سبب کے وجود میں آرہا تھا۔

مذہب کے بارے میں میرا ذہنی انتشار اور کنفیوژن تیز تر ہو گئی۔

میں کہاں جاتی؟

اللہ کی طرف

اللہ کے دروازے تو بند تھے۔ خودکشی حرام تھی۔

میں اتنی رقت سے رحم کی بھیک کے لئے التجائیں کر رہی تھی کہ وہ مجھے ساتوں آسمان تک لے جانے کے لئے کافی تھیں، لیکن اللہ انہیں سُن نہیں رہا تھا۔ میں دعاؤں پہ دعائیں مانگتی رہی یہاں تک کہ طاقت اور اقتدار کے مالک کی خاموشی نے مجھے اس سے دور ہٹا دیا۔ اللہ جو ہر جگہ موجود تھا مجھے یوں لگا جیسے کہیں بھی نہیں تھا۔ خدا کا کوئی وجود نہیں، مجھے خیال آیا۔ میں اس نتیجے پہ پہنچی کہ گوری کی طرح پوری دنیا بھی اندھیرے میں تھی۔

اس رات میں نے اسلام کو خیر باد کہتے ہوئے سرخ جوڑا پہنا۔ خدا تو ایک اخلاقی رکاوٹ تھا، دینی احساس جرم محض بلیک میل اور ہتھکنڈا۔ جب خدا ہی نہیں تو پھر گناہ کا کیا تصور!

چونکہ اللہ نے میرے خلاف ہونے والے جرائم کو روکا نہیں تھا یا وہ انہیں روکنا نہیں چاہتا تھا یا وہ انہیں روک نہیں سکتا تھا تو پھر کم از کم میرے لئے تو ظاہر ہے وہ تھا ہی نہیں۔ میں جوانیوں کے رس چیتی قیامت تک پُرشباب رہ سکتی تھی پھر ہی شاید وہ کہیں ظاہر ہو، لیکن میرا خیال تھا وہ پھر بھی ظاہر نہیں ہوگا۔

میں کسی بھی ہیرو کو سچے جذبوں کے ساتھ جواب نہیں دے سکتی تھی۔ ہر اس ہاتھ کے لئے جو میری طرف بڑھتا میں ایک مشین کا کام دیتی رہی لیکن ہیرو نمبر چھ میرے دیوانے وار تعاون اور پُرجوش جواب سے دنگ رہ گیا۔

پیر سائیں تو اچھل ہی پڑا۔ وہ مجھے فاتحانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور اس کی زبان کسی پاگل کتے کی طرح لٹکی ہوئی تھی۔ نہ تو مجھے بونے پریشان کیا نہ ہی پسینے میں میں کسمسائی،

اس کا تھوک؟ وہ بھی برداشت کر لیا۔

میرے خاوند نے پوچھا "اب تو تم لوگوں میں تمیز کر سکتی ہو۔ اب بتاؤ تمہیں کس قسم کا مرد پسند ہے؟" میں نے محتاط انداز میں جواب دیا "وہ جس سے بدبو نہ آئے، سائیں۔" اس روز کے بعد میں نہار منہ باسی بو کے وہ ہولے لیتی رہی جن میں پسینے میں گندھی ٹیلکم پاؤڈر کی وہ گاڑھی بو بھی ہوتی جو سانس لینا محال کر دیتی۔ پیر سائیں اُن سب کو غلیظ گالیاں دیتا "میں انہیں اُلٹا لٹکا دوں گا تاکہ انہیں غسل کے معنی کبھی نہ بھولیں۔" اگلے ہیرو کے بدن سے صابن کی مہک آ رہی تھی۔ میں حیران تھی میرے خاوند نے کس انداز میں سزا پہ عمل در آمد کروایا تھا۔

ساتویں ہیرو کے بعد ورائٹی ختم ہو گئی اور اب وہ باریاں بدل بدل کے یوں آنے لگے کہ اُن کی پہچان ہی ختم ہو گئی۔ وہ نہ ہوتے تو میرا خاوند ان کی جگہ ان کی فلمیں دیکھتا۔ جب وہ ان سے اُکتا جاتا تو بیوہ کی دونوں بیٹیاں بلالی جاتیں۔ جب وہ اس غیر معمولی تجربے سے بھی تنگ آ جاتا تو پھر میں کئی کئی گھنٹوں کی مشقت سے اُسے بہلائے رکھتیں۔

اللہ کا کرم ہوا کہ وزیرِ اعظم نے اپنے کسی قابلِ اعتماد بندے کے ہاتھوں اسے بلا بھیجا، لیکن وہ دو ہی روز بعد مزید ملبوسات اور ان عجیب و غریب آلات سے لدا پھندا گھر لوٹ آیا جنہیں دیکھ دیکھ میں شرم کے مارے لال ہوتی رہی۔ اس نے مجھے سوٹ کیس سے فلمیں نکال لانے کو کہا جن کی تعداد ہماری زندگی بھر کے لئے کافی تھی۔

"مزار سے ایک خفیہ راہ مہمان خانے تک جاتی ہے آج رات تم میرے ساتھ وہاں چلو گی۔" میں زنداں سے باہر نکلنے کے لئے اتنی پُر جوش تھی کہ میں نے وجہ جاننا ضروری نہ سمجھا۔

افسوس! باہر نکلنے کا مطلب کچھ بھی نہ تھا۔

چیل اور اپنے خاوند کی موجودگی اور میرے برقعے کی نقاب کے دو چھوٹے چھوٹے سوراخوں نے میری دنیا کو اسی طرح محدود رکھا جیسے وہ تھی۔ ایک ایک قدم گنتے ہوئے میں اس کے ساتھ کوئی پانچ سو باسٹھ قدم چلی اور منزل آ گئی۔

ہم ایک ایسے کمرے سے گذرے جہاں فرش پہ ایک گنجلک سے نمونے والا قالین تھا اور چھت پہ ایک فانوس لٹک رہا تھا۔ دوسرے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے پیر سائیں نے مجھے برقعہ اتار ڈالنے کو کہا۔ بستر پہ دراز گل مچھوں والا ایک شخص چھلانگ لگاتے

ہوئے اٹھا۔ میرے طرف گھورتے ہوئے وہ با آواز بلند میرے خاوند سے مخاطب ہوا "سائیں بادشاہ تیری بزرگی کو سلام۔ کیا شے ڈھونڈ نکالی ہے۔ کیا نایاب ہیرا ہاتھ آیا ہے۔" اس کا بالوں سے اَٹا لمبا اور بھاری بازو کیکڑے کی طرح میری کمر کے گرد حمائل ہو گیا۔

وہ اپنی بدمست آنکھیں مٹکاتے ہوئے میری گردن پر اپنی رال اور دانتوں کے نشان چھوڑتا جا رہا تھا۔ "میری جان، میرے ہیرے مالک نے تجھے کہاں سے ڈھونڈ نکالا، میری پوری زندگی گذر گئی تو کہاں تھی۔" وہ بُڑبُڑا رہا تھا۔ میرے خاوند کی کھلکھلاہٹ اس کے دوست کے تھوک بھرے ہونٹوں سے کہیں زیادہ قابلِ نفرت تھی۔

وہ جاگیر دار تھا۔

بادشاہوں کی سی عزت اور وقار کا مالک۔

لوگوں کے یہ نام نہاد رکھوالے اور نگہبان جو مذہب کے نام پہ تقدس اور عقیدت کے حامل تھے میرے برقعے تلے اپنے گناہوں کو چھپائے ہوئے تھے۔ پیر کی تقدس ماب بیگم کو تو کبھی کسی نے دیکھا ہی نہ تھا۔ یہ اسی برقعے کا اعجاز تھا کہ وہ شہر کی ایک طوائف کے نام سے متعارف کروائی جا رہی تھی۔

جاگیر دار کی موٹی موٹی انگلیاں میرے بدن پہ کالے چوہوں کی طرح پھر رہی تھیں لیکن میرا ذہن پردے کے اس تصور میں الجھا ہوا تھا۔ پردے کے پیچھے سے نہ تو کسی کو مدد کے لئے پکارا جا سکتا تھا اور نہ ہی کوئی اُسے سنتا۔ ایک بے آسرا جنس ممنوعہ دنیا کے جال میں پھنسی ہوئی تھی۔ نقاب کے پیچھے ہر برائی روا تھی، جب بھی یہ اٹھتی اس کے پیچھے کوئی بے چہرہ اور گمنام عورت ظاہر ہوتی جس کی اپنی کوئی شناخت نہ ہوتی۔

جاگیر دار کے موٹے بھدے تھوک بھرے ہونٹ میری گردن پہ چپ چپ کر رہے تھے اور میں اندر ہی اندر چیخ چلا رہی تھی۔ جانتے ہو میں کون ہوں، سور کی اولاد، دیکھو تو سہی میں کون ہوں۔

گوشت کے کھردرے اور ناہموار پہاڑ کے تلے دبے ہوئے میں پردے کے متعلق سوچ رہی تھی جو مردوں کے گناہوں کو ڈھکے ڈھانپے ہوئے تھا۔ برقعہ اوباش مردوں کے لئے لائسنس کا کام دے رہا تھا۔ اس وقت مجھے بہت سی ان عورتوں کا خیال آیا جو اسی قسم کے جرائم کا نشانہ تھیں۔ میں دل ہی دل میں جاگیر دار پہ چلائی "او حرامی! آنکھیں کھول، میں تیرے

مالک کی منکوحہ ہوں، اس کے بچوں کی ماں، مجھے دیکھ، مجھے پہچان۔“

میں اپنی ذہنی موت کے قریب تھی کہ ایک دن اچانک میرے خاوند نے کہا ”مَے خانہ جاری ہو سکتا ہے۔“ مجھے تصور سے کہیں زیادہ مسرت ہوئی۔ ساتھ ہی اس نے بتایا کہ دار الحکومت سے مہمان اسی رات آ رہے تھے۔ وہ انہیں خاص اہمیت دیتے ہوئے ان کی تواضع کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اس کا مطمع نظر صرف جنس ہی ہو سکتی تھی۔

کاجل میری پتھرائی ہوئی آنکھوں کے جالوں کو چھپائے رکھتا۔ پاؤڈر میرے چہرے کی شکنوں سے پھوٹ رہا ہوتا، میرا کالا لباس تو محض تکلف ہی تھا۔

سرخ لپ اسٹک، پنسل کے کھینچے ہوئے ابرو اور بھاری پرفیوم کے ساتھ میں ایک باقاعدہ لائسنس یافتہ طوائف کا روپ دھارے ہوئے تھی۔

میں ایک بار پھر اسی چھت تلے کھڑی تھی جو میں نے جاگیر دار کے ساتھ شیئر کی تھی۔ میرا خاوند مجھے عظیم الشان ڈرائنگ روم میں انتظار کرنے کا کہہ کے چلا بھی گیا، لیکن اب بھی وہاں سے مشک کی گاڑھی خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے اوپر شیشے کے فانوس میں دیکھا تو مجھے اپنا وجود ہزاروں طوائفوں کی صورت دکھائی دیا۔ پیر سائیں دو اجنبیوں کے ساتھ اندر آیا، میں نے اپنی سانس روک لی۔

اُن میں سے ایک آدمی جو جنگلی بھینسے کے جیسا تھا سیدھا میری طرف آیا۔ اس نے مجھے یوں جکڑا کہ میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ ”اچھا تو تم میرے لئے ہو۔ ذرا کہو کہ تم صرف میرے لئے ہی وقف رہو گی۔ ٹھیک ہے میری حسینہ؟“ اس نے ہوس بھرے انداز میں کہا۔ جب اُس نے مجھے چھوڑا تو میں نے دیکھا دوسرا امرد بہت خوبصورت تھا۔ جب پیر سائیں نے مجھے پیاری کے نام سے بلاتے ہوئے اپنے دوستوں کی عیاشی طبع کے لئے ہدایات دیں تو اس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔

”میں نے انہیں ضمانت دی ہے کہ تم مُردوں کو بھی زندہ کر سکتی ہو“ اس نے قہقہہ لگایا۔ میں اس شخص کی طرف بڑھی جو مجھے اتنی سنجیدگی سے دیکھ رہا تھا لیکن وہ تناؤ کا شکار ہوتا ہوا مجھ سے دور ہٹ گیا۔ میرے خاوند نے مجھے بلایا۔ میں نشے میں لڑکھڑاتی ہوئی اس کی طرف بڑھی...... ”اب شروع کر دو“ سرگوشی کے دوران اس کی گرم سانس میرے کان کے اندر دور تک جاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کمرے کے درمیان کھڑے ہو کر میں نے میوزک کی

دھنوں کے ساتھ اپنا زیور، اتارنا شروع کر دیا۔

میرا خاوند کسی بادشاہ کی طرح یہ شو دیکھ رہا تھا۔

یہ سوچتے ہوئے کہ اس نے اللہ کے ننانوے ناموں والی چادر کیوں نہیں اوڑھ رکھی تھی میں نے اپنے نام نہاد لباس کو اتار پھینکا۔

بھینسا جنون کی حد تک پُر جوش تھا۔ وہسکی کے گلاس پہ گلاس چڑھاتے ہوئے وہ انتہائی بیہودہ انداز میں میری تعریف کرتے ہوئے میرے ہوائی بوسے لے رہا تھا۔ میں اپنے بازو کسی پرندے کے پروں کی طرح پھیلائے کمرے میں ناچ رہی تھی۔ کاش میں واقعی کوئی پرندہ ہی ہوتی۔ ناچتے ناچتے میں ایک بار پھر ان دونوں مردوں کے بالمقابل جا پہنچی۔ میرے خاوند کا ہاتھ اس کی توند پر تھا اور وہ اسے اس پر ایک دائرے کی صورت میں پھیر رہا تھا۔

میں بار بار کمرے کے چکر لگاتی رہی تھی حتیٰ کہ اس کا ہاتھ رُکتے ہی میں بھی رک گئی۔

یہ میرے لئے اشارہ تھا۔

اگلے ایکٹ میں میں پہلے اِدھر اُدھر گرتی پڑی، پھر کمر کو بل دیتے ہوئے کبھی پیچھے اور کبھی آگے کو جھکتی رہی اور پھر سیدھی زمین پہ کمر کے بل۔ جب میں دوبارہ بل کھاتی کھڑی ہو رہی تھی تو میں نے خوبصورت مرد کی نگاہیں اپنے وجود پر مرکوز پائیں۔ میری نظریں اس کی نظروں کو کاٹ رہی تھیں۔

بڑی دلبرانہ بہکا دینے والے انداز میں میں فرش پہ تیرتے ہوئے اُس کی طرف بڑھی اور اس کی ٹانگ کو اپنے پاؤں سے چھوا وہ پیچھے ہٹ گیا۔

اپنی ان نازیبا حرکتوں کے درمیان میں اُسے بغور دیکھتی رہی، وہ ایسا کیوں کر رہا تھا، پھر اچانک بجلی کی رو سی میرے پورے بدن میں دوڑ گئی۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا دیا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز تر ہو گئی۔

پیر سائیں نے اپنے دوست کا غیر معمولی رِدِعمل بھانپ لیا تھا۔ اس نے مجھے سنبھلتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔ انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے اُس نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ خوفزدہ ہوتے ہوئے میں اس کی طرف مُڑی۔ میرا بدن فرش سے رگڑ کھا رہا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے عقب میں موجود خوبصورت مرد کی آنکھیں میری کمر کو جلا کے راکھ کر ڈالیں گی۔

میرے خاوند نے میرے کان میں نئی ہدایات سنائیں۔ پیر سائیں کے خوف اور کڑی ہوئی نگاہوں والے مرد سے شرمندگی کے احساس کے درمیان الجھے ہوئے میں پھنسنے کو مزید بھڑکانے کے لئے بڑھی۔ میری روح پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

"تم سا کوئی نہیں۔" وہ چلاتے ہوئے مجھ پہ سوار ہو گیا۔ "میرے دوست یہی تو وہ مال ہے جو تمہیں آسمان پہ ملے گا۔" تقدس مآب روحانی راہنما میرے خاوند نے پیشین گوئی کی۔

خوبصورت مرد خاموشی سے باہر نکل گیا۔

میرے ارد گرد غلیظ شور اور میرے اندر ایک طوفان برپا تھا۔ اس کے بعد پھنسنے نے مجھے رقم تھمانا چاہی تو میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ میرے گال پہ چٹکی بھرتے اور نوٹوں کا بنڈل میری ہتھیلی میں دیتے ہوئے اس نے مجھے رجھانے کی کوشش کی "پیاری پیر سائیں کے اذن کے بغیر میں کبھی یہ جسارت نہ کرتا۔ یہ تو تمہاری آسمانی خدمات کا صلہ ہے۔"

حویلی کی طرف واپسی کے دوران میں اپنے قدموں کا حساب نہ رکھ سکی۔ میرا دل کسی چیز میں بھی نہ لگ رہا تھا۔ میں نے چیل کے متعلق بھی نہ سوچا جو اپنی آنکھوں میں بنا کسی سوال کے عقبی دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

پیر سائیں گہری نیند میں خراٹے بھر رہا تھا۔ میں نے سچائی کو اس کے طلوع ہوتے ہی دور کہیں اپنے دل میں بند کر ڈالا تھا۔ اب میں اسے آزاد کر رہی تھی۔ خوبصورت مرد چاندی کے بھائی کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

وہ رانجھا تھا۔

بالوں کی بڑھتی ہوئی سفیدی اور مقابلتاً پختہ اور سنجیدہ چہرے کے علاوہ وہ ویسا ہی تھا جیسی میرے دل میں اس کی تصویر۔ حویلی کا دروازہ کھل گیا تھا۔ اس فکر اور تشویش سے آزاد جو دو چاہنے والوں کے ملن کی راہ میں حائل ہوتی ہے میں اس کے بازوؤں میں آ گئی تھی، اگر وہ چاہتا تو ہم شب بھر اکٹھے رہ سکتے تھے، لیکن پیار کی کہانی تصور سے کہیں زیادہ پُر پیچ ہو چکی تھی۔

کوئی تصویر بھیانک سپنا بن گئی تھی۔

وہ تو ایک طوائف سے ملا تھا۔

اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں وہ عورت تھی جس سے کبھی اس کا بیاہ ہو سکتا تھا۔ وہ میری شناخت سے باخبر تھا۔ سالہا سال قبل کی ایک نگاہ نے پردے کا راز فاش کر دیا تھا۔ مہر

ٹوٹ گئی تھی اور سچائی ظاہر ہو کر رہی۔

کوئی زخم کھل گیا تھا۔

بے راہروی ثابت ہو گئی تھی۔

اس بیہودگی اور فحاشی کے خلاف میرے پاس کیا جواز تھا؟

میری یہ حرکات بظاہر کسی قسم کے دباؤ تشدد یا خوف کے بغیر تھیں۔

مجھے اس کی سمجھ نہ آ سکی کہ دنیا بھر کے مردوں کی موجودگی میں رانجھے کو ہی یہاں آنا تھا۔ میں نے بہت سے طریقوں کی مدد سے اُسے ملنے کا سوچا لیکن یہ سب ناممکن تھے۔ پیر سائیں کی موجودگی میں بجی کسی اور محفل عیش و طرب میں ہی یہ ممکن ہو سکتا تھا، لیکن اس تصور کے ساتھ ہی میری تمنا بجھ سی گئی۔

میری آرزو تھی وہ لوٹ آئے۔

میری آرزو تھی وہ نہ آئے۔

اس کی نگاہوں میں یوں آنے کے بعد میرا جی چاہا میں مر جاؤں۔ میرا ذہن پیچھے پڑ گیا کہ اب میں ہار مان لوں۔ میری روح فرار سے انکاری تھی۔ مجھے اپنے جینے یا مر جانے کے مقابلے میں رانجھا کو دیکھنے کی زیادہ بے قراری تھی۔

میں کیا کروں؟

میں کیا کر سکتی ہوں؟؟

میرے ذہن میں سوال اٹھتے رہے کسی ضعیف، لیکن ستر سالہ بڑھیا کی طرح میں ہر طرف سے بہری ہو گئی۔ میرے ذہن میں اور کسی چیز کا خیال نہ رہا۔ ہر چیز مجھے براہ راست اسی خوفناک معاملے کی طرف لے جاتی۔ دو ماہ گزر گئے۔

میں تنگ جگہوں کے نفسیاتی خوف میں مبتلا ہو گئی۔ میری سانس پھول جاتی، کھینچ جاتی اور میں صحن جیسی کھلی جگہ پہ بھی پھڑ پھڑانا شروع کر دیتی۔ بے وقوف ڈاکٹر نے دمے کی تشخیص کی۔

ہر رات دارو مجھے کچھ دیر کے لئے تیز کرتی، لیکن اس کے بعد میں ربڑ کی سی گڑیا کی طرح مڑتی تڑتی رہتی۔ پیر سائیں تھک ہار کے سو گیا، لیکن میں رانجھا کے متعلق سوچتی رہی پیار کی اس کہانی کے متعلق جو حرص و ہوس کے اس کھیل کے درمیان چل پڑی تھی۔

یقیناً برائی ہمیشہ کے لئے غالب نہیں رہ سکتی۔

مجھے اچانک اللہ کے وجود کی ضرورت محسوس ہوئی۔

میں اپنے گناہوں اور اللہ سے دوری پہ لرزتی رہی۔ میری مدد کسی انسان کے بس کی بات نہ تھی۔ صرف اللہ ہی کسی معجزے کو وجود میں لا سکتا تھا۔

طاقت اور عظمت والا! میں اُسے چھوڑ گئی تھی کیونکہ اس نے جو مجھے چھوڑ دیا تھا وہ لوٹ آیا۔

لیکن یہاں رہتے ہوئے میں اُسے کیسے خوش رکھ سکتی تھی جب کہ یہاں بھلائی کا تصور محض ایک تمنا ہی ہو سکتا تھا۔ اس جگہ جہاں گناہ سے فرار کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

اللہ اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

پیر سائیں اپنی طرف۔

دو ایک کو کھینچ رہے تھے۔

پیر سائیں طاقتور ثابت ہو رہا تھا۔

لیکن صرف اللہ ہی میرے رانجھے کو مجھے لوٹا سکتا تھا۔ مجھے صرف اللہ کی ضرورت تھی۔ میں نے آزادی کے دوسرے راستوں پہ غور کیا۔

کیا میں فرار ہو سکتی تھی؟

لیکن کہاں؟ ماں کے گھر؟

وہ مجھے کہاں رکھتی اور کس جگہ؟ پھر کیا ہوتا؟ مالک مجھے آلیتا۔

کیا مجھے ہیروز کے ساتھ کوئی اور رات بھی بسر کرنا تھی؟

اللہ مجھے معاف نہیں کرے گا۔ اللہ میری مدد نہیں کرے گا۔

رانجھے کو میری ضرورت نہ ہو گی۔

اللہ کی واپسی سے میں سست رو ہو گئی اور پیر سائیں کی گرج چمک بڑھ گئی، احساس جرم مجھ پہ بری طرح سوار ہو گیا، میری سوچیں بدل گئیں میں ہر روز اللہ کی طرف رجوع کرتی ہر شب شیطان مجھے اپنے تاریک غار میں گھسیٹ لے جاتا۔

"تم بوڑھی ہو گئی ہو۔" میرا خاوند مجھ پہ طنز کرتا اور میں دل ہی دل میں اس سے پوچھتی جوانی کے کشتوں اور شربتوں کا کیا ہوا۔

چولہے کے آگے دھرنا مارے بیٹھی میں اس کے لئے باداموں کی ٹھنڈائی تیار کر رہی تھی۔ ہر بادام کو چھیلتے اور نسخے کے اجزاء کو تولتے ہوئے میں نے دو مکڑیوں کو آپس میں گڈمڈ دیکھا۔ گھی کا تجسّس میرے اندر در آیا۔ پیر سائیں کی عیاشی طبع کے لئے حشرات الارض کے جوڑے اکھٹے کئے جا سکتے تھے۔ اپنی اس سوچ پہ میں ہنس دی حالانکہ میں تو رو رہی تھی۔

مکڑی کسمساتی ہوئی مکڑے کے پنجے سے نکل کے بھاگ کھڑی ہوئی، پھر اچانک وہ واپس مڑی اور اپنے اس ساتھی پہ جو اس کی توقع نہ کر رہا تھا حملہ آور ہو گئی۔ اُس نے اسے ڈنک مارا اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ جب اس کا شکار مرنے کے بعد اُلٹا ہو گیا تو کالی "بیوہ" مکڑی اپنی سینکڑوں ٹانگوں کو ہلاتی غائب ہو گئی۔

اس کے ساتھ ہی میرے ذہن نے بھی جیسے صدیوں کا فاصلہ یکدم طے کیا۔

چھوٹے سائیں کے برعکس میرے چھوٹے بیٹے نے مہارانی سے شادی کے لئے اپنی تمناؤں کا گلا گھونٹتے ہوئے اپنے باپ کو راضی کر لیا اور ایک بار پھر اس کے پہلو میں آ بیٹھا۔ پیر سائیں نے بہ امر مجبوری اسے دوبارہ قبول کر لیا، کیونکہ اس کے کوئی اور اولادِ نرینہ نہ تھی۔ اس نے ماں بیٹے کی ملاقات پہ پابندی کی سزا بھی ختم کر ڈالی۔ میرا بیٹا اب کچھ بڑا لگتا تھا لیکن عقل و دانش کے حوالوں سے نہیں۔ اس کی اپنے باپ سے مشابہت حیران کن تھی، لیکن وہ اس کی طرح کی سرد مہری سے محروم تھا۔ شاید اس لئے کہ ابھی تک وہ اس کے جیسی قوت اور طاقت سے محروم تھا۔

"اپنے باپ کی رضا حاصل کرنے کے بعد کیا تم سکون محسوس نہیں کرتے؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"آپ کو اسے خوش رکھتے ہوئے سکون ملتا ہے؟" اس نے جوابی سوال کیا میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

میں نے اسے بیاہ کا مشورہ دیا۔ "بیوی تمہاری زندگی کے خلا کو پُر کر دے گی اور مجھے کھیلنے کے لئے بچے مل جائیں گے۔"

وہ طنزیہ ہنسا "اماں جب تک وہ زندہ ہے آپ کو کھیلنے کا موقع نہیں مل سکتا۔" میں دنگ رہ گئی۔ اشاروں کنایوں میں وہ وہی بات کہہ گیا تھا جو مکڑے کی موت کے وقت میرے ذہن میں آئی تھی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔ راجہ جی کی آنکھوں میں مجھے اپنا جواب نظر آ رہا تھا۔

"اماں آپ کھیل کے جس عذاب سے گذر رہی ہیں یہ اس وقت تک ختم نہیں ہو گا جب تک وہ زندہ ہے۔"

سچائی کے کچھ حصے پہ ہم دونوں کا اتفاق تھا، "آپ نے دیکھا ہے ان دنوں وہ کس طرح پاؤں گھسیٹ گھسیٹ چلتا ہے؟" میرے بیٹے نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کبھی پیر سائیں کی موت کے بارے میں نہ سوچا تھا۔ یہ ناممکن اور کبھی نہ ہونے والا امر دکھائی دیتی تھی۔ اب مجھے احساس ہوا کہ یہ ممکنات میں سے تھی۔ راجہ جی نے جو اس کی بات کی تھی۔ مکڑے کی موت ایک شگون تھی۔ دروازہ کھل گیا اور روشنی اندر آ گئی تھی۔ میں جتنا بھی رانجھا کے متعلق سوچتی روشنی بڑھتی جاتی۔

میرے خاوند نے نقاہت محسوس کرتے ہوئے راجہ جی سے کہا "میں سو رہا ہوتا ہوں تب بھی میری قوت اور طاقت میرے پاؤں کے تلوؤں تک سے ضائع ہو رہی ہوتی ہے۔" جلد ہی اس نے اپنی روزمرہ کے معمولات بھی چھوڑ دیئے اور صاحبِ فراش ہو گیا۔

میں دعا کرتی رہی کہ وہ بستر سے کبھی نہ اُٹھے۔

اگر میں اور میرا بیٹا اس امید میں تھے کہ پیر سائیں مر رہا تھا تو اس کے ذاتی حکیم نے اس پہ پانی پھیر دیا۔

اس نے خالص ہیروں اور موتیوں سے ایک کشتہ تیار کیا اور میرا خاوند مُردوں کی صف سے زندوں میں آ کھڑا ہوا۔ اُس نے آستانے پہ اپنے فرائض ایک بار پھر سنبھال لئے۔ اس کی راتیں ایک بار پھر اونچی ایڑی کی جوتیوں والی تھرکتی ہوئی لڑکیوں سے معمور ہو گئیں اور برقعہ پوش مرد ایک بار پھر چیل کے عقب میں غسل خانے والے راستے سے اندر آنے شروع ہو گئے۔

میں نے راجہ جی کو کشتے کے اعجاز کے متعلق بتایا لیکن اُس نے جواباً کہا کہ "وہ اسے یقیناً موت کے گھاٹ اتار دے گا۔" اپنے دلوں میں ہم دونوں جانتے تھے کہ شیطان سے نبٹنا معمول کی موت کا مسئلہ نہ تھا۔

شاور کے نیچے میں نے اللہ کو چلاتے ہوئے پکارا "میری دعاؤں کو وہ قبولیت بخش جو

تو نے اس لڑکی کی دعاؤں کو بخشی، جس کا خاوند اس کو چھونے سے پہلے ہی ڈوب مرا تھا۔ لڑکی بارہ سال تک اس دریا کے کنارے بیٹھی اللہ سے التجائیں کرتی رہی تھی کہ وہ کوئی معجزہ دکھائے تاکہ پانی میں ڈوب گئی اس کی بارات اس میں سے زندہ سلامت نکل آئے، اور ایک روز ایسا ہو گیا۔

"میرے اللہ، میری دعاؤں کو سن لے جیسے تو نے اُس کی دعاؤں کو سنا، میرے لئے بھی کوئی معجزہ دکھا۔" میں نے فریاد کی۔

چھبیسویں رمضان کو مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے پورا دن تلاوت اور نعت گوئی کی آوازیں آتی رہیں۔ ہر کوئی اللہ کے لئے عجز و انکساری کے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ اس رات میں اماں سائیں کے کمرے کی طرف نکل رہی تھی کہ پیر سائیں اندر آیا اور اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا "تم سمجھتی ہو تم حج کے لئے جا رہی ہو؟"

میں نے اسے لیلتہ القدر کی یاد دلائی۔ برکتوں والی رات جو آج تھی "اللہ کے لئے ہر روز ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ تم کل اُس سے دعا کر لینا وہ سن لے گا۔" اس نے فتویٰ صادر کیا۔

شب قدر عیش و طرب کی رات میں بدل گئی، اللہ کی طرف سے خاموشی رہی۔

میں خفیہ طور پہ دل ہی دل میں عبادت کا سوچتی رہی "یا اللہ مجھے دیکھ۔ مجھے پوچھ تو سہی میں جائے نماز پہ کیوں نہیں ہوں۔ مجھے دیکھ، ابھی، ابھی، یہاں مجھے دیکھ۔"

میرا بدن پیر سائیں کے آگے سجدہ ریز تھا۔

میری روح اللہ کے حضور جھکی ہوئی تھی۔

"یا اللہ! ہمیں شیطان کے غلبے سے نجات دے۔ ہمیں ظلم اور جاہلیت سے آزادی عطا کر، ایسے جیسے ہمارے پیغمبرؐ نے مکہ کے لوگوں کو دلائی تھی، ہمیں بیدار کر دے۔ لوگوں کو بتا دے کہ اب یہاں تیرا کوئی نمائندہ اور سفیر نہیں۔ انہیں بتا دے اب تجھے کسی سفیر کی ضرورت نہیں۔ میرا ایمان بحال کر دے۔ اسے لے جا۔ اسے اوپر لے جا" میں دل ہی دل میں چیخی۔

میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں تو اللہ کے بجائے پیر سائیں نے ہی انہیں محسوس کیا۔

یہاں کوئی دوسرا مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔

ستائیسویں روزے کو مزار پہ چراغ جلائے گئے، لیکن بو وہاں سے موت کی ہی آتی رہی۔

میں مقبرے کی سونے کی جالیوں سے گذری۔ ان کی نقش کاری پہ جگہ جگہ کالی کالی کترنیں لٹک رہی تھیں۔ یہ سب بڑا عجیب وغریب تھا۔ زائرین انہیں اس منت کے ساتھ یہاں باندھ جایا کرتے تھے کہ جب وہ پوری ہوگئی تو وہ انہیں اتار لیں گے، اکثر کترنیں پرانی اور گرد آلود ہوتی تھیں۔ قبریں ان کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دیتی تھیں لیکن وہ اس کے باوجود بار بار لوٹ آتے۔ پچھلی کترن پہ ایک اور کترن باندھتے اور یہ سلسلہ ہمیشہ کے لئے جاری رہتا۔

اس پیر کی قبر پہ جس نے طوطی کے بلوچ کو قتل کیا تھا میرے ہاتھ فضا میں دعا کے لئے بلند ہوگئے۔ یااللہ! اس شخص کو طوطی کے دردوں جیسا درد دے۔ اس کی مونچھیں اکھاڑ دے، اسے کوڑے لگوا، اسے لال مرچوں سے بھروادے، کپاس کی ان سنڈیوں کو اس پہ چھوڑ جو اس کے دل کو کاٹ کھائیں اور اسے یہ بھی بتادینا کہ یہ دعا اس کے اپنے گھر سے آئی ہے۔ اگلے پیر کی ماں کی طرف سے۔

ہر قبر کے پاس سے گذرتے ہوئے میں نے سب کے یوم حساب اور قیامت کے لئے دعا کی۔ اس میں صرف ایک مستثنٰی تھی۔ باباجی کی قبر جو ایک چھلکے کی پردہ پوشی کر رہی تھی بالکل اسی طرح جیسے میرا برقعہ ایک طوائف کو چھپائے ہوئے تھا۔

چھوٹا سائیں باباجی ہی کی طرح تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے بھی انہیں اذیتوں سے گذرنا پڑا تھا۔ سر اپنے بازوؤں میں چھپائے ہوئے میں نے اپنا دل نکالتے ہوئے باباجی کو پیش کیا، ان لوگوں کے لئے دین کے کیا معنی ہیں جو اتنی ہمت بھی نہیں رکھتے کہ اس پہ عمل کرسکیں؟ اللہ کے احکام کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے جب کہ بندوں کے لئے ان کی خلاف ورزی کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ ہی نہ ہو۔

کوئی سرد لہر میرے بدن میں دوڑ گئی۔ مجھے کسی کی عجیب وغریب موجودگی محسوس ہوئی۔ اپنی گود کی تاریکیوں میں آنکھیں جھپکتے ہوئے میں بھونچکی رہ گئی۔ سفید عبا پہنے سر پہ ململ کا عمامہ باندھے کسی کا وجود تاریکی سے ابھرا۔ عمامے کا پلو اس کے چہرے کے گرد لپٹا ہوا تھا۔

"تم کیا چاہتی ہو؟" اس نے دھیمی اور ڈھکی ہوئی آواز میں پوچھا۔ میں بھاگ جاتی

لیکن اندرونِ حویلی کے خطرات سے بڑھ کے کون سا خطرہ ہو سکتا تھا۔ "میں اپنے خاوند کی موت مانگتی ہوں۔" میں نے کہہ دیا۔

"اگلی جمعرات مجھے اسی وقت میں ملنا۔" اس نے سرگوشی کی۔ اُسے یہ کس نے بتایا تھا کہ مجھے صرف جمعرات کو ہی یہاں آنے کی اجازت تھی؟ کیا وہ پیر سائیں کی خفیہ کا آدمی تھا؟ کیا وہ خود پیر سائیں ہی تھا؟ وہ مڑا اور غائب ہوگیا۔ کیا وہ حویلی کے اندر چلا گیا تھا؟

واپس لوٹتے ہوئے میں خوف وہراس کا شکار تھی۔ گھر کے اتنا قریب یہ راز چیل کی سراغ رساں نگاہوں سے کیسے چھپا رہ سکتا تھا، لیکن عبا پوش وہ شخص کون تھا؟ وہ جو بھی تھا بہرحال وہی میری آخری امید تھا۔ سکون صرف موت میں ہی تھا میری یا پیر سائیں کی۔

رمضان کے آخری تین روزے دن بھر کھانا بنانے اور راتیں اسی جنون اور وحشت کا شکار ہوتے گذریں۔

عید آگئی۔ میں پورا دن سوچتی رہی یہ آخری عید تھی۔ میری یا اُس کی؟ میں نے اللہ سے دعا کی، اگر مجھے مرنا ہی ہے تو موت جلد آئے اور بنا اذیت آئے۔

جمعرات کے متعلق سوچتے ہوئے میں گھبرا گئی۔ کیا مجھے کسی ایسے قتل کی سزا دی جاسکتی تھی جو ہوا ہی نہ ہو؟

کسی وقت میں اپنے آپ کو دو دو سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے ماں کے گھر اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھتی جہاں میں الماری میں رانجھا کی تصویر کے ساتھ بند ہو جاتی۔

وہاں دروازوں پہ کوئی تالا اور کھڑکیوں میں کوئی در نہ تھا۔ میں بھائی کی زندگی کے نشیب وفراز کو ہموار کر رہی تھی۔

میرے چاچے، ماموں، پھوپھیاں، خالائیں، میری سہیلیاں اور اُن کے بچے سب ہی مجھے گلے لگا رہے تھے۔

میں اپنی کزن کے چھ فٹ لمبے اس بیٹے کو چوم رہی تھی، جس کے لئے میری اس وقت پٹائی ہوگئی تھی جب وہ ابھی محض چھ سال کا تھا۔ میں پارک میں سیر وتفریح کر رہی تھی، سینما میں آلو چھولے ہڑپ کرتی اور راستے میں پڑتے نالوں اور مچھروں کی آماجگاہ گڑھوں کو پھلانگتی ہوئی گھر جا رہی تھی۔

میں بستر پہ دراز تھی اور ریڈیو پہ بھولے بسرے گیت چل رہے تھے۔ میں نے

تصور ہی تصور میں اپنے آپ کو دریا کنارے بیٹھا دیکھا۔ پاؤں سے چھینٹے اُڑاتے ہوئے میں رانجھا کو اپنی آپ بیتی سنا رہی تھی۔ وہ اسے تسلیم کرنے سے انکاری تھا اور میں شہادتوں کے لئے ہیر وز کی تلاش میں تھی۔

جمعرات کو میری عباپوش شخصیت سے ملاقات مشکوک ہو گئی۔ میرے خاص دن شروع ہو گئے۔ ایام کے دوران عورتوں کی مزار پہ حاضری اسی طرح ممنوع تھی جیسے مردوں سے ازدواجی تعلق، اُسے پیر سائیں سے چھپانا ناممکن تھا۔ آزادی کے خواب میری آنکھوں کے سامنے چکنا چور ہو رہے تھے۔

ایک بچی جسے عورت سمجھنا اس کے اپنے لئے بھی مشکل ہو گا اس کے عقب میں چلتی خواب گاہ میں داخل ہوئی۔

"بچی کو نہلا دُھلا کے میرے پاس لے آؤ" اس نے حکم سنایا اور میں اسے تیزی سے غسل خانے میں لے گئی۔ نتیجہ خواہ کچھ بھی ہوتا مجھے ہر صورت مزار پہ جانا تھا۔

عریاں بچی فرش پہ گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا چٹیل سینہ ہاتھوں میں چُھپا رکھا تھا۔ پیر سائیں نے اپنے کپڑے اتار پھینکے تو بچی منہ بسورتے ہوئے روں روں رونے لگی۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا بچی کو دارو دی جا سکتی ہے؟" "نہیں" اس نے مختصر اور کرخت جواب دیا۔ بچی ننھی کتیا کی طرح چوں چوں کر رہی تھی۔ "بکومت" وہ گرجا "نہیں تو میں چمٹے سے تمہاری زبان باہر نکال پھینکوں گا۔"

اس کی گرج دار آواز ہی بہت تھی، الفاظ کہنے سمجھنے کی تو ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ اپنی بے چین وحشی نگاہوں سے میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ چھوٹو! میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔ میں دل ہی دل میں کہہ رہی تھی، لیکن اگر تم آج اسے روک لو تو کل شاید میں تمہیں بچا ہی لوں گی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے ایک اور حکم سنایا "ہلنے جلنے کی جرأت نہ کرنا۔" اس کا ہاتھ لڑکی کے منہ پہ اس سختی سے رکھا ہوا تھا کہ اس کی آواز کے ساتھ ساتھ میری آواز بھی بند ہو گئی۔

بچی بہت سے بچوں میں بدل گئی، اور وہ میری تینوں بیٹیوں، خوفزدہ ہیر وز اور لاابالی دوستوں کی صورت اختیار کر گئے۔ وہ اپنے آپ کو فارغ کرتے ہوئے اوپر اٹھا تو میں خوف سے غیر ارادتاً پیچھے کو جھکی۔ ننھی بچی نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں سانس لی اور مر گئی۔ وہ اس

کے گناہوں کی طرح غائب ہو گئی تھی۔

پیر سائیں نے چیل کو آواز دی۔ وہ اندر آئی۔ اُس نے بچی کو اپنے کندھے پہ اٹھایا، اس کے ننھے بدن کو اپنی چادر میں ڈھانپا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

شیطان کے حلق سے خر خر کی آوازیں آنا شروع ہوتے ہی میں دائی کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتی بغلی گیٹ کی طرف بڑھی۔ طویل اور تاریک گذرگاہ میں چلتے ہوئے میں سوچ رہی تھی چیل بچی کو کہاں دفن کرے گی؟ آخر چیل خدا کے بجائے شیطان سے وفا کیوں نبھا رہی تھی؟ میں ان خدشات میں گھری ہوئی تھی کہ عباپوش شخصیت پیر سائیں کا کوئی جاسوس بھی تو ہو سکتی تھی۔ یہاں کون تھا جو اس کا مخبر نہ تھا، لیکن اس کے باوجود میرا دل توقعات سے دھک دھک کر رہا تھا۔ عبا والے شخص میں کوئی بات ایسی ضرور تھی کہ میں بنا شناخت اس پہ بھروسہ کر بیٹھی تھی، اگرچہ کوئی احساس مجھے اس سے رابطے اور اعتماد میں پنہاں خطرات سے بھی آگاہ کر رہا تھا، لیکن میں بہر حال جان پہ کھیل جانے کو تیار تھی۔

عورتوں کے ہجوم سے الگ میں ایک ایک قبر پہ رُکتی اُمید کی آخری کرن کی تلاش میں تھی۔ بابا جی کی قبر پہ میرے ہاتھ دُعا کے لئے اٹھ گئے۔

"میرے اللہ! میرے اندر کوئی آگ بھڑک رہی ہے۔ ہمیں آج ہی شیطان کے غلبے سے نجات دے۔ ہمیں ان گناہوں اور ان جرائم سے نجات دلا جنہیں وہ تیرے پاک نام پہ ہمارے اوپر ڈھیر کئے جا رہا ہے۔ ایک بچے کی قربانی کے صدقے ہم پہ رحم فرما۔"

میرا وقت ختم ہو گیا۔

عباپوش ظاہر نہ ہوا۔

پسینے میں ڈوبے ہوئے میں یہ سوچتی واپس مڑی کہ یہ کیا احمقانہ حرکت تھی۔ آخر میں کس پر اور کیوں اعتماد کر بیٹھی تھی۔

باب ۱۱

الله کے نام پر

میرے میاں کی صحت ڈانوں ڈول رہنے لگی تھی۔ کبھی تو وہ تین عورتوں کو دن میں تین بار اپنے بستر پہ لئے ہوتا اور یوں لگتا وہ سدا جوان اور زندہ رہے گا اور کبھی وہ کسی سو سالہ بوڑھے کی طرح ڈھیر ہو جاتا۔

میں ہر جمعرات کو باقاعدگی سے بظاہر اپنے خاوند کی صحت یابی کے لئے باباجی کی قبر پہ جانے لگی لیکن دل میں یہ آرزو ہوتی کہ واپس لوٹوں تو وہ مر چکا ہو۔ عبا پوش شخص جس سے میں نے اپنی خوف ناک ترین تمنا کا اظہار کیا تھا غائب ہو چکا تھا۔ میرے لیے یہ باعثِ اطمینان تھا کہ نہ تو چیل اور نہ ہی میرے خاوند کو اس کے بارے میں کوئی خبر ہوئی تھی لیکن ساتھ ہی جب مجھے کالی سے اپنی دوستی کے خلاف اس کے سوچے سمجھے تاخیری ردِعمل کا خیال آتا تو میں سوچتی وہ مجھے کسی بھی وقت بلکہ ہر وقت قتل کر سکتا تھا۔

ایک رات پیر سائیں سفید اور گلابی رنگت کے ایک لڑکے کو اندر لایا جس کے ہاتھوں نے میری جلد اور اس کے اندر بہت دور تک شہوت کی حس ایسے بیدار کی جیسے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے ہم باباجی کی قبر کے پائینتی موجود تھے اور یہ بے حرمتی بڑے عجیب طریقے سے میرے رگ و پے کی ہر پیاس کو بجھائے دے رہی تھی۔ پیر سائیں میرے ردعمل پہ اچھل پڑا اور اگلا پورا ہفتہ اس لڑکے کو روزانہ لاتا رہا۔

لڑکے نے میرے کان میں سرگوشی کی ”پیاری کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم کہیں باہر بھی ملیں؟“

خوف کے عالم میں میں نے جوابی سرگوشی کی ”ایسا کبھی نہ سوچنا، وہ تمہیں قتل کر دے گا۔“ اس کے باوجود وہ مصر رہا، ”تم کہاں رہتی ہو، میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ میری نیند اور کھانا پینا سب حرام ہو چکا ہے۔“

کیا اسی کا نام محبت تھا؟

میں ہواؤں میں اُڑ رہی تھی، میرے پاس اس پرواز کا جواز تھا۔ چند روز بعد میرے خاوند نے گرجتے ہوئے حکم سنایا ”پچھلے صحن میں کوئی نہ جائے اگر گیا تو میں ٹانگیں توڑ دوں گا۔“

ایک نوکرانی ہر ایک کو خطرے سے باخبر کرنے کے لئے دوڑی پھری اور چیل نے وہاں کی چوکیداری کے فرائض بھی سنبھال لئے۔ پیر سائیں اور میں بند دروازے سے آگے نکل گئے، مزار کا موڑ بھی پیچھے رہ گیا۔ ہم دھوبی گھاٹ سے گزر کے پچھلے برآمدے اور وہاں رکھے گدیلے تک پہنچے۔

وہ لافانی ہے، وہ کبھی نہیں مرے گا۔ میں سوچ رہی تھی۔

میرے کپڑے اس کے کپڑوں کے ساتھ ساتھ اترتے گئے۔ دیوار کے دوسری طرف کوئی نقل و حرکت ہو رہی تھی۔ مجھے بدلتے ہوئے قدموں کے ساتھ ساتھ بولنے کی آوازیں بھی آئیں۔

کھچّی کی چابک شوں شوں کرتی لہرائی، کوئی درد اور اذیت سے چیخا

میں اپنی پشت پہ اور میرا خاوند میرے اوپر تھا۔

ستم رسیدہ کی آہ و پکار میرے خاوند کی اشتہا کی آگ پہ تیل کا کام کر رہی تھی۔ وہ میرے کانوں میں بُڑبُڑایا، ”مزہ آ رہا ہے؟“ اس نے ساتھ ہی جواب سننے کے لئے کان میری چھاتی سے لگا دیا۔ کوڑوں کی برسات نے ایسی چیخیں پہلے کب پیدا کی تھیں۔ پیر سائیں کی آواز چابکوں کے درمیان لمحوں کے وقفوں کو بھرے دے رہی تھی ”بتاؤ تمہیں مزا آ رہا ہے۔ تمہارے خیال میں یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ باہر کون چلا رہا ہے؟ تم جانتی ہو؟“

اذیت کبھی نہ ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔

آخرکار دلدوز چیخیں بند ہوئیں اور پیر سائیں میرے اوپر سے اتر گیا۔

”بی بی جی کل رات انہوں نے کسی لڑکی کے ساتھ زنا کے کبیرہ گناہ میں ملوث فوجی کے بیٹے کو خوب مارا ہے۔“ دائی نے بعد میں مجھے بتایا میرے دل کی دھڑکن بند ہوتی محسوس ہوئی۔ ”پیر سائیں نے اُسے خصی کروادیا ہے۔“ اس نے کہا اور میرا دم گھٹتے گھٹتے بچا۔

”اس کی شکل و صورت کیسی ہے۔“ میں نے پوچھا۔

دائی کے الفاظ میرے دل میں اس خنجر کی طرح پیوست ہوئے جسے اوپر نیچے دائیں بائیں گھمایا جا رہا ہو۔ ”سفید اور گلابی ہے، بالکل فرشتوں جیسی۔“

اس جمعرات کو میں باباجی کی قبر پہ بے قابو ہو کے پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ اچانک وہ عبا پوش نہ جانے کہاں سے ظاہر ہو گیا۔ ”وہ دروازہ کُھلا رکھنا جو لوگ استعمال کرتے ہیں۔“

چادر کے ڈھاٹے کی اوٹ سے اُس کی ہلکی سی آواز آئی۔

وہ ان کے متعلق جانتا تھا؟

"تین گز ململ پلنگ کے سرہانے رکھ چھوڑنا۔ اپنے خاوند کو مسکن ادویات کی دُگنی خوراک پلا دینا۔ میں اگلے مہینے کی پہلی کو نصف شب کے قریب آؤں گا۔" وہ واپس مڑا تو میں نے سوچا یہ راجہ جی تھا، نہیں وہ باباجی کی روح تھی۔ ہیولہ غائب ہو گیا۔ میرے دل میں آئی میں اس کا تعاقب کروں۔ میرے ذہن نے اس کی تائید نہ کی۔

دائی کے پیچھے پیچھے مزار سے نکلتے ہوئے مجھے اپنے اوپر تعجب ہو رہا تھا۔ آخر میں اس پہ کیوں اعتماد کرنے لگی تھی۔ مجھے یہ احساس کیوں تھا کہ وہ میرا ہمدرد تھا۔ واپس لوٹتے ہوئے میں اگلے مہینے کی پہلی شب کے متعلق سوچ رہی تھی۔ میرے ذہن میں اور کسی چیز کا گمان تک نہ تھا۔

پیر سائیں کی موت کے لئے خواہش نے میرے دل و دماغ پہ قبضہ جما لیا۔ ہر لمحہ جو گزر جاتا وہ مجھے سکون بخش محسوس ہوتا لیکن آنے والا ہر لمحہ آزمائش اور امتحان کے اذیت ناک عالم میں گزرتا۔ یہ احساس کہ وہ انہیں ہواؤں میں سانسیں لے رہا تھا جن میں میں تھی انہیں ہلاکت آفرین کر دیتا، یہ کہ وہ وہی غذا کھا رہا تھا جو میرے سامنے رکھی ہوتی، میری غذا کو زہر میں بدل دیتا۔ وہ جس پانی سے وضو کرتا میرے لئے وہ لہو لہو ہو جاتا اس کی نمازیں خدا کے لئے نہیں شیطان کی حمد کے لئے تھیں۔ پیشتر اس کے کہ اُس کا مصلّےٰ راجہ جی کو ورثے میں ملتا میں اسے جلا کے راکھ کر دینا چاہتی تھی۔ میری تمنا تھی کہ تسبیح کا دانا دانا بکھر جاتا اور زعفران سے لکھے کے زرد کاغذوں کے فضا میں چیتھڑے اڑتے۔

اس کے ارد گرد منڈلاتے ہوئے میں اس کوشش میں تھی کہ موت اس سے محبت میں مبتلا ہو جائے۔ جب وہ کچھ نگلتا تو میں دعا کرتی وہ اس کے گلے میں اٹک جائے۔ وہ کچھ پیتا تو میں دعا کرتی وہ اس کی سانس کی نالی کو بند کر دے۔ وہ سو رہا ہوتا تو میں یہ دیکھنے کے لئے جاگتی رہتی کہ اس کے دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی، لیکن یہ سب تو نرے خواب تھے۔ وہ ہمیشہ الارم کی ناگوار گھنٹی کے ساتھ ہی اُٹھ جاتا اور ایک اور ستمگر دن طلوع ہو جاتا۔

راجہ ہر روز باقاعدگی کے ساتھ اس کے لئے سہ پہر کی چائے کا کپ تیار کرنے لگا تو میرے خاوند نے فقرہ کستے ہوئے کہا "تم میری ہی طرح تیز اور ہوشیار ہو۔ اس خسرے،

اپنے بھائی کی طرح گھامڑ اور سست نہیں۔" میرے دل میں چھوٹے سائیں کی اس بے حرمتی پہ اس کے باپ کے خلاف نفرت کے مروڑ اٹھے۔

راجہ جی نے پوچھنا شروع کیا "آپ کیا سمجھتی ہیں اس کی صحت بہتر ہو رہی ہے یا خراب؟" مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، لیکن میں نے جب بھی کہا کہ وہ ابتر ہو رہا ہے، تو مجھے میرے بیٹے کے چہرے پہ مسکراہٹ ابھرتی محسوس ہوئی۔ ایک سہ پہر کو راجہ جی کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے پیتے ہی پیر سائیں بری طرح کانپا اور مچھلی کی طرح تڑپتے ہوئے نیچے گر گیا۔ احمق ڈاکٹر نے اسے مرگی کا دورہ قرار دیا۔ پیر سائیں کی روحانی طاقت اور رسائی کی موجودگی میں یہ تصور بعید از قیاس تھا کہ کوئی اس کی جان لینے کی کوشش بھی کر سکتا تھا، خصوصاً اُن لوگوں کے لئے جو اس کے ظلم و تشدد کا شکار رہتے تھے یہ کیوں کر ممکن ہوتا۔

ماہرینِ طب ملک کے دور دراز کونوں سے آئے اور سب ہی نے اُسے مرگی کا مرض ہی قرار دیا۔ میرے لئے اپنے بیٹے سے آنکھیں ملانا مشکل ہو گیا۔ ہم میں سے کون دوسرے سے چھپ رہا تھا کیا کہہ سکتی تھی، لیکن میں اتنا ضرور جانتی تھی کہ پیر سائیں کو مرگی کا مرض یقیناً لاحق نہ تھا۔

پیر سائیں نے راجہ جی کو اپنے لئے چائے بنانے سے روک دیا۔ راجہ جی کو شک گزرا کہ کہیں کسی نے اسے خبردار نہ کر دیا ہو، لیکن میں جانتی تھی کہ میرا خاوند ایک عملی انسان تھا۔ اپنی چائے خود بناتے ہوئے ایک تو وہ اپنی صحت اور وجود کے بارے میں خود اندازہ رکھنا چاہتا تھا اور دوسرے اسے اپنے شک وشبے کی تہہ میں بھی جانا تھا۔

تین خواب آور گولیوں کا پاؤڈر بناتے ہوئے میں نے اِسے اُس کی چائے کے کپ میں ڈال دیا جسے پینے کے نصف گھنٹے بعد ہی اس کی آنکھیں نیند کے خمار سے بند اور باتیں بے ربط ہونے لگیں۔ "سمجھ نہیں آتی مجھے کیا مرض ہے۔" اس کے الفاظ ایک دوسرے پہ چڑھے ہوئے ناقابل فہم ہوتے۔ تین روز تک یوں ہی مسکن ادویات چڑھانے کے بعد اس کے ذہن سے راجہ جی کے کسی معاملے میں ملوث ہونے کی بات نکل گئی۔

مہینے کے خاتمے میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ مجھے اپنے آزادی کے خوابوں سے خوف آنے لگا۔

میں ساعتیں گننے لگی۔

راجہ جی قدم ناپنے لگا۔

پیر سائیں کے قتل کے نتائج کا تصور کرنا بھی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ میں اتنے شدید اعصابی تناؤ کا شکار تھی کہ ذرا سی آہٹ پہ تڑپ اٹھتی۔ مجھے اپنے سائے سے خوف آنے لگا۔ عبا پوش مجھے ہر کونے میں کھڑا دکھائی دیتا بلکہ ہر سامنے آنے والا مجھے وہی لگتا۔ یہاں تک کہ اماں سائیں جن کی نظریں اب قبلہ سمت اٹک کے رہ گئی تھیں، مجھے گھورتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ میں ہر شے اور ہر انسان سے دور بھاگنے لگی، اگرچہ چیل سے دن میں بارہا ٹکرا جاتی جب میرے بیٹے نے پھر یہ پوچھا کہ "والد کی حالت پہلے سے بہتر ہے یا ابتر۔" تو اس اسرار اور پیچیدگی سے چھٹکارے کے لئے میں نے کہا "تم کیوں پوچھتے ہو؟"

شرمسار ہوتے ہوئے اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا اور منہ ہی منہ میں بُڑبُڑایا "جب تک وہ زندہ ہے مہارانی سے میری شادی نہیں ہو سکتی۔" میں حیران تھی کہ اس کا ارادہ ابھی تک بدلا نہیں تھا "کیا تم اپنے باپ کے حکم کی خلاف ورزی کرنا چاہتے ہو؟" نظریں سیدھی مجھ پہ گاڑے ہوئے اُس نے فیصلہ سنایا "میں اُسی سے شادی کروں گا جس سے میرا دل چاہے گا۔"

وہ چلا گیا لیکن اب مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے باپ کی زندگی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اب راجہ جی اور عبا والے شخص میں مشابہت پر غور کرنا شروع کر دیا۔ کبھی وہ اسی کی طرح قدم اٹھاتا کبھی لگتا ایسا نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہ عبا والے کے لہجے میں بات کرتا سنائی دیتا کبھی اس کی آواز مختلف لگتی۔ کیا درگاہ والی شخصیت طوطی کے محبوب کا بھوت ہو سکتی تھی؟ کیا وہ باباجی تھے جو ہماری روحوں کو شیطان کی اسیری سے نجات دلانے آئے تھے؟ کیا راجہ جی اپنے والد کو زہر دے رہا تھا؟ کیا میں اسے خواب گاہ میں بستر پہ قتل کر دوں گی؟ کیا یہ میں ہی ہوں؟ کیا یہ وہی ہے؟ میرا ذہن ان سوالوں کی آماجگاہ بنا رہا یہاں تک کہ مجھے چیل دکھائی دی۔ وہ قطعاً عبا والے کی طرح نہ تھی لیکن میرے اندر کوئی کہہ رہا تھا وہ بھی تو ہو سکتی تھی۔ کیوں؟ کیوں؟؟ اور کون؟ سوال میرے ذہن میں گونجتے رہے۔

شاید یہ سب کچھ میرے تخیل کا کرشمہ تھا۔ شاید قتل تو کسی بھی منصوبے کا حصہ نہ تھا۔ یہ سب فریبِ نظر تھا۔ عبا پوش تو محض میرے تصور کی پیداوار تھا۔ وہ محض ایک سوچ تھی جس نے میرے جنونی دماغ میں جنم لیا تھا۔ جب فسوں کاری ختم ہوئی تو میں گہری اداسی کا

شکار ہو گئی۔

اس دوران راجہ جی مایوسی کے عالم میں پھٹ پڑا "آپ جانتی ہیں والد مجھے مہارانی سے شادی کی اجازت کیوں نہیں دے رہے؟" میں یہ کیسے جان سکتی تھی؟

"کُمی سے پوچھ لیں" اس نے مشورہ دیا "اسے کہیں یہ میرا حکم ہے کہ وہ بتائے۔"

کبڑی ملازمہ درخت کے نیچے بیٹھی دالیں صاف کر رہی تھی۔ جب اس نے راجہ جی کا فرمان سُنا تو خوف سے لرز گئی۔ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اُس نے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر میرے کان میں ہلکی سی سرگوشی کی۔

"وڈی ملکانی پیر سائیں کے سامنے حاضری اور تخلیے میں گفتگو کے بعد درگاہ سے لوٹ گئی۔ وہ اٹھارہ سال پیشتر کے اس دن کو یاد کرتی رہی جب دو بہنیں اپنے خاوندوں کے ساتھ خصوصی دعا کے لئے آستانے پہ پہنچی تھیں۔ ملکانی اور اس کا خاوند ایک کمرے میں پہنچے جہاں کسی مدہوش کر دینے والی خوشبو نے انہیں ذہنی طور پہ ہلکا پُھلکا کر ڈالا۔ مشروب جو انہیں دیا گیا وہ بہت میٹھا تھا۔ پیر سائیں بلند آواز میں بڑی تیزی سے کچھ پڑھ رہا تھا اور اسی اثناء میں اُن کی گردنیں بوجھل ہو گئیں۔ اِس سے زیادہ کچھ نہ اُسے یاد تھا نہ اس کے خاوند کو۔ جب وہ بیدار ہوئی تو اپنے خاوند کے بازوؤں میں تھی۔ اس کے بدن کے ساتھ کچھ ہوا تھا، ہڈیاں درد سے چیخ رہی تھیں۔ اس کے فوراً بعد دونوں بہنیں حاملہ ہو گئیں۔"

کُمی میرے سر پہ تلوار گرانے سے پہلے میرا متوقع ردعمل جانچنے کے لئے پیچھے ہٹی۔ اس کے الفاظ لاوے کی طرح میرے دل میں اور اس کی اتنی ہی گرم سانس میرے کانوں میں پڑی۔

"مہاراجہ اور مہارانی مالک کے اپنے ہی بچے ہیں، وہ بھائی بہن ہیں۔" میں تو جیسے پاؤں سے اُکھڑ گئی۔

کُمی نے بات جاری رکھی۔ "وڈی ملکانی نے یہ شرمناک راز اپنے بیٹے کے ساتھ اس کی قبر میں ہی دفن کر دیا، لیکن اب جب راجہ جی مہارانی کی محبت کا شکار ہوا اور پیر سائیں نے شادی کی اجازت دینے سے ایک بار پھر انکار کر دیا تو مہارانی مزید خوفزدہ ہو گئی۔ اس کے پیر نے اسے نحوست کا نشان قرار دے دیا تھا یوں وہ کسی بھی شخص کی دلہن بننے کے قابل نہ رہی تھی۔ اس سے بیاہ کے خواہش مندوں کے لئے بہتر یہی تھا کہ اس کے بجائے وہ دنیا ہی کو خیر

باد کہہ دیتے۔ وڈی ملکانی اپنی بھانجی کے بُرے نصیبوں پہ غم زدہ تھی اس صورتِ حال کے بارے میں اُس نے نخی بی بی سے بات کی۔ نخی بی بی نے راجہ جی کو بتادیا۔

ایک بحران وجود میں آ گیا۔

راجہ جی اب بھی مہارانی سے شادی کا مصمم ارادہ کئے ہوئے تھا۔

میں نے اُسے باز رکھنے کی کوشش کی "تمہیں کوئی اور لڑکی بھی تو مل سکتی ہے۔ میں تمہارے لئے خود پسند کروں گی۔" لیکن میرے بیٹے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا کہ "میں مہارانی کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گا۔"

میں کسی خوفزدہ بھیڑ کی طرح ممیا رہی تھی، "لیکن وہ تمہاری بہن ہے۔ یہ ایسا کبیرہ گناہ ہوگا جس کی سنگینی کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ اس کے نتیجے میں پیدا ہوئے تمہارے بچے کتنے بدنصیب ہوں گے؟"

راجہ جی اپنے فیصلے پہ قائم رہا۔

"وڈی اور چھوٹی ملکانیاں مسکن ادویات کے زیرِ اثر تھیں" اس نے جواز پیش کیا، "انہیں تو کچھ یاد نہیں۔ ہو سکتا ہے میرے باپ کی جگہ اس کے بندوں میں سے کسی نے ان کے ساتھ شب بسری کی ہو۔"

میں نے بہتیرا زور لگایا کہ اس شادی میں خطرات مضمر تھے۔ اس کا باپ بھی تو سب کچھ جانتا تھا اور اسی نے منع کیا تھا' لیکن راجہ جی کی آنکھیں تو پتھر کی ہو گئی تھیں۔ گناہ کا کوئی تصور اس کے ذہن میں کہاں تھا۔ وہ اپنی دھن اور جنون میں تھا۔

میری زندگی قلابازیاں کھا رہی تھی۔ مستقبل اپنی آمد سے پہلے ہی بھیانک سپنا بن گیا تھا۔ پیر سائیں کے جیتے جی اس گناہِ عظیم میں ملوث ہونا میرے بیٹے کے لئے ممکن نہ تھا اس کی موت ایک ناقابلِ قبول صورتِ حال کو جنم دیتی۔

مہینے کی پہلی میں صرف دو روز رہ گئے۔

میرا دل اس کے صفحۂ ہستی سے مٹ جانے کی آرزوؤں کا مسکن تھا' لیکن راجہ جی کے منصوبے ان آرزوؤں کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ اس نئے پھندے سے منسلک خطرات میرے اعصاب کی شکست و ریخت کا باعث ہو رہے تھے۔

عبا پوش دوبارہ آئے گا یا پھر پچھلی دفعہ کی طرح کہیں گم ہو جائے گا؟ میرا دل دھک

دھک کر رہا تھا۔ مجھے انتظار کرنا چاہیئے یا نہیں۔ میں نے انتظار نہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اس کے باوجود منتظر رہی۔

مہینے کا آخری روز میں نے ایک گھٹیا اور رذیل ترین انسان کے ساتھ بسر کیا۔ میں اُس سے بالکل گھل مل گئی اور اس بدبودار سور کی خواہشات کی یوں تکمیل کرتی رہی جیسے وہ میرا کھویا ہوا رانجھا تھا۔ میں نے دعا کی کہ اس بلا کا بھی وہی حشر ہو جو گورے اور گلابی لڑکے کا ہوا تھا یا پھر میرے اندر سے کالی مکڑی کا زہر نکلے اور وہ موت کے گھاٹ اتر جائے۔ پیر سائیں سویا ہوا تھا اور میں اس کی موت کے تصور میں کھوئی ہوئی تھی جو اگلے روز واقع ہو سکتی تھی۔

صرف نکوٹین کا زہر ہی میرے اعصاب کو تڑپنے سے روک سکتا تھا۔ اب میں سگریٹ کی تین ڈبیوں تک روزانہ پی رہی تھی۔ لائٹر تو صرف پہلا سگریٹ جلانے کے ہی کام آتا تھا اس کے بعد سگریٹ سے سگریٹ کی کڑی جڑتی چلی جاتی۔ اَدھ جلے ٹوٹے پھینک دینے کے کافی دیر بعد تک میرے نتھنوں سے دھوئیں کے مرغولے نکلتے رہتے۔ میرے ناخن اور انگلیوں کی پوریں زرد ہو گئیں اور میرے پھیپھڑے جل اٹھے، لیکن یہی تو ایک ایسی آگ تھی جو دوسرے بہت سے شعلوں کو بجھائے رکھتی تھی۔ تمباکو، پان کے پتے اور میرے لعابِ دہن کا میرے منہ میں ملاپ ہوتا اور میرا سر گھوم جاتا۔ جب میں پرواہ کئے بنا زہر کو نگلتی تو زمین گھومنے لگتی۔ اس کی عدم موجودگی میں حقائق اپنی تمام تر بے رحمی کے ساتھ میرے مدِ مقابل آ کھڑے ہوتے اور یہ بات میری برداشت سے باہر تھی۔ کیونکہ مہینے کا یہ آخری دن مختلف تھا، یا بدتر یا بہتر تھا میں نے باتھ روم کے باہر سگریٹ کی چوتھی ڈبیا بھی خالی کر دی۔ میں شب بھر جاگتی رہی۔ کھڑکی کے سوراخ سے میں پیر سائیں کی آخری صبح کا نظارہ کرنا چاہتی تھی۔ اس کی رخصتی کے بعد کوئی بھی چیز ویسی نہ رہتی۔ پرندے درختوں پہ چہچہا رہے تھے۔ اس بار یہ سوچ اس پہ بھی صادق آتی تھی، لیکن پھر جب میں نے سوچا کہ میری گردن بھی اس کے ہاتھوں میں ہو سکتی تھی یا پھر قانون کے ہاتھوں میں تو میرا اگلا سگریٹ پیتے پیتے جکڑ سا گیا۔

اب پیر سائیں کی روزمرّہ اپنے مریدوں اور چاہنے والوں کو دعائیں بھیجنے تک محدود ہو گئی تھی لیکن لوگوں کو یقین تھا کہ وہ اس حال میں بھی ان کے قرضوں کی ادائیگی، امراض کی شفاء، بانجھ پن کے علاج اور فصلوں کی بہتر پیداوار کا ضامن تھا۔

پچھلے بارہ عشروں میں اپنے حالات میں ذرہ برابر تبدیلی نہ آنے کے باوجود لوگ

اس سوچ پہ قائم رہے۔ وہ جس طرف کا رخ کرتے غریبی منہ پھاڑے اُن کا استقبال کرتی۔ یہ بدحال روحیں ان جھونپڑوں اور تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں محبوس تھیں جو ان کے آخری ٹھکانے تاریک قبروں سے کچھ مختلف نہ تھیں، لیکن وہ پرندوں کی ڈاروں کی طرح آتے زمین پہ گھسٹتے اور رینگتے ہوئے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ مزار پہ پڑی اس کی خالی چارپائی کی طرف بڑھتے۔ درگاہ سے واپسی تک اُن کے پاس جو دو چار روپے ہوتے وہ بھی چھن چکے ہوتے۔

ہر نیا سفر پچھلے سے مہنگا ثابت ہوتا۔

ہزاروں لاکھوں جاہل عقیدت مندوں کے روحانی راہنما کے قتل کے متعلق سوچنے کے لئے غیر معمولی جرأت کی ضرورت تھی۔ ایک کنیز اور باندی کے مقام سے اُٹھ کے اپنے مقدر کی مالکہ خود بننے کے لئے ایک بڑا معجزہ درکار تھا۔

پیر سائیں منافقت کا نشان تھا۔

میں ایک سپاہی تھی۔

یہ جہاد تھا۔

میرے نزدیک آستانے میں اسلام کی سربلندی کے لئے پہلا اور واحد عمل اب رونما ہونے کو تھا۔ اللہ کے مقدس نام پہ اگر حقیقتاً کچھ ہو سکتا تھا تو وہ پیر سائیں کا قتل تھا۔

لیکن یہ جنگ صرف ایک پیر کے خاتمے پہ جیتی نہیں جا سکتی تھی۔ یہی تو وجہ تھی کہ وہ اپنے جانشینوں کی ضرورت اور قدر و قیمت کتنی محسوس کرتے تھے۔ دن گذر گیا۔

ہر شے مدہم ہوتی گئی حتیٰ کہ مکمل تاریکی چھا گئی۔ اس رات بڑی بھیانک آندھی چلی جو کئی دروازوں اور کھڑکیوں کو ان کی چوکھٹوں سے اکھاڑ گئی۔ میں برآمدے میں رکھی ایک کرسی پر ڈھیر رہی۔ موسلادھار بارش صحن کی دیواروں سے بڑے زور سے ٹکرا رہی تھی۔ اوپر آسمان کے ہمارے قطعے میں بادلوں کی گھن گرج کے ساتھ ساتھ بجلی بھی اپنا غیض و غضب نکال رہی تھی۔

حویلی جیسے انتقام کے لئے بلبلا اُٹھی تھی۔

مجھے پریوں کے دیس کی روشنیاں یاد آئیں اور وہ گھپ اندھیرا جو انہیں بجھا دینے کے بعد چھا گیا تھا۔ یہ ایک وارننگ تھی۔

آج کے دن کی نشانی۔

قتل، ہلاکت، قتل، میرے ذہن میں گونج رہا تھا۔ ہر طرف روحیں لٹکتی نظر آ رہی تھیں۔

میں نے دو خواب آور گولیاں نگلیں، سات سگریٹ پھونک ڈالے اور ایک بڑا بھرپور پان چبا ڈالا لیکن میرے ہاتھ پھر بھی کانپ رہے تھے چیل مزار کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ اپنی سفید چادر اُس نے کندھے پہ ڈال رکھی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا تو مجھے اپنی سانس بند ہوتی محسوس ہوئی۔ میں جانتی ہوں تم کس چیز کے انتظار میں ہو، وہ آنکھوں کی زبان سے حال کہہ رہی تھی۔ اس خوف سے سنبھلنے میں مجھ پر جیسے صدیاں بیت گئیں۔

پیر سائیں نے راجہ جی کو طلب کیا تو اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا "اماں تم کانپ کیوں رہی ہو؟" اور میں سوچ رہی تھی اس نے اپنی سگریٹ کو اس زور سے کیوں بھینچا ہوا تھا، وہ اتنے گہرے گہرے کش کیوں لے رہا تھا؟ اس کا ہاتھ کیوں لرز رہا تھا؟ کون کانپ رہا تھا وہ یا میں؟ میں نے تصور ہی تصور میں اس کی پیشانی پہ پسینے کے قطروں کی جگہ لہو کے قطرے لرزتے دیکھے۔

راجہ جی نے پریشانی کے عالم میں مجھے بتایا "پیر سائیں کو میرے وڈی ملکانی سے راز و نیاز کا حال معلوم ہو گیا۔ خدا ہی جانتا ہے اس کے آگے کیا ہوگا۔"

اس اطلاع نے جیسے میرا دل نکال لیا، وہ نیچے میرے پاؤں میں اکٹھے ہوتے بارش کے گندے پانی میں گرا اور بادلوں کی گرج چمک کے دوران اس کے پھڑکنے کی آوازیں ابھریں، کیا میں ہمیشہ کے لئے یہیں اسیر رہوں گی، پیر سائیں کو کون قتل کرے گا؟ راجہ جی تو نہیں۔ وہ تو خود قتل ہونے کو تھا۔

پیر سائیں نے اُسے ملتوی کر دیا ہوگا، راجہ جی اس کی بارگاہ سے نکلا تو پہلے سے کہیں زیادہ پرسکون تھا۔

"آج کوئی مجھے درخت سے نہیں باندھے گا" اُس نے قہقہہ لگایا "آج کی رات اسیری کی رات نہیں، کل ہم دیکھ لیں گے۔"

کیا وہی قاتل ہے؟ میں نے پھر سوچا۔ یا اللہ! میں نے التجا کی، اگر مرنا ہی ہے تو ہم

سب اس کے لئے تیار ہیں لیکن کسی اور کو موت آجائے تو اچھا ہے۔ بے شک کسی قحط سالی کے روپ میں، طاعون کے ذریعے یا سورج کے دھماکے کی صورت میں وہ آئے تو سہی۔ کرم کرا اور اسے آج ہی رات بھیج دے۔

میں تو ایام سے تھی، اس نے تیمیری کو بلا بھیجا۔

"سائیں کیا میں بیوہ کی بیٹیوں کو بھی بھیج دوں؟" میں نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔

"کیوں؟" وہ جاننا چاہتا تھا۔ اگلے نصف گھنٹے کے دوران وہ کیچڑ میں کھچڑی پکاتا رہا اور بالآخر اس نے مجھے کمرے سے باہر نکال دیا۔ اس حرکت نے مجھے ہلا کے رکھ دیا۔ تمباکو اور مسکن دوائیں میرے ذہن کو سُلائے دے رہی تھیں۔ مجھے کسی کی موت کے بگل کی آواز سنائی دی۔

لیکن کون؟ کب؟ کیسے؟ ان سوالوں کا جواب ملنے تک کون زندہ رہے گا۔

گیارہ بجے شب کے کچھ بعد بارش تھم گئی۔ میں برآمدے میں رکھی کرسی سے اُٹھ کے باورچی خانے کے معاملات کی نگرانی کے لئے پہنچی۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ میں نے انڈوں کی گنتی کی، تیار چپاتیوں کو دوبارہ لپیٹا اور صبح کی چائے کے لئے اضافی دودھ ابالا۔ سٹور کے کمروں میں میں نے لوہے کے بکسوں کے تالے چیک کئے اور انہیں چادروں سے ڈھک دیا تاکہ چور اُن سے دور رہیں۔

پھر میں تیز تیز قدموں سے اپنی چوکور دنیا کے چکر لگانے لگی۔ دیواروں کے کونوں سے گذرتے ہوئے، بارش کے پانی سے گڑھوں کو پھلانگتے ہوئے، دائروں میں چلتے چلتے میں نسبتاً بلند آواز میں کہہ رہی تھی۔

"لوگوں کی دنیا کی طرح میں اپنی دنیا کو بھی گول کر کے چھوڑوں گی، میں اسے اسی طرح گول کر دوں گی جیسے خدا نے اسے بنایا تھا۔" پھر تھکن سے چور میں واپس اسی کرسی پر آگری۔

آخر کار مجھے آخری بلاوا آیا، مجھے یہی امید تھی۔

دودھ کے گلاس میں پسی ہوئی تین خواب آور گولیاں ڈالے میں اپنے خاوند کی طرف بڑھی۔ میں اندر داخل ہوئی تو نشے میں ڈوبی لڑکی میرے بستر سے اُتر کے جھولتی ہوئی چٹائی پہ جا گری۔ پیر سائیں دودھ چڑھا گیا۔ جب گولیوں نے اپنا اثر دکھا دیا اور تیمیری بھی

گہری نیند سو گئی، تو میں نے ململ کا کپڑا پلنگ کے سرہانے اسی طرح رکھ دیا، جیسے عباپوش نے ہدایت کی تھی۔

اس کے ساتھ لیٹی ہوئی میں اس شخص کے خراٹے گن رہی تھی جسے ابھی مر جانا تھا، یہ اگرچہ ابھی بھی غیر یقینی تھا۔ شاید کچھ بھی نہ ہو، اگر ایسا ہو گیا تو میں تو پکڑی جاؤں گی اور پھر پھانسی کا پھندا ہو گا اور میں۔

"یا اللہ! مجھے اس دنیا سے بچا۔" میں نے التجا کی، اس دنیا میں انصاف کا تصور اتنا ہی غلط اور ظالمانہ ہے جتنا پیر سائیں کا وجود۔ میں زندہ رہوں یا مر جاؤں مجھے آزادی کی ضرورت ہے۔ یہ کہانی اب ختم ہو جانی چاہیے۔ آدھی رات کے قریب میں نے اُس کی طرف پشت کر لی۔ نیند مجھے ان چوراہوں سے بہت دور لے گئی۔

میں ایک دھچکے سے اُٹھ بیٹھی۔

فضا میں کوئی تیز آواز آئی تھی۔

مجھے اپنے خاوند کا بدن بستر سے اُٹھتا اور پوری قوت سے میرے عقب میں واپس گرتا محسوس ہوا۔

وہ پھر بلند ہوا اور پھر بھدی آواز کے ساتھ گرا۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ مجھے کسی کی ویسی ہی موجودگی محسوس ہوئی۔ میرے بدن میں کوئی سرد لہر دوڑ گئی۔ کمرے میں کوئی موجود تھا۔

لمبے وقفے اور سکوت کے بعد دروازہ چرچرایا اور پھر آرام سے بند ہو گیا۔ کلاک ٹِک ٹِک کر رہا تھا، میں دم سادھے پڑی رہی۔ بالآخر میں نے اس انداز میں کروٹ بدلی گویا میں نیند میں تھی۔

گھڑی جیسے میرے سر میں ٹِک ٹِک کر رہی تھی۔ میں نے بغل میں سے جھانکتے ہوئے اسے دیکھنے کی جرأت کی، پیر سائیں پشت کے بل سیدھا پڑا تھا وہ جاگ رہا تھا، سویا ہوا تھا، یا وہ مر چکا تھا؟

اس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ میری آنکھیں حیرت زدہ تھیں۔

خون کی لکیر!

تکیے کے غلاف پہ خون کا دھبہ تھا۔

میرے اعصاب گھڑی کی ٹِک ٹِک کے ساتھ تڑپنے اور اچھلنے لگے۔ آخر کار میں

نے کہنی کے بل کھڑا ہونے کی کوشش کرتے ہوئے اُسے دیکھا اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس نظارے نے میری جان ہی لے لی۔ میں واپس لڑھک گئی۔ مجھے بستر سے اٹھتے ہوئے جیسے ایک اور زندگی گزر گئی۔ بہت محتاط انداز میں تیمڑی کے اوپر سے گذرتے ہوئے میں آہستہ آہستہ دوسری طرف پہنچی۔ پیر سائیں کا منہ اُس کی آنکھوں کی طرح کھلا ہوا تھا میں ایک قدم آگے اور ایک پیچھے کو اٹھاتی۔ وہ مجھ پہ جھپٹ سکتا تھا۔ میں نے ہمت کرتے ہوئے ہاتھ بڑھا کے اس کی نبض کو چھوا۔ دھڑکن بند ہو چکی تھی۔

انگلی کے ساتھ میں نے اُس کے چہرے کو چھوا، اور وہ دوسری طرف مُڑ گیا خون کا ایک اور دھبہ، سر کے دونوں طرف۔ پیر سائیں مر چکا تھا میں اُس کی آرام کرسی پہ بیٹھ گئی۔ میں نے شاید ہی کبھی اسے بھرپور نگاہوں سے دیکھا تھا۔ مجھے اس کی اجازت ہی کب تھی۔ اب میں اس کے مردہ چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

کہانی ختم ہو گئی۔

میں نے سگریٹ سلگایا اور ایک گہرا کش لیا۔

اس طوفان نے جو رحم اور وقفے کے بغیر اُٹھا تھا بالآخر مجھے اٹھا کے ساحل پہ لا پھینکا تھا۔

باب ۱۲

برہنگی

الارم کی تیز گھنٹیوں نے مجھے عین اسی وقت جگایا جس وقت پر وہ پچھلے چوبیس سالوں سے بج رہی تھیں۔ میں کسی خوفزدہ پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتی ہوئی اسی طرح بستر سے اُٹھی جیسے سہاگ رات کی پہلی صبح اٹھی تھی۔ میں نے الارم کو اسی انداز میں بند کیا جیسے میرا خاوند ہمیشہ کیا کرتا تھا۔ تیمڑی کی جگہ آج گُگی، دیا اور مُنی فرش پہ سوئی ہوئی تھیں۔ میں نے سگریٹ سلگایا۔ اس بھیانک رات کو یاد کرتے ہوئے جس میں وہ مرا تھا میرا اگلا دھوئیں سے گھٹ گیا۔ کھڑکی کے درزوں سے روشنی چھن چھن کے اندر آ رہی تھی۔ مجھے ان بہت سی صبحوں کی یاد آئی جو اسی طرح رینگتی ہوئی آتی تھیں۔

سورج کی روشنی کا سیلاب اندر آ گیا۔ میں تازہ اور نئی ہوا میں سانس لے رہی تھی۔

پراگندہ خیالی کا مجھ پہ ایک اور حملہ ہوا۔

خوفناک اور ڈراوٗنی سوچوں کو ذہن سے نکالتے ہوئے میں نے اپنے آپ کو آزادی کی کہانیاں سُنانے کی کوشش کی، لیکن کوئی طریقہ اب کام نہ آ رہا تھا۔ میں نے اپنے حال کے معاملات کی بہتر اور واضح تصویر دیکھنے کی کوشش کی۔ میں ایک قاتلہ تھی یا بیوہ؟

تمباکو نے میرا اگلا پھر جکڑ دیا، گُگی اُٹھ کے بھاگتی ہوئی میری طرف آئی۔

اماں تم ٹھیک تو ہو؟ اُس نے پوچھا۔ ہم دونوں نے پہلے ایک دوسری کی طرف دیکھا اور پھر دونوں ایک ساتھ مخالف سمت دیکھنے لگیں۔ اپنی زندگیوں میں پہلی دفعہ اس کے چنگل سے آزادی کے عالم میں ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی ہم ایک دوسرے سے کیا کہتیں۔

میں نے تیمڑی کے بارے میں استفسار کیا۔

"وہ تو ایسے تھی جیسے میرے باپ کی موت صرف اسی سے بے انصافی تھی" ظاہر ہے آخر کار اس کی حیثیت گھر کی ایک اور ملازمہ کی سی ہو گئی تھی۔ گُگی مجھے راجہ جی کی دستار بندی اور اپنے باپ کی رسم قل کی جزیات کے بارے میں بتا رہی تھی۔ دونوں رسومات اگلی صبح ادا ہونے کو تھیں، لیکن میں تیمڑی کے متعلق زیادہ دلچسپی رکھتی تھی۔ وہ شخص جس نے اسے میرے بیٹے کے قتل کے لئے استعمال کیا تھا مر چکا تھا۔ میں اس کا یقین کر لینا چاہتی تھی

کہ اس کی موت کے بعد اس کے تمام "حقوق" سلب ہو چکے تھے۔

اپنی روزمرہ کی مصروفیات کی ذمہ داریوں سے آزاد میں ابھی تک اس کے بستر پہ ٹانگیں پسارے پڑی ہوئی تھی۔ اب مجھے نہ تو اس کے غسل کے لئے اور نہ ہی ناشتے کے لئے کوئی بھاگ دوڑ کرنا تھی۔ اس کے بغیر بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ کوئی ہلاکت خیز مرض نشان چھوڑے بنا چلا گیا تھا۔ میری بیٹیاں اب وہ غسل خانہ استعمال کر رہی تھیں جہاں اپنے باپ کی زندگی میں وہ کبھی داخل بھی نہ ہوئی تھیں۔ اس کی عدم موجودگی ہماری زندگیوں میں کوئی خلا پیدا نہ کر سکی۔

تعزیت کے لئے باہر بیٹھے ہوئے میں نے سر درد کی اذیت کم کرنے کے لئے اپنی چنی سختی سے سر پہ باندھی ہوئی تھی اور سر بازوؤں میں چھپایا ہوا تھا۔ صرف کسی خاص اور تعلق والی کے آنے پر ہی کھڑی ہو کے اس کے گلے لگتے ہوئے اپنی اس زندگی کے لئے روتی جو اس شخص نے برباد کی جس کے لئے تعزیت کی جا رہی تھی۔

مسکن دواؤں کے زیر اثر بین کرنا اور رونا ہمیشہ بڑا آسان رہا تھا۔

وڈی اور چھوٹی ملکانی اور مہارانی پہنچیں، لیکن میرے عقب میں کسی کی چیخوں نے راجہ جی کے خوفناک مستقبل کے متعلق میرے ذہن میں پیدا ہوتی سوچوں کا سلسلہ منقطع کر ڈالا۔ تیمرو ی ہسٹیریا کا شکار ہو رہی تھی۔ چونکہ گھر بھر ماتم کے عالم میں تھا لہٰذا اس کے رویے کا جواز ہو سکتا تھا، لیکن یہ کہنا کہ اسے گھر والوں سے زیادہ صدمہ ہوا تھا ہماری بے عزتی کے مترادف تھا۔ سب ہی جانتے تھے کہ وہ پیر کی داشتہ تھی لیکن یہ معاملہ اب اس کے ساتھ اس کی قبر میں دفن سمجھا جانا چاہیئے تھا۔ اس کے بجائے یوں ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے وہ اسے واضح اور نمایاں کرنے کی کوشش میں تھی۔

میں نے بیوہ کو بلایا اور اُسے کہا "اس سے پتہ کرو وہ کیا چاہتی ہے، لیکن اپنی طرف سے اُسے یہ پتہ نہ چلے کہ تمہیں میں نے بھیجا ہے۔"

چیل جنازے کے بعد سے غائب تھی۔ کیا اس کی ڈیوٹی بھی ختم ہو گئی تھی؟ مجھے خیال آیا۔ ماں نے مجھ سے تنہائی میں کوئی بات کرنے کی خواہش ظاہر کی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے پیچھے چل پڑی۔

اس کے بستر پہ بیٹھتے ہوئے اُس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے

اور سرگوشی کی "کوئی آستانہ کوئی درگاہ نہیں رہی جہاں میں تمہاری خاطر نہ گئی ہوں۔ کوئی دُعا ایسی نہیں جو تمہاری اس قید و بند سے رہائی، امن، حفاظت اور سکون کے لئے میں نے نہ مانگی ہو۔"

کیا وہ مجھے بتا رہی تھی کہ میری آزادی اس کی دعاؤں کا نتیجہ تھی؟ ماں رو دی۔ "میں نہیں چاہتی تھی کہ تم میری محبت پہ انحصار کرنا شروع کر دو۔ مجھ سے یا کسی اور سے امداد کی توقع رکھنا تمہارے اس حال میں پڑے رہنے سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں اس لئے پیچھے ہٹ گئی تھی تاکہ تم اپنے بل بوتے پر جینا سیکھو۔ میرے پاس تمہیں دینے کے لئے کچھ تھا تو نہیں لیکن میں سب کچھ جانتی تھی۔"

وہ اب مجھے یہ سب کچھ بتا رہی تھی؟ اب جب کہ میں آزاد ہو چکی تھی۔ میں نے اپنا رُخ اُس کی طرف سے موڑ لیا۔ "تمہارے ابا مجھے اکثر خواب میں ملتے ہیں۔ وہ ہمیشہ پریشان اور متفکر ہوتے ہیں۔ میں اُن سے پچھلے چوبیس سالوں کی معافی کے لئے کہتی رہتی ہوں لیکن وہ کبھی مجھ سے راضی نہیں ہوئے۔" وہ رو پڑی اور دوپٹے میں منہ چھپائے ہچکیاں لینے لگی۔

ماں اتنی کمزور تھی کہ اُس نے میری زندگی سے غائب ہو جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ اتنی طاقتور بھی تھی کہ اپنی ممتا کو قتل کرنا اس کے لئے کوئی بڑا کام ثابت نہ ہوا تھا۔

وہ کمزور تھی کہ طاقتور؟

ایسے جیسے اُس نے میرے دل کی بات سُن لی ہو اس نے میری منت کی "میری بچی مجھے معاف کر دو۔ میری معمولی سی ہمدردی بھی تمہیں اس سہارے کا آسرا دلا دیتی جو بعد میں سوکھی ہوئی شاخ ثابت ہوتا۔" "تمہارے چچا حج پہ گئے تو میں نے بشرطِ رازداری انہیں ساری حقیقت بتا دی تھی، میری بیٹی کے لئے شیطان کے پنجے سے آزادی کی دعا کرنا، میں نے انہیں کہا تھا وہاں اللہ سے دعا کرنا کہ وہ اسے اُٹھا لے۔ صرف خدا ہی اس کو سزا دے سکتا ہے۔"

وہ درد جسے اُس نے اپنے دل میں کہیں دور دفن کر ڈالا تھا آخرکار اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ یہ صبر تھا یا لالچ؟

میں نے سوچا اس نے بھائی کا کیا حشر کیا تھا۔ ایک بار پھر جیسے اس نے سُن لیا تھا۔

اُس نے جواب دیا "میں جانتی تھی کہ تمہارا بھائی کمزور دل ہے اس لئے میں نے ہمیشہ اسے یہی کہا کہ تم خیریت سے ہو، لیکن جب اس نے تمہیں پٹتے ہوئے دیکھ لیا تو میری ساری محنت اکارت چلی گئی۔ آج پہلا دن ہے جب اس کے چہرے پہ مسکراہٹ آئی اور اس کے لئے اس

کے پاس وجوہات تھیں۔"

دوانتہاؤں کے درمیان الجھے ہوئے میرے بھائی کے معاملے میں اب وہ بات کر سکتی تھی پہلے نہیں کیونکہ اس وقت یہ اس کے مفاد میں نہ تھا۔ اپنے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتی ماں کی نظریں مجھ پہ اور میری اس پہ جمی ہوئی تھیں۔

ماں بوڑھی ہو گئی تھی بالکل جیسے مسوڑھوں میں محض اٹکا ہوا کوئی دانت۔ ماں کی حیثیت میں اس نے میری زندگی داؤ پہ لگا دی تھی اور اب اس کا نتیجہ اس کی پیشانی پہ کندہ تھا۔ میری طویل غیر حاضری اس کے چہرے کی لکیروں میں گھس گئی تھی۔ مجھے اذیت کی ایک اور گواہی ملی۔ وہ مجھ سے دوری کے درد میں مبتلا تھی۔ میں بے ساختہ اس سے لپٹ گئی۔ اس کے ضعیف بدن سے بھاری وزن اٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اب اس پہ سوچنے کی ضرورت نہ تھی۔

بیوہ بھاگتی ہوئی اندر آئی "بی بی جی میں آپ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی ہوں، یہ بہت ضروری ہے۔"

ماں کمرے سے باہر نکل گئی تو وہ میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ ارد گرد دیکھتے ہوئے اس نے سرگوشی کی "تیمیڑی کہہ رہی ہے کہ اپنے جنازے کی صبح پیر سائیں اس سے نکاح کرنے والا تھا۔ وہ حویلی کی مالکن بننے جا رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اتنی دکھی اور غم زدہ تھی۔" مجھے دھچکا لگا اور میں نے وہیں صوفے پر اپنے خاوند کے انداز میں بیٹھتے ہوئے اُسے اپنے سامنے بلوا لیا۔ میں اُسے اسی انداز میں پیٹنا چاہتی تھی لیکن اس کی موت کے دوسرے ہی روز یہ غیر مناسب ہوتا۔ اس سے کوئی سکینڈل کھڑا ہو سکتا تھا...... یا اس سے بھی بدتر کوئی چیز۔

تیمیڑی اس باغیانہ انداز میں اندر آئی کہ عقل و فہم میرا ساتھ چھوڑ گئے اور میں نے اس پہ یلغار کر ڈالی۔ اسے بالوں سے قابو کر کے اس کا سر پیچھے کھینچتے ہوئے میں نے اس کی آنکھوں میں گھورا۔ ان میں جوابی چمک تھی۔

"بی بی جی جب پیر سائیں مر رہا تھا۔ تو میں جاگ رہی تھی۔"

میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میرا ردِ عمل میرے اندرونی خوف کا عکس ثابت ہو سکتا تھا لیکن اس کے بجائے میں نے اُسے ایک زوردار تھپڑ جڑ دیا۔ وہ چیخ مارتی ہوئی بھاگ نکلی دروازے پہ ایک لمحے کے لئے رُکتے ہوئے وہ بڑے مکارانہ انداز میں مسکرائی۔

میرے ہوش و حواس بحال ہونے میں جیسے ایک عمر بیت گئی۔ کیا وہ جانتی تھی؟ اس نے کیا دیکھا تھا؟ میں نے ان لمحات کو یاد کرنے کی کوشش کی جنہیں میں ہمیشہ کے لئے بھلا دینا چاہتی تھی۔ میں نے تو یہ سوچا تھا کہ لڑکی میرا گواہ ثابت ہو گی، چونکہ اسے کوئی خبر نہ ہوتی لہٰذا وہ قدرتاً میری مددگار ہوتی۔ اس کے بجائے اب میری بدترین دشمن کے پاس میرا سب سے خطرناک راز تھا۔

پیر سائیں کے قُل کے روز راجہ جی کی دستار بندی متضاد اور الجھے ہوئے جذبات کا اکھاڑہ ہو گئی۔ ایک نوعیت کے احساسات دوسری قسم کے جذبات کو مسترد کر رہے تھے۔ شیطان کی طرح اس جیسے پیر بھی مختلف شکلیں اور روپ بدلتے بار بار اور ہمیشہ کے لئے ظاہر ہوتے آ رہے تھے۔ ایک مر جاتا تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا۔ میرے لئے تو تیمیڑی جو کچھ دیکھ چکی تھی اس کا خوف دونوں سے بڑھ کے تھا۔

اندر راجہ جی کی دادی کی بہنیں جن کے لئے ضعیفی کی وجہ سے کھڑا ہونا بھی مشکل تھا، جھکتے ہوئے نئے پیر کے پاؤں چھو رہی تھیں۔ نوکرانیاں اس کے سامنے فرش پہ بچھ بچھ جاتیں۔ باہر ہر طرف شامیانے نصب ہو گئے اور ان کے درمیان ایک شاندار سٹیج تیار کر دیا گیا۔ دنیا جہان سے مرید جس طریقے سے ہو سکا جس طرح بن پڑی پہنچ گئے۔ صندوقچیاں اور خزانے بھر گئے۔ راجہ جی اپنے تخت پر آ بیٹھا۔ اس کے عقب میں سات سوتیں دوسرے دیوتا قطار در قطار براجمان ہو گئے۔

لوہے کے صندوق سے باباجی کی بوسیدہ چیتھڑا نما سی پگڑی ایک بار پھر نکالی گئی اور اب راجہ جی کے سر پہ رکھ دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی فضا اللہ ہُو! اللہ ہُو!! کے باآواز بلند ذکر سے گونج اُٹھی۔

ایک اور پیر کی تاج پوشی ہو گئی۔

ایک اور دیوتا تلاش کر لیا گیا۔

لوگوں نے آہیں بھریں اور چلائے "اللہ کا شکر ادا کرو کہ اُس نے اپنا شفقت بھرا ہاتھ ہمارے سروں پر رکھا۔ اُس کا شکر ادا کرو کہ اس نے ایک عظیم نقصان کو ایک عظیم انعام میں بدل دیا۔ وہ یقیناً اپنے چنے ہوؤں کے ذریعے ہم پہ اپنا فضل و کرم جاری رکھ رہا ہے۔"

اپنی پیشانی سے پسینے کے موتی صاف کرتے ہوئے مجھے چالیس روز گذر گئے۔ اب

چیل کی جگہ تیمڑی مجھے ہر کونے سے ٹکٹکی باندھے گھورتی دکھائی دیتی۔ اسے یاد کرتے ہوئے میں نے دائی سے پوچھا "چیل کہاں گئی؟"

اس نے مزاحاً کہا "مالک نے اُسے ہمہ وقت نگرانی میں یوں مصروف رکھا تھا کہ اب وہ اپنی کھوئی ہوئی نیند کو پورا کر رہی ہے۔ راجہ جی تو اپنے عقاب مقرر کرے گا" اس نے سنجیدگی سے بات پوری کی "وہ علیل ہے اور اسے آرام کی اشد ضرورت ہے۔"

چیل اچانک میرے سامنے آ ظاہر ہوئی۔ میں اُسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ میری طرف آتے آتے رُک گئی۔ اس نے اپنا منہ کھولا جیسے کوئی بات کرنے لگی ہو لیکن پھر وہ اچانک واپس لوٹ گئی۔ میری نگاہیں اس کی پشت پہ ٹکی رہیں۔ جب وہ مزار کے دروازے سے غائب ہو گئی تو میں نے سوچا "یا اللہ یہ کون ہے؟ یہ اتنی انوکھی، اتنی عجیب و غریب اور پراسرار کیوں ہے؟"

سخی بی بی اور وڈی ملکانی نے میری توجہ ہٹا دی وہ ایک بلا کے نزول کو ٹالنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ مہارانی کا نکاح اس کے ایک کزن سے کر دیا گیا تھا۔ میں نے سکون کی سانس لی کہ نکاح نے اس کے اور راجہ جی کے درمیان فاصلہ قائم کر دیا تھا۔ میرا بیٹا غصے سے بھر گیا لیکن اب وہ بے بس تھا۔ بے بسی کے عالم میں اس نے اپنے عیاش چچا والی حالت بنالی۔ میں نے اُسے اس کے حال پہ چھوڑنا بہتر سمجھا کہ اسی میں اس کی بہتری تھی۔

میں نے بیوہ کو تیمڑی کے پیچھے لگا دیا۔ مہینے بھر کے بعد ہی وہ مجھے کچھ بتانے کے قابل ہو سکی، بی بی جی میں نے تیمڑی کو دائی سے کوئی بات کرتے ہوئے دیکھا جواباً کانوں کو ہاتھ لگاتی توبہ توبہ کر رہی تھی۔ جب میں قریب ہوئی تو وہ دونوں چپ سادھ گئیں۔ مجھ پہ تو وہ اعتبار کرتی ہی نہیں۔

میرے اعصاب کھچاؤ کا شکار ہو گئے۔ خوف سے لرزتے ہوئے میں نے اسے ڈانٹا، "تم اپنے بارے میں اُن کے اس احساس کو ختم کیوں نہیں کرتیں، اگر تم کوئی خبر نہیں لا سکتی ہو تو میرے کس کام کی ہو؟"

لیکن میں اس سے بھی ڈرتی تھی کہ تیمڑی بیوہ کو اپنا راز بتا دے۔ پیر سائیں کی قبر ابھی تازہ تھی۔ مجھے اس کی واپسی کا خوف نہ تھا...... لیکن پوسٹ مارٹم کا خوف مجھے ایک بار پھر باباجی کی قبر پہ لے گیا اور میں اس نئے خطرے کا ان سے ذکر کرتے ہوئے رو دی۔

"شیطان مجھے خوف و ہراس میں مبتلا رکھنے کیلئے اس تیمڑی کو پیچھے چھوڑ گیا ہے۔" میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ "اس کا دل اس کے سینے میں زندہ اور دھڑکتا ہے۔ وہ مجھے اسی کی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔"

میرے بدن میں وہی سرد لہر دوڑ گئی۔ مجھے کسی کی ویسی ہی موجودگی محسوس ہوئی میں نے سر اٹھایا تو وہاں کوئی موجود تھا۔ کسی دوسری دنیا سے لیکن اپنوں ہی جیسا۔

تم کیا چاہتی ہو؟ ڈھکی چھپی آواز میں پوچھا گیا۔ میری خواہش میری زبان پہ رکھی تھی "تیمڑی کی موت" اس سے پیشتر کہ وہ غائب ہونے کے لئے مُڑتا میں نے تیزی سے پوچھا "تم کون ہو؟"

اس کے بجائے جواب آیا "آئندہ مہینے کی یکم تاریخ کو کام کر دیا جائے گا" پھر وہ چل دیا...... تھوڑا سا لنگڑاتے ہوئے۔

میں بار بار وہی سوال کر رہی تھی جس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس سے بھی بدتر یہ کہ میں ایک اور قتل کے وقوع پذیر ہونے کی متمنی اور منتظر تھی۔

اگرچہ میں بری طرح یہ چاہتی تھی کہ پتہ چلے کہ تیمڑی نے قتل کی رات کیا دیکھا تھا لیکن اس کے ساتھ میری یہ خواہش بھی تھی کہ وہ یہ راز کسی کو نہ بتائے، نہ مجھے نہ کسی اور کو۔ میں نے اُس سے بہتر برتاؤ کرنا شروع کر دیا تا کہ وہ اگلے ماہ کی پہلی سے قبل کسی کو اس بارے میں نہ بتائے۔

ایک روز جب وہ میرے لئے ناشتے کی ٹرے لگا رہی تھی میں نے اُس سے پوچھا "تم مجھے اپنا دشمن سمجھتی رہیں لیکن میرے پاس تو کوئی چارہ کار تھا ہی نہیں۔ ہم سب تو مالک کے حکم کے بندے تھے۔ یہاں جو کچھ بھی ہوتا تھا وہ اسی کی خاطر ہوتا تھا۔"

ہم جب بھی تنہا ہوتیں میں اُس سے کوئی بھلی سی بات کر دیتی اور پھر بہت جلد میری شفقت اور سرپرستی کو قبول کرتے ہوئے وہ میرے کاموں میں جان مارنے لگی۔

میرے سامنے فرش پہ چوکڑی مارے وہ اپنے آنچل میں منہ چھپائے رو پڑی۔ "بی بی جی ہم سب مالک کی خدمت میں تھے۔ جن چیزوں کا میں تصور بھی نہ کر سکتی تھی میرے ہاتھوں وجود میں آئیں۔ آپ کی طرح میرے سامنے بھی کوئی اور راستہ کہاں تھا، اگر آپ مجھے موقع دیں تو میں اپنی زندگی کی قیمت پہ آپ کی خدمت کروں گی۔" زار و قطار روتے اور

ہچکیاں بھرتے وہ میرے قدموں میں گر گئی۔

میں اُسے گلے لگالینا چاہتی تھی لیکن پھر مجھے چھوٹا سائیں یاد آگیا۔ وہ نا قابلِ اعتبار تھی۔ میں نے اسے اپنی طرف دیکھنے کو کہا "جو ہو چکا سو ہو چکا۔ ہمیں ماضی کو بھلا دینا ہے۔ اب ہمارے پاس چوائس بھی ہے اور موقع بھی۔"

تیمڑی روتے ہوئے بولی "بی بی جی جس رات مالک فوت ہوئے مجھے بڑا بھیانک خواب آیا۔ سفید لبادے والے کسی شخص نے ململ کے کپڑے کے ساتھ ان کا گلا گھونٹ ڈالا۔ مالک ہوا میں اُٹھا اور دھڑام سے بستر پہ آگرا۔ اُس کے کانوں سے خون نکل رہا تھا۔"

میرا دل میرے سینے میں دھک دھک کر رہا تھا میں نے اس سے پوچھا آیا اُس نے قاتل کا چہرہ دیکھا تھا۔

"میں نے ایک عبا والے شخص کو کمرے سے نکلتے دیکھا۔" وہ کچھ اور کہتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ اس تجسس سے کہ آخر وہ کون تھا میں نے اسے بتانے کو کہا۔ وہ خاموش رہی۔

"تم جانتی ہو وہ کون تھا؟" میں نے پھر پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اصرار کیا "وہ کون تھا؟"

"وہ چیل تھی بی بی جی۔" اس نے کہا اور میرا دل جیسے تھم گیا۔

"چیل"

"ہاں بی بی جی، میں نے اسے لنگڑاتے ہوئے اندر آتے اور پھر مالک کے سرہانے کھڑے ہوتے دیکھا۔"

چیل! کیا وہ چیل تھی؟ نہیں، نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ تیمڑی فریبِ نظر کا شکار تھی، لیکن لنگڑاپن؟ عباپوش لنگڑاتا کیا چیل لنگڑاتی تھی؟

"جب آپ نے مجھے جگایا تو خواب سچ ہو چکا تھا۔ بھیانک سپنا سچ نکلا۔ مالک قتل ہو چکا تھا۔ اسے چیل نے ہلاک کیا تھا۔ اُس نے غداری کی۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے۔ میں قسم کھاتی ہوں وہ وہی تھی۔" تیمڑی زور زور سے رو رہی تھی اُدھر میں اس انکشاف کے دھچکے سے نبرد آزما تھی۔

لرزتے ہوئے میں نے اُسے یہ سب کچھ بُھلا دینے کو کہا۔

"ماضی حال کو زہر آلود کر دے گا اور مستقبل ختم ہو کے رہ جائے گا۔ راجہ جی تمہیں

مالک کی حفاظت نہ کر سکنے کے جرم میں قتل کر ڈالے گا۔ قتل کے وقت خاموش رہنے کے قصور پہ وہ پھانسی کے پھندے پہ لٹکا دیں گے۔ تمہیں سازش کے شریک کار کی حیثیت میں موت کی سزا سنا دی جائے گی۔ کوئی یہ ماننے کو تیار نہ ہو گا کہ چیل بھی مالک کو دھوکہ دے سکتی تھی۔ اپنے ذہن سے اسے فوراً مٹا ڈالو فوراً، مالک مر چکا ہے اور ہم سب زندہ ہیں۔ یہ تو محض ایک خواب تھا۔ خواب سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔" میں نے اسے تنبیہہ کی۔

بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال میرے ذہن میں لپکا، اگر وہ لبادے والا چیل ہی تھی تو پھر تو اس رات کا اسرار جب وہ وعدے کے مطابق نہیں آیا تھا، کھل گیا تھا۔ چیل کو اس رات مردہ بچے کو دفن کرنا تھا۔ تیمڑی چلی گئی تو میں اپنے ابروؤں سے پسینہ صاف کرتے ہوئے یہی سوچتی رہی کہ اسے زندہ رہنا چاہیئے تھے یا ہلاک کر دی جاتی۔ قاتل چیل ہی تھی یا کوئی دوسرا؟

اگلے تین ہفتے خوف و ہراس کے عالم میں یوں گذرے کہ مجھے چیل کو بلانے کا یارا بھی نہ ہو سکا جواب مشکل سے ہی دکھائی دیتی تھی۔ اب ایک ہیولہ میری نگاہوں کے سامنے لنگڑانے لگا۔ میں نہیں جانتی میں تیمڑی کے قتل کا پروگرام منسوخ کروانے ہر شام مزار کی طرف کیوں بھاگ نکلتی تھی۔ لنگڑا ہیولہ دوبارہ بہر حال میرے سامنے نہ آیا۔

قتل کی رات آگئی، چیل کو ڈھونڈنے کے لئے مایوسی اور غیر یقینی کے عالم میں میں دائی کی طرف بھاگی۔ وہاں پتہ چلا کہ چیل تو شدید علالت کی وجہ سے بستر سے اُٹھنے کے قابل بھی نہ تھی، اگر وہ چیل ہی تھی تو پھر سکون کی سانس لی جا سکتی تھی کہ آج تو وہ صاحبِ فراش تھی۔ میں نے دروازہ مقفل کر لیا۔ کئی خواب آور گولیاں کھانے کے باوجود عباپوش مسلسل میرے ذہن میں لنگڑاتا گھومتا رہا۔

صُبح سویرے کسی نے دروازے پہ زور زور سے دستک دیتے ہوئے مجھے بے سکونی کی نیند سے بیدار کر دیا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ نوکرانیاں ایک ساتھ روتی چلاتی ہوئی آئیں "بی بی جی تیمڑی چل بسی، وہ مر گئی، مر گئی۔" وہ بار بار کہہ رہی تھیں۔

وہ بھوسے کے ایک ڈھیر کے اوپر چڑھی اور پھر اسی میں غرق ہو گئی۔ جب آوارہ کتوں نے ڈھیر کے ارد گرد بھونکنا شروع کیا تو لوگوں کو شک گزرا اور انہوں نے ڈھیر کو گرا دیا۔

تیمڑی کی موت دم گھٹنے سے واقع ہوئی تھی۔

میرے خاوند کا قتل جہاد تھا۔ میں نے ایک بت توڑ ڈالا تھا۔ وہ ایک مکار ٹھگ تھا لیکن تیمبڑی؟ اس کے لہو نے میری روح کو داغدار کر ڈالا۔ پیر سائیں ابھی وہیں تھا اگرچہ اس کا بدن اپنا سب کچھ لئے گہری زمین میں دفن ہو گیا تھا لیکن اس کا ہر شیطانی فعل کسی زہریلے سانپ کی طرح میرے دل کے اندر گہرائی میں کہیں کنڈلی مارے ہوئے تھا۔

میں نے دائی کو بلا کے چیل کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں تھی۔ آج کل وہ دالان میں کیوں نہیں آ رہی؟ کیا اس نے بہت آرام نہیں کر لیا؟

دائی میرے دل کی دھک دھک سے بے خبر بولی "ڈاکٹر نے کہا ہے مرض اس کے بدن کے ہر حصے تک پہنچ چکا ہے، اگر اس نے احتیاط نہ کی تو بی بی جی وہ مر جائے گی۔"

"اُسے کیا مرض ہے؟" میں نے پوچھا اور اس کے الفاظ معمے کے حل کی طرف اشارہ کرنے لگے "سالوں قبل دیمک اس کے پاؤں میں داخل ہو گئی اور پھر اُس کے بدن میں تیزی سے پرورش پانے لگی۔ اس کی ڈیوٹی کا تقاضا تھا کہ وہ ہر وقت ہوشیار رہے لہٰذا وہ اس کے علاج کے لئے کوئی فرصت نہ نکال سکی۔ بہت سالوں سے تو وہ اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے کے قابل بھی نہ رہی تھی لیکن مالک کا حکم تھا کیا کرتی۔"

میں نے دائی سے پوچھا "کیا وہ لنگڑاتی تھی؟" اور جواباً اس نے تیمبڑی کے الزام کی تصدیق کر دی۔ مالک کی موت سے چند روز پہلے اس کا درد نا قابل برداشت ہو گیا ورنہ وہ تو اپنی حالتِ زار کے سامنے سر جھکانے سے برابر انکار کئے رہتی۔

میرا ذہن تیمبڑی سے چیل کی طرف پرواز کر گیا۔

میں سیدھے سبھاؤ اس کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہ فرش کے اوپر بچھے روئی کے گدیلے پہ پڑی تھی۔ چیل نے حیرت زدہ آنکھوں سے مجھے دیکھا اور انتہائی مشکل سے اُٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے کندھا دباتے ہوئے اسے روک دیا "لیٹی رہو میں تمہارے پاس بیٹھتی ہوں۔" سکوت تکلیف دہ تھا۔

اس وقت اس کی آنکھیں رو رو کے سوجی ہوئی تھیں نہ کہ عقاب کی طرح چھپی ہوئی۔ اس کی پیشانی باہر کو نکلی ہوئی تھی لیکن اس کا زاویہ اتنا بھی نہ تھا کہ اسے گدھ سے تشبیہ دی جاتی جو میں دیتی رہی تھی۔ نہ ہی یہ وہ عورت تھی جس سے میں خوف زدہ تھی اب تو وہ عبا والے پراسرار شخص جیسی بھی نہ لگ رہی تھی۔ آج چیل ایک ایسی عورت کے روپ میں

تھی جس سے پہلے نہ ملنے کا مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ چیل پہلے کی طرح آج بھی درد اور اذیت سے گذر رہی تھی لیکن مجھے اس کا کبھی احساس نہ ہوا۔

میں حیران تھی کہ آج تک میں نے اس گھر کی جتنی بھی دیکھ بھال کی تھی اس کے دوران مجھے کبھی یہ احساس تک نہ ہو سکا تھا کہ چیل کی زندگی میرے جہنم سے بہتر نہ تھی۔ اور یہ کہ اُسے بھی مالک سے اتنی ہی نفرت ہونی چاہیئے تھی جتنی مجھے تھی۔

ہم دونوں خاموش تھیں مجھے تو یہ بھی پریشانی تھی کہ میں اُسے کس نام سے بلاؤں، اب اُسے چیل کہنا بڑی کمینگی دکھائی دیتی تھی۔

بات میں نے ہی شروع کی "تم نے تیمبڑی کی موت کے بارے میں سنا؟" اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے کہا "وہ قتل ہوئی تھی؟" اس نے ہاں میں جنبش کی میں نے پوچھا "کیا میں راجہ جی سے تمہارے بہتر علاج معالجے کے لئے بات کروں؟" تو اُس نے پھر مثبت جواب دیا۔

"تمہیں کس قسم کی تکلیف ہے؟" میں چبھتے ہوئے سوال اس لئے کر رہی تھی کہ وہ دق ہو کے بولے اور اس کی آواز سُن کے میں اس راز کی تصدیق کر لوں جو میرے ذہن میں اب کوئی راز نہ رہا تھا، لیکن وہ صرف کندھے جھٹک کے رہ گئی۔

میں بار بار اس کے پاس گئی لیکن اس سے ایک لفظ تک نہ اگلوا سکی۔ ایک نوکرانی نے میرے دروازے پہ بیٹھی دائی سے چیل کی ابتر ہوئی حالت کا ذکر کیا تو میں جائے نماز سے اٹھ کے بھاگتی ہوئی اس کے کمرے میں پہنچی۔

چیل مر رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میری پوری زندگی میری آنکھوں دیکھتے میرے ہاتھوں سے پھسلتی دور چلی جا رہی تھی۔ اس کا ہاتھ تھامے ہوئے میں نے اُس سے التجا کی "اگر تم نے اب بھی مجھے اپنے متعلق نہ بتایا تو پھر میں کبھی بھی اسے جان نہ سکوں گی۔ خدا کے لئے بولو ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔"

اس کے لب پھڑ پھڑائے۔ وہ بول اُٹھی، میں نے اس کی آواز سنی۔ چادر میں ڈھکی ہوئی اسی عبا پوش کی آواز تھی۔

میرے پورے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔

"جب سے میرے آباؤاجداد باباجی کی میت پہاڑوں سے لائے میرے خاندان کے ہر مرد کو قتل کر دیا گیا۔ میرے دادا، میرے والد اور میرے سب ہی بھائی اپنے مقدس مشن کی بھینٹ چڑھ گئے۔ یہی وجہ تھی کہ میں مالک کی بیعت ہو گئی۔ زندگی برابر ایک لمبے عرصے کے دوران میں اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔"

مجھے یاد آیا طوطی چیل کو محبت سے یاد کیا کرتی تھی۔ اسے یقیناً اس کے متعلق سب خبر ہو گی۔

دیمک اس کے بدن کے ہر عضو اور حصے کو چاٹ اور کھا رہی تھی ' لیکن اس کے باوجود وہ کتنی بہادر کتنی شجاع تھی۔ کوئی دوسرا مریض ایسا کبھی نہ ہو سکتا۔ پیر کو اس کے مشن کے بارے میں کوئی خبر نہ ہو سکی، لیکن مجھے ابھی اور بہت کچھ جاننے کی ضرورت تھی۔ "تم نے زندگی بھر اس کے لئے انتظار کیوں کیا۔" میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے جان بوجھ کے اپنی آواز چادر میں چھپائی۔ اب کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کا یہ انداز بذاتِ خود ہر چیز کو عیاں کئے دے رہا تھا۔

"بی بی جی، اس پہلے آپ اس کے لئے تیار کہاں تھیں؟"

اب مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ رہی تھی اور نہ ہی اسے کوئی جواب دینے کی۔ اس رات میں اپنے کمرے میں چیل کی موت کی اطلاع کی منتظر رہی اور وہ جلد ہی مجھے مل گئی۔

خدایا، وہ مظلوم روح عمر بھر میرے سامنے رہی ' لیکن میں اسے پہچان نہ سکی! یہ کیسے ہوا کہ میں اس کے دکھ درد کو نہ جان پائی؟

میں چیل کی المناک زندگی پہ اگر زیادہ نہیں تو اتنا ضرور روئی جتنا میں کالی اور تیمیڑی کی زندگیوں کو روئی تھی۔ میں اس کی عمر بھی کی کمائی پہ آنسو بہاتی رہی، میرے پاس آنسو بہاتی دو آنکھوں اور ایک پرسوز دل کے سوا اور کیا رکھا تھا، لیکن اس نے اپنا جیون اپنے بزرگوں کا مقدس مشن پورا کرنے میں جھونک دیا تھا۔ اس نے وہ جرات اور بے باکی دکھائی تھی جس کا مظاہرہ اس کے خاندان کا کوئی مرد کبھی نہ کر سکا تھا۔

چیل کی زندگی اور اس کی موت کے باعث پیر سائیں سے مزید نفرت کے عالم میں چھ ماہ اور بیت گئے۔ مجھے اچانک یہ احساس ہوا کہ احساسِ جرم تو ایک پھندا تھا۔ میرے زندہ رہنے بلکہ ہونے کے لئے لازم تھا کہ اس کی موت واقع ہو جاتی۔ شاور کے نیچے کھڑے

کھڑے میں نے نادیدہ غیبی طاقت سے رجوع کیا اور ہر اُس ممکنہ راستے کے بارے میں سوچا جس سے میں اپنے خاوند کے بھیانک ورثے سے نجات پا سکتی۔ بالآخر میرے سامنے ایک ہی راہ رہ گئی، اگر یہ ممکن ہوتا کہ میں مسجد کے لاؤڈ سپیکر پہ لوگوں کو بتا سکتی کہ پیاری میں ہی تھی تو مجھے وہ راستہ اختیار کرنے کی ضرورت نہ رہتی۔ لیکن اس "دھماکے" اور "پلیدگی" کے بارے میں ہلکا سا شک بھی راجہ جی اور اس کے چچاؤں کے ہاتھوں قبل از وقت کچل دیا جاتا۔ پیاری کے نام کا خفیف سا تذکرہ سکنے سے پہلے ہی وہ مجھے موت کے گھاٹ اتار دیتے، لیکن انتقام کے بنا چین نہ تھا۔

پیاری کا نقاب اترے بنا کوئی تبدیلی آ نہیں سکتی تھی۔

میرے دل کے فیصلے پہ میرے دماغ نے مُہر لگائی اور راستے کا انتخاب ہو گیا۔ دُھند چھٹ گئی۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو کرب اور اذیت کے سال پیچھے رہ گئے۔

میرے دل نے نئی دھڑکنوں کو ترتیب دیا۔ نئے منصوبے وجود میں آئے، شفایاب اور پرسکون میں نے وہ چست لباس زیب تن کر لیا جو میری کھال ہی کی طرح کا تھا۔

صحن میں کھڑے کھڑے میں نے زوردار حُکم سنایا "تارا کو بلا بھیجا جائے۔" ایک شیرنی میری چوکور دنیا کے ڈگ بھرتے آئی۔ اس کا شاہانہ سر ایک صراحی دار خوبصورت گردن پہ تھا اور چوڑے چکلے شانے پتلی اور ستواں کمر پر، یوں جیسے ختم ہونے کو ہی نہ آئیں، کہانیوں کا کردار میرے سامنے کھڑا تھا۔ تارا میرے پاؤں چھونے کے لئے جھکی ' لیکن اس کے انداز میں سختی تھی جو اس رسم کے خلاف اُس کی ذہنی مزاحمت کی پیداوار تھی۔

میں نے اسے درزن کے طور پر ملازم رکھ لیا اور ساتھ ہی اسے اپنے کمرے میں لے گئی جہاں وہ سلورفش کی سی اپنی آنکھیں گھماتی ارد گرد دیکھتی رہی۔ میرا ناپ لیتے ہوئے بھی اس کی نگاہیں میرے بدن پہ نہ تھیں۔ میں نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ چوکڑی مارتی میرے قدموں میں بیٹھ تو گئی لیکن آنکھیں بدستور اِدھر اُدھر ہر طرف جھپکائے جا رہی تھی۔ میں نے ٹکٹکی باندھ کے اُن میں جھانکا تاکہ ہمارا رابطہ قائم ہو۔

"تم اور میں دکھوں کے ساتھی ہیں، میں نے اسے کہا، ہم ایک جھوٹے اور شیطانی نظام کے قیدی ہیں۔ ہم ایک زہریلے کیکڑے کی گرفت میں ہیں۔ اس کے پنجے اسلام کی اصل طاقت کو اس لئے غصب کئے ہوئے ہیں تاکہ وہ ہمارا ہر ممکن طریقے سے ہر وقت

استحصال جاری رکھ سکیں۔ اس کی گرفت بڑھتی تو ضرور ہے لیکن اتنی نہیں کہ شکار کا دم ہی گھٹ جائے' تارا کی آنکھوں میں ٹھہراؤ نہیں تھا لیکن وہ سُن رہی تھی۔ "وہ ہمیں صرف اتنا اور اس لئے سانس لینے کی اجازت دیتے ہیں تاکہ اس دوران وہ ہمارے وجود پہ ہاتھ صاف کر سکیں۔ میں اور تم زندہ نکل آئی ہیں اسی لئے میں تم پہ اعتماد کر رہی ہوں۔"

اچانک اس نے اپنی نگاہیں مجھ پہ مرکوز کر دیں۔ کسی نے کبھی یوں اتنی گہرائی میں میری آنکھوں میں نہیں جھانکا تھا۔ مجھے بے چینی سی محسوس ہوئی۔

اس کی نگاہ تیکھی اور تیز تھی لیکن اس کی آواز میں ٹھہراؤ اور دانش تھی "بی بی جی بے انصافیوں کا انتقام لینے کا جذبہ اب میرا واحد سرمایہ ہے' لیکن ہم عشروں سے گڑے ہوئے اس نظام اور سوچ سے کیسے لڑیں گی؟ وہ ہمیں کافر قرار دیتے ہوئے کھونٹوں سے باندھ کے جلا ڈالیں گے۔ ان کا پروپیگنڈہ برھ کی جڑوں کی طرح گہرا اور پراثر ہے ہمارا احتجاج کمزور اور ضعیف جس کا آغاز بھی مشکل ہوگا۔"

اس نے گہری سانس لی جو انہی مجبوریوں اور کمزوریوں کا اظہار تھی لیکن وہ بہر حال اپنے آپ کو میرے ساتھ وابستہ کر چکی تھی۔

میں آپ کے شانہ بشانہ ہر چیز کے لئے تیار ہوں آپ مجھے جو چاہیں کرنے کو کہیں، سکون کی سانس لیتے ہوئے میں نے تارا کو اپنے مقصد کے بارے میں بتایا۔

"درگاہ ہر قسم کے انسانی استحصال کا گڑھ بن چکی ہے، اگر اللہ کے نام کو کمزوروں اور غریبوں کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے تو استحصال کے لئے موجود باقی بے شمار ذرائع کو استعمال کرنا تو بڑا معمولی اور آسان تر ہے، اگر ہم اس مزار کے خلاف جنگ کا آغاز کر سکے تو یہ سچائی کی خدمت ہوگی۔"

بہت سی راتیں گذرنے کے بعد میں نے پچھلے گیٹ کا کنڈا کھولا اور پھر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف لپکی، تاکہ غسل خانے کا دروازہ کھول دوں۔ تارا ہیر و نمبر ایک کو لئے اندر داخل ہوئی۔ میری ابھی تک شیطان کے اڈے میں موجودگی اس کے لئے حیران کن تھی اور اس وقت تو وہ خوف سے بے ہوش ہوتے ہوتے بچا جب میں نے اُسے بتایا کہ "میں پیاری نہیں ہوں ہیر ہوں پیر سائیں کی بیگم اور راجہ جی کی ماں۔ جب ہم آخری بار ملے تو تمہارا پیر پہ اعتقاد ختم نہیں ہوا تھا۔ اب اسے ختم کر دو۔"

ہیرو نمبر ایک لرزا اور کانپا تو ضرور لیکن اس کے ذہن میں موجود تقدس کی کہانی کے چیتھڑے اڑ گئے۔ جب وہ جا رہا تھا میرا دل یوں اُڑ رہا تھا جیسے طوفانی ہوا کسی پر کو تھپیڑے لگا رہی ہو۔

حویلی سے باہر قدم رکھنے کی میرے آرزو بھی شاید اتنی ہی زوردار تھی جتنی تقدس کے پردے میں چھپتی ہوئی شیطنیت کو ننگا کرنے کی خواہشیں۔ تارا نے میری حوصلہ افزائی کی "بی بی خوف کے علاوہ ہمارے راستے میں کسی اور بلا کا کوئی وجود نہیں، اگر ہیرو اندر آسکتے ہیں تو ہم بھی باہر جاسکتے ہیں۔"

"وہ کیسے؟" میں نے غیر یقینی کے عالم میں اپنی دوست سے پوچھا "رات کو معمول کے مطابق خواب گاہ میں آؤ اور دروازے کو مقفل کر دو۔ کسی کو یہ توقع نہیں کہ آپ کبھی عقبی دروازہ استعمال کریں گی اس لئے کون پرواہ کرے گا۔ میں آپ کو برقعہ پہنا کے لے جاؤں گی۔ آپ جہاں بھی چاہوں گی ہم ایک دو گھنٹے کے لئے ہو آئیں گے۔" اس نے مشورہ دیا۔

میرا ذہن اس تجویز کے لئے پرجوش تھا، لیکن دل ہی دل میں میں ڈر رہی تھی۔

تارا فہرست بنا رہی تھی اور میں عجیب سی دعا میں مصروف تھی۔ "یا اللہ! میرے اچھے کردار کا کس کو فائدہ ہوگا۔ میرا وجود بے معنی ہے مجھے ایک گناہ کر لینے دے۔ مجھے اپنے وجود کو استعمال کر کے اس برائی کو بے نقاب کر لینے دے جسے یہ مزار، یہ درگاہ، یہ آستانہ تیرے پاک نام کی آڑ میں چھپائے ہوئے ہے۔ مجھے وہ راستہ اختیار کرنے کی اجازت دے دے جو مجھے بے شک تباہ کر دے لیکن ان گمراہ کن ظالمانہ بدعتوں اور عقائد کا خاتمہ کر دے جو تیرے دشمنوں نے تیرے پیغام کو مسخ کرنے کے لئے اس میں شامل کر دیئے ہیں۔"

ہر شے سے ڈرتے ہوئے اور ہر شے سے اُسی وقت بے خوف دھک دھک کرتے دل کے ساتھ میں نے اپنے بدن پہ غازہ اور پاؤڈر ملا اور مدہوش کن پرفیوم کا چھڑکاؤ کیا۔ پھسلتے ہوئے چست کپڑے پہننے کے بعد میں نے برقعہ اوڑھا اور تارا کے پیچھے چل دی۔ کپڑے تارا نے میرے بدن پہ فٹ کئے تھے یا بدن کو ان میں فٹ کیا تھا دونوں کام اسی کے تھے۔

تارا اور میں تیزی سے میرے کمرے کے عقبی دروازے کی سمت بڑھیں تاریکی نے سیاہ غلاف کی مانند ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ باہر کی ٹھنڈ کو میرے اندر کی گرمی اور بڑھتے ہوئے جوش و خروش نے ہلکا کر دیا، لیکن میں جس جگہ سے بھی گزرتی وہ پرفیوم کی خوشبو کے

گھیرے میں آجاتی ادھر میری جوتی کی اونچی ایڑی ٹِک ٹِک بج رہی تھی۔

تارا کھی کھی کر کے ہنسی "بی بی جی میں تو جہاں چاہوں بنا کوئی نشان چھوڑے نکل جاؤں لیکن آپ کے اس جرم کا اعلان تو بہت ساری چیزیں مسلسل کر رہی ہیں۔"

ہمارے قدم تیز تر ہو گئے۔

مجھے آزادی کی خوشبو آ رہی تھی۔

اس سال سرما بڑا شدید تھا اور لوگ اس سے بچنے کے لئے گھروں میں یوں چھپے ہوئے تھے جیسے بچے بلاؤں سے چھپتے ہیں۔ عورتیں سرد ہواؤں سے بچنے کے لئے اسی طرح ہاتھ پاؤں سمیٹے گھٹڑیاں بنی ہوئی تھیں جیسے وہ مردوں کی دستِ برد سے بچنے کے لئے کیا کرتی ہیں۔ مردوں کے پاس تو جو کچھ بھی تھا وہ انہوں نے پہن یا لپیٹ لیا۔ انہیں باہر کی کوئی اطلاع ملتی بھی تو وہ اسے نظر انداز کر دیتے۔ میں نے نقاب اُلٹ کے آخر کار اپنے زنداں سے باہر گرد و نواح کی چیزوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ بنجر قطعوں سے گزرتے ہوئے جہاں کوئی اِکا دُکا ہی درخت تھے میں اپنے سفر کے مقصد کو جیسے بھول ہی گئی۔ ہم بائیں طرف کو مڑ گئیں جو پہلے سے کہیں زیادہ بنجر اور ویران تھا، پھر مجھے جھونپڑیوں کا ایک بھدا سا مجموعہ دکھائی دیا۔ حویلی سے باہر ہر چیز اسی طرح مفلوک الحال دکھائی دے رہی تھی جیسی میں اندر سے تھی۔

ہم ایک چھوٹے سے گھر کے پاس پہنچے۔ تارا نے پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ کھولا۔ اندر کرسیوں پہ بیٹھے دو آدمی اُچھل ہی پڑے۔ تارا انہیں میرے متعلق بتا چکی تھی۔ برقعہ اترا تو مرد حیرت اور خوف سے گرتے گرتے بچے۔ چھوٹے کسان راجہ جی کو نگاہ بھر دیکھنے کی جرأت کے روادار نہ تھے چہ جائیکہ وہ اس کی ماں سے بے تکلف ہوتے۔ ماضی کا خوف دوہرا اس ایک بار پھر میرے اندر عود آیا، لیکن شراب کے ایک جام نے سب کچھ ہموار کر ڈالا۔

وہ مجھے بی بی سائیں کے لقب سے مخاطب کر رہے تھے اور انہوں نے میرا راز رکھنے کا عہد کیا تھا۔ میرے رخصت لینے تک ہم آپس میں میرے آنجہانی شوہر کے دوستوں کی طرح باتیں کر رہے تھے۔ مزار کی کہانی کے چیتھڑے اُڑا دیئے گئے۔ اس کے بعد اس کے پرخچے ہر اس ہیرو کے گھر کی دہلیز پہ اُڑے جو شہر کی ایک طوائف پیاری کے نام پہ مجھ سے ہم بستر ہو چکا تھا اور اب جانتا تھا کہ پیاری پیر سائیں کی بیوی ہیر تھی جو آج پھر اس کے بستر میں تھی۔

یہی وہ لوگ تھے جن کی پوجا نے پیر کو دیوتا کا رتبہ دے دیا تھا۔ جب میں اپنے آپ کو طوائف کے روپ میں پیش کرتی تو لوگوں کا دھیان بے ساختہ میرے دلال کی طرف چلا جاتا۔ سچائی اور حقائق کو ثابت کرنے کا واحد راستہ یہی تھا کہ اسے اللہ کے پاک ناموں والی چادر کے اندر سے کھینچ کے باہر پھینکا جاتا اور اس کا واحد طریقہ یہی تھا کہ میں خود عریاں ہو جاتی۔ ہر بے حرمتی کے بعد میں اپنے خاوند کی قبر پہ کھڑی ہو جاتی اور اس پہ تھوکتی۔

جاگیر دار تک یہ سرگوشیاں پہنچیں تو اُسے اپنے کانوں پہ اعتبار نہ آیا۔ "یہ تو بالکل ناممکن ہے، میں اس دغاباز سے خود ملنا چاہوں گا اسے یہ کلمۂ کفر بکنے کی قیمت ادا کرنا ہو گی۔" وہ پھنکارا۔

تارا کا خیال تھا کہ اُس سے دور ہی رہیں، لیکن میری اس پردے کو تار تار کر دینے کی خواہش جس نے پیر کی زندگی میں یہ سب کچھ جاگیر دار اور دوسرے لوگوں سے چھپائے رکھا تھا اس کے مشورے پر غالب آ گئی۔

اپنے خاوند کی خوشبو اپنے بدن پر چھڑکتے ہوئے میں نے اپنی رازداں کو کہا "اس دفعہ میں وہ طوائف پیاری نہیں بلکہ ہیر ہوں گی۔ بیگم پیر سائیں اور پیاری دونوں کی شناخت اب ایک ہو جائے گی۔"

میں برقعہ اتار رہی تھی جب موٹا کمرے میں داخل ہوا یادوں سے لرزتے ہوئے میں نے اپنے آپ کو سنبھالا دیا اور پوچھا "سائیں میں آپ کو یاد ہوں؟ اس وقت پیر سائیں میرے کارساز تھے اب میں خود ہی ہوں۔"

سور کو وار عین سینے پہ لگا تھا بل کھائی ہوئی مونچھوں کے نیچے اس کا گائے کی طرح لٹکا ہوا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور آنکھیں پتھرا گئیں۔

میں نے شراب کے جام کے لئے کہا تو بُت جھُرجھُری لیتے ہوئے ہوش میں آیا اور بوتل انڈیلنے لگا۔ پھر اُس نے اچانک قہقہہ لگایا۔

"اب سمجھ آئی تو یہ تم تھیں، شہر کی عورت۔" پھر وہ سنجیدہ ہو گیا "تم یہ کیوں کہہ رہی ہو کہ تم مالک کی بیوی ہو؟ اس جرم پہ تو تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔"

میں نے اُس سے بلند آواز میں قہقہہ لگایا۔ تارا کے سِکھلائے ہوئے طریقے کے مطابق اپنی آنکھیں گھماتے ہوئے میں نے کہا "سائیں میں نے چوبیس طویل سال پیر سائیں کے بستر میں گذارے ہیں۔" وہ غصے سے لال ہو گیا "دوبارہ کہو اور تمہیں گلی میں پھانسی دے دی

جائے گی" میں نے اللہ کی قسم اٹھائی"میں راجہ جی کی ماں ہوں، اپنی عورتوں کو بلاؤ وہ اس کی تصدیق کریں گی۔"

اس کے پھولے ہوئے گال تھرتھرائے۔

"کسی نوکرانی کو بلا کے میری شناخت کروالو، لیکن وہ کوئی وفادار قسم کی ہو ورنہ میرے بیٹے کو خبر ہو گئی تو وہ تمہارے ٹکڑے کروا ڈالے گا۔" میں نے مشورہ دیا۔ میٹھی سی مسکراہٹ کے ساتھ میں چہکی "سائیں میری طرح تم بھی کسی ایسے سکینڈل کو برداشت نہ کر سکو گے جو میرے برقعے کی تہوں سے کسی بلا کی طرح نکلا آیا۔"

اس نے ایک کے بعد دوسرا جام چڑھایا اور پھر اچانک کمرے سے بھاگ نکلا۔

فکر مند تارا نے مجھے خبردار کیا۔

"گھبراؤ مت۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "ہر عظیم مقصد کی راہ میں رکاوٹیں آتی ہی ہیں، اگر مستقبل سے بھاگو گی تو ماضی میں جا گرو گی۔"

تارا سمجھدار تھی۔ وہ میرے لئے طوطی اور کالی کی طرح تھی بلکہ چیل اور تیموری بھی ہم جیسی ہی تھیں۔

میرا شکار ایک بوڑھی ملازمہ کے ساتھ واپس آیا۔ "تم اس عورت کو جانتی ہو؟"

اس نے بلند آواز سے پوچھا جب کہ وہ آنکھیں جھپکتی مجھے دیکھے جا رہی تھی۔

چست قمیص میرے بدن کو چھپانے کے کام کی چیز نہ تھی۔ میرے ایک ہاتھ میں سلگتا ہوا سگریٹ اور دوسرے میں وہسکی کا گلاس تھا جس میں پڑے ہوئے برف کے ٹکڑے آپس میں ٹکرا رہے تھے۔ اس کا ہاتھ اس کے منہ پہ چلا گیا اور آنکھیں حیرت سے ابل آئیں۔

وہ میرے پاؤں پر گر گئی۔ "بی بی جی، پیرزادی!"

میں نے اسے بازو سے پکڑ کے اوپر اٹھایا اور اپنی انگلی سے اس پہ نشانہ لیتے ہوئے کہا "اگر تم نے کسی کو بتایا کہ میں یہاں آئی تھی تو میں تمہاری آنے والی نسلوں کو بھی برباد کر ڈالوں گی۔"

گمی کی بیٹری والی گڑیا کی طرح سر ہلاتے ہوئے اس نے قسم اٹھائی "بی بی جی میں اپنے پیر کی عزت کو اپنی گندی زبان پہ کیسے لا سکتی ہوں؟ کوئی مسکینڑی اللہ کے پیاروں کے بارے میں بھلا بات کر سکتی ہے؟"

موٹے جاگیردار نے اسے باہر جانے کو کہا اور لڑکھڑاتا ہوا کرسی پہ گر گیا۔ اس نے اپنی آواز سرگوشی میں بدل ڈالی "کیا تم واقعی پیر سائیں کی بیگم ہو؟ کیا تم شہر والی پیاری نہیں ہو؟"

میرے برقعے نے جو کچھ چھپایا تھا آج اس پہ عیاں ہو گیا۔ یہ بھی کافی ہوتا اور میں وہاں سے چلی آتی لیکن ابھی مجھے اس سے وہ کام بھی کروانا تھا جسے وہ کفر، بے ادبی اور بے حرمتی کا نام دیتا رہا تھا۔

"اب جب تمہیں پتہ چل گیا ہے کہ میں اس کی بیوی ہوں تو کیا تمہاری میرے بارے میں سوچ بدل گئی ہے؟ اگر یہ تعلق پیر سائیں کی زندگی میں جائز تھا تو اب اسے کون ناجائز قرار دے سکتا ہے؟"

میرے آنجہانی خاوند کا دوست اس وقت تک میری اصل شناخت کو قبول نہ کر سکا جب تک وہ نشے میں دھت ہو کے سب کچھ بھول بھلا نہیں گیا۔ کام ختم ہوا اور میں لوٹ آئی۔

ایک رات میں اور تارا مکئی کے کھیتوں سے گزرتی ایک پٹھان کو ملنے گئیں جو اسمگل شدہ پارچہ جات، چرس اور ہیروئن کا کاروبار کرتا تھا۔ میں تھکی، ٹوٹی اور بے دم حالت میں ایک کھیت میں چھپی ہوئی تھی اور میری دوست پاس کھڑی دیکھ بھال کے مینار کا کام کر رہی تھی۔ میں دنیا کو صرف رات کو ہی دیکھ سکتی ہوں۔ ایسا کیوں ہے؟ وہ وقت کب آئے گا جب میں اسے دن کی روشنی میں دیکھوں گی؟

لیکن میں بے تاب تھی۔

میرے موڈ سے اکتائی ہوئی تارا نے مجھے یاد دلایا "اگر آپ کی کارروائیاں مزے لینے کے لئے نہیں ہیں، تو پھر دن اور رات کے بارے میں فکر اور اندیشوں کی کیا ضرورت ہے، اگر کسی بھوت سے بدلہ لینا ہو تو یہ تو صرف رات کو ہی ممکن ہو سکتا ہے، اگر آپ کے ارادے بدل گئے ہیں تو مجھے بھی بتا دیں، میں تو وہی کروں گی جو آپ کہو گی۔" لیکن میری یہ تمنا کہ میں دور حدِ نگاہ تک دیکھ سکوں انتقام کے جذبے سے کہیں طاقتور تھی۔ تارا مجھے سمجھانے کی کوششیں ترک کرتے ہوئے میرے پاس آ بیٹھی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا "یہ کیسا درد ہے جو ایک پتھر

کو بھی رونے پر مجبور کر دیتا ہے؟" اس کی انا نے راہ دے دی تھی۔ سپر ڈالتے ہوئے وہ تڑے مڑے کاغذ کی طرح اکٹھی ہو گئی۔

اپنا چہرہ مجھ سے پرے کرتے ہوئے اس نے اپنی آہوں کو روکنے کی کوشش کی۔

"بی بی جی آپ نے میرے متعلق جو کچھ سُنا یہ کہانی اس سے بہت پہلے کی ہے۔" اس نے کہا ادھر میرے دل میں یہ ایقان جاگا کہ ہم دونوں ایک ہی بھوت سے انتقام لے رہی تھیں۔

میں نے اصرار کیا کہ وہ اپنی کہانی سنائے۔ کچھ کہنے سے پہلے وہ زار و قطار روتی رہی اور پھر جب سنبھلی تو اس نے اپنے دل کی بلاؤں کے بارے میں بتانا شروع کیا۔

"میں چھ سال کی عمر میں ہی یتیم ہو گئی تھی۔" وہ مسلسل رو رہی تھی "میرا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ کوئی مجھے درگاہ پہ چھوڑ گیا، کوئی دوسرا مجھے حویلی میں لے آیا۔ پیر سائیں نے میرا بازو پکڑا اور مجھے حجرے میں لے گیا۔" مجھے اس کی کھوئی کھوئی اُن آنکھوں کی یاد آئی جو میرے کمرے کی کہانی کو تازہ کر رہی تھیں۔

میں نے تارا کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے آگے میں سب کچھ جانتی تھی۔ مجھے ایک اور ویسی ہی کہانی نہیں سننا تھی۔

اس نے زور لگا کر میری ہتھیلی منہ سے ہٹائی اور چیخی "سنو! مجھے بولنے دو، مجھے کچھ کہنے دو...... تمہارے خاوند نے مجھے تھپڑ مارا۔ میں چلائی، اُس نے کوئی چیتھڑا میرے منہ میں پھنسا کے مجھے فرش پہ گرا دیا۔ اُس کا بھاری بوجھ مجھے کچلے دے رہا تھا۔ اُس کے سینے کے بال میرے منہ میں پڑ رہے تھے اور میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں اُس کے نیچے سے نکلنے کی کوشش میں تھی...... چیخنے کے لئے کوشش کر رہی تھی۔ اس نے میرے سر پہ مکے مارے، میرے کان مروڑے، دونوں کہنیوں سے میری پے در پے ٹھکائی کی...... اور یوں لگ رہا تھا جیسے میری پوری زندگی گزر گئی تھی۔ وہ اچانک چھلانگ مارتا کھڑا ہو گیا۔ ایک دیو میرے اوپر کھڑا تھا۔ اس کا پاؤں میرے چہرے کو بری طرح کچل رہا تھا۔ اس کے الفاظ میرے کانوں میں سوراخ کر رہے تھے۔ وہ میرے ذہن پہ نقش ہو گئے "اگر میں نے دوبارہ تم سے ایک لفظ بھی سنا تو زندہ کھال اتار دوں گا' اگر مجھے پتہ چلا کہ تم نے کسی سے کوئی بات کی ہے تو میں خنجر سے تمہارے ٹکڑے کر کے تمہیں ہانڈی میں بھون ڈالوں گا۔" اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کے اوپر اٹھا لیا اور میں ہوا میں لٹکنے لگی۔ دوسرے ہاتھ سے اُس نے میرا گلا دبایا تو میرے منہ سے بے ربط باتیں اور تھوک گرنے لگی اور میں بے دم ہو گئی۔ پھر مجھے اس کی گرجدار آواز سنائی دی "نکل جاؤ، نکل جاؤ، دفع ہو جاؤ۔" اور میں جان بچانے کی خاطر بھاگ نکلی۔

کسی بوڑھے مزدور نے مجھے جھاڑیوں میں چھپے ہوئے دیکھ لیا اور وہ مجھے اپنی بیوی کے پاس اپنے گھر لے آیا۔ میں اتنی خوف زدہ تھی کہ میری زبان بند ہو گئی۔ میں بہت سالوں تک یوں ہی رہی حتیٰ کہ مجھے ایک مرد ملا جسے ملتے ہی میں نے کہہ دیا "مجھے تم سے محبت ہے۔"

میرا دل پیر کے خلاف مزید نفرت سے بھر گیا میں نے اسے پوچھا "تم تو اتنی خوبصورت اور حسین عورت بن گئیں پیر تمہارے پیچھے کیوں نہ پڑا؟"

اس نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا، میرا خیال ہے اس کی پہلی ناکامی اس کا سبب بنی، میں ناکامی کا نشان جو بن گئی تھی۔"

تارا اور میں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کے اس وقت تک روتی رہیں جب تک ہمارے آنسو خشک نہ ہو گئے، پھر ہم خاموشی کے ساتھ دل ہی دل میں آستانے کو تباہ کرنے کے عہد و پیمان کو تازہ کرنے پٹھان کے گھر کی طرف روانہ ہو گئیں۔

پٹھان بڑی تیز اور کار آمد دکھائی دیتی رائفل سے یوں مسلح تھا جیسے میں اپنا پرس اٹھائے ہوئے تھی۔ میں نے بیچنے کے لئے اسے بڑی نایاب چیزیں دکھائیں قیمت طے کرنے کے لئے وہ سودابازی پہ اتر آیا۔ میں نے اُسے پیر سائیں کی وڈیو فلموں کی کاپیاں بیچی تھیں۔ وہ سچائی کو ایسی تیزی سے پھیلا دیتیں جیسے جراثیم کسی مہلک بیماری کو پھیلاتے ہیں۔

اس رات جوں ہی تارا اور میں عقبی دروازے سے حویلی میں داخل ہوئیں کسی عورت کی دور سے آتی چیخ و پکار نے فضا کو چاک کر ڈالا۔ جانیں بچانے کے لئے ہم دونوں خواب گاہ کی طرف لپکیں۔ باقی سب لوگ صحن کی طرف بھاگ رہے تھے۔

سب ہی چلا رہے تھے یہ کون ہے؟ یہ کون اتنے درد کے ساتھ چلا رہی ہے؟

تارا اور میں پردۂ دیوار کی طرف یلغار کرتے ہجوم میں شامل ہو گئیں۔ چیخیں اور قریب اور مزید خوفناک ہوتی گئیں، اگرچہ وہ زمین کا کلیجہ پھاڑے دے رہی تھیں، لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی بھی دکھ اور صدمے کا پورا اظہار کرنے سے قاصر تھیں۔ تمام نگاہیں اینٹوں سے بنی دیوار پہ اٹکی ہوئی تھیں۔ اس کے عقب سے زمین پہ گھسٹتے ہوئے بیوہ ظاہر ہوئی اس کے گھٹنوں سے خون رس رہا تھا۔

ہمیں دیکھتے ہی اس نے اپنے بال نوچ ڈالے اور چھاتی پیٹتے ہوئے پوری آواز سے چلا اُٹھی۔ دائی نے آگے بڑھ کے اس کے ایک ایسا تھپڑ جڑا کہ اس کا پیشاب خطا ہو گیا۔ دائی کے دوسرے تھپڑ سے وہ ہوش میں آ گئی۔

وہ نا قابلِ ضبط انداز میں ہائے ہائے کر رہی تھی۔ ناامیدی کی چیخوں اور دم گھٹنے کے وقفوں کے درمیان اس کے منہ سے درد بھرے فقرے نکلتے رہے۔ ”ریچھ میرے تعاقب میں کھیتوں کے اندر چلا آیا۔ اُس نے بے ہوشی کی دوا میں ڈوبے چیتھڑے میری بیٹیوں کی ناک پہ رکھے اور انہیں ایک بوری میں بھر لیا۔“

اُس سے دکھ اور درد برداشت نہ ہو رہا تھا۔ وہ اسے چھپائے رکھنے سے بھی قاصر تھی اور اس کے بھرپور اظہار سے بھی۔ یہ بے بسی ایک ہی راستہ دکھا رہی تھی۔ وہ اپنا سر بار بار فرش پہ پٹکنے لگی یہاں تک کہ وہ نیلا ہو گیا۔

”ہمیں بتاؤ اس کے بعد کیا ہوا؟“ بولو بتاؤ کیا ہوا؟ سب ہی جاننا چاہتے تھے۔ وہ بول نہ سکی۔ اس کے الفاظ ہچکیوں اور سسکیوں کی نذر ہو کے رہ گئے۔ ہم سب کوشش میں تھے کہ اس کے بے ربط الفاظ اور حرکتوں کا مطلب نکال سکیں۔ ریچھ نے اس کی بیٹیوں کو اپنی گدھا گاڑی پہ ڈالا۔ اس نے بوری چھیننے اور گرانے کی کوشش کی تو اُس نے اُس کے گھٹنوں کی نسیں کاٹ ڈالیں۔ اب وہ اس قابل نہ رہی تھی کہ اس کا تعاقب کر سکتی۔

بیوہ اپنے ساتھ ہمدردی کرنے والوں کو جھاڑ رہی تھی ”جاؤ، چلے جاؤ، مجھے اکیلا چھوڑ دو، مجھے تنہا رہنے دو کوئی میری مدد نہیں کر سکتا۔“ وہ بین کرتی رہی۔

دائی نے اس کا ہاتھ جھنجوڑا۔ ”اپنے آپ پر قابو پاؤ ورنہ اس قدر شور مچانے پہ راجہ جی تمہیں قتل کر ڈالے گا۔“ اب وہ آہستگی سے چلائی ”دائی نے بے کار شیطان کی منتیں کیں۔ میں گدھوں کے پیچھے زمین پہ رینگتی رہی۔ ایک جانور نے دوسرے کو ٹانگیں ماریں اور وہ ڈُلکی لگ کے ایک موڑ مڑتے ہوئے میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ہائے میری بچیاں ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئیں، وہ چلی گئیں۔ میں انہیں اب کہاں دیکھ سکوں گی۔

کبھی نہیں...... “وہ ناامیدی کے عالم میں کراہ رہی تھی۔ یہ سچ تھا۔

اس روز کے بعد وہ ہر صبح زمین پہ گھسٹتی ہوئی کھیتوں تک جا کے سارا دن اپنی بیٹیوں کا انتظار کرتی اور پھر شام کو اسی طرح گھسٹتی ہوئی حویلی میں لوٹ آتی۔ ہر روز آگے پیچھے اب

اس کی زندگی میں اس کے علاوہ اور کچھ نہ رہا تھا۔ نوکرانیوں نے اسے ماتمی بیوہ کہنا شروع کر دیا۔ راجہ جی نے اسے بیرونی احاطے کی ایک شکستہ کوٹھڑی میں منتقل کرنے کا حکم دیا۔ میں ان واقعات پر افسردہ اور دل شکستہ تھی جو نہ تو کبھی سبق آموز ثابت ہوئے اور نہ ہی کسی بہتری کا باعث بنے۔ میرا خون اُمڈ اُمڈ آتا۔ لوگوں کے مسائل کے حل اور نقصانات کی تلافی کرنے کی میری بڑھتی ہوئی آرزوئیں اس کا دباؤ بڑھا رہی تھیں۔

خاتمے کا آغاز ہو چکا تھا۔

ابھی بیر کی پہلی برسی بھی نہ آئی تھی کہ راجہ جی کے دو چمگادڑوں کے شکار کی تلاش میں سرگرداں ہونے کی خبر ملی۔

وہ نشے کے عالم میں لڑکھڑاتا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا اس کے نتھنوں سے دھواں نکل رہا تھا ”اس گھر کی کسی عورت پہ آج تک کسی نے وہ انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کی جو میری ماں پہ اٹھی ہوئی ہے۔“ میں نے ایسے کسی معاملے سے لاعلمی کا اعلان کرتے ہوئے اس ظالمانہ افواہ پہ اپنے صدمے کا اظہار کیا۔ وہ مجھ پہ یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔

وہ گرج رہا تھا ”میں اس کی پوری تفتیش کرواؤں گا جو بہت سے لوگوں کو تباہ کر ڈالے گی۔ میں سچائی تک پہنچنے کے لئے جس کی ضرورت پڑی قتل کروا دوں گا۔“

میں نے سنبھلتے ہوئے اپنے بیٹے کو اپنے پاس بیٹھنے کو کہا تاکہ اس پہ دباؤ ڈال سکوں۔ جب میں نے اُسے اس کے باپ کے گناہوں کی کہانی سنائی تو وہ لرز اُٹھا۔

”اپنے باپ کے ہاتھوں میری بے حرمتی کی حدود کے بارے میں جان لینے کے بعد اب تمہیں کتنی غیرت اور شرم محسوس ہو رہی ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ہم دونوں ایک ہی دکھ و درد کا شکار تھے صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہ اسے دبا دینے کی کوشش میں تھا اور میں سارے کے سارے کو اُگل دینا چاہتی تھی۔

”مجھے بتاؤ کیا تم لوگوں کو یہ کہتی رہی ہو کہ تم میری ماں ہو؟“ اس نے دوٹوک پوچھا میں نے اسے بتایا کہ میری جو کچھ بھی شہرت تھی میرا اس میں کوئی ہاتھ نہ تھا۔ میں نے اپنے تازہ افعال سے اسی طرح انکار کر دیا جیسے میرا خاوند اپنے اعمال کو چھپا لیا کرتا تھا۔

”وہ ماضی کے تذکرے کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ حویلی کے اندر ہوتا رہا تھا۔ بہت سے لوگوں کو بہت سی چیزوں کے بارے میں علم یا شکوک تھے۔ میری کیا جرأت تھی کہ

قدم باہر نکالتی۔ حویلی مخبروں سے بھری پڑی ہے اس عالم میں میں ایک خوفناک عمل کو راز میں کیسے رکھ سکتی تھی؟ مجھ پہ یقین کرو، بھروسہ کرو، میں تمہاری ماں ہوں، میں سچ کہہ رہی ہوں۔" میرا انکار شاید اس کے لئے باعث سکون ہوا ہو لیکن میری شرمناک کہانی نے اُسے توڑ پھوڑ دیا تھا۔

مہارانی کا خاوند قتل ہو گیا تو میرے دل میں کسی نے کہا کہ اس کے مقدر کے اس موڑ میں راجہ جی کا ہاتھ تھا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اس کے سر میں گولی میں نے مروائی تھی۔

راجہ جی سرخ اور سوجے ہوئے چہرے اور ابلتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اس قتل کے بجائے افواہوں سے پریشان تھا۔

اس کے الزامات ایک دوسرے پہ لڑھکتے چلے آ رہے تھے۔ "میرے باپ کی آستین کا سانپ تم ہی تھیں، اگر تم نے دوبارہ اس کی نیک نامی کو دھبہ لگانے کی کوشش کی تو میں تمہیں عبرت کی مثال بنا دوں گا۔"

"میں مہارانی سے نکاح کر رہا ہوں" جب اُس نے یہ اعلان کیا تو میں چلّا اٹھی "تم ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ تمہاری بہن ہے۔"

اس نے اپنے باپ کی طرح دانت پیستے ہوئے کہا" تمہیں میری زندگی میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ میں کسی مرد سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہا، صرف اس لئے کہ میری ماں ایک کنجری ہے۔ اس خوف سے کہ جسے میں دیکھ رہا ہوں کہیں وہ میری ماں کا یار تو نہیں میری نگاہیں نیچی ہو گئی ہیں۔"

اس نے مجھے باورچی خانے میں اپنے پرانے فرائض سنبھالنے کو کہا، دروازہ دھڑام سے بند کیا اور مجھے غصے اور خوف سے کانپتے اور لرزتے چھوڑ کے نکل گیا۔

اس روز کے بعد سے فضا اس کے باپ کی خوشبو کی طرح اب اس کی گالیوں سے بھری رہنے لگی یہاں تک کہ اُس نے اپنے باپ کا ورثہ پوری طرح سنبھال لیا۔ میں یہ جان کے سُن ہو گئی کہ راجہ جی نے اپنے باپ کے ناقابلِ معافی جرائم کو بھلا دیا تھا۔ اس کے ذہن میں صرف میرے گناہ ہی رہ گئے تھے۔ اس نے میرے ساتھ کسی بدنام نوکرانی کی طرح کا سلوک روا رکھنا شروع کر دیا۔ میں خوفزدہ تھی کہ اگر وہ مجھے سرِعام گالیاں دے سکتا تھا تو اس کے لئے مجھے کھجی کی چھڑیوں سے مارنا بھی عین ممکن تھا۔ اس کا غیظ و غضب اس گہرے زخم

کے باعث تھا جو کبھی مندمل نہ ہوا۔

مسجد کے لاؤڈ سپیکر میرے خاوند کی پہلی برسی پہ اس کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے اس کی کرامتوں کے تذکروں کو اچھال رہے تھے۔ یہ میری برداشت سے باہر تھا کہ میں اس کے سکون اور آرام کے لئے دعاؤں میں شامل ہوتی لہٰذا علالت کا اعلان کر کے میں نے خواب گاہ کا دروازہ بند کیا اور سکون آور گولیاں کھا کے گہری نیند سو گئی۔

باب ۱۳

بُت شکن

تارا کو نئے کپڑوں کے لیے ناپ دینے کے بہانے اس کے ساتھ کمرے میں بند میں ایک اور بحران کا سامنا کر رہی تھی۔ پٹھان نے اسے بتایا کہ فلم میں صرف میں ہی میں تھی پیر سائیں تو کہیں بھی دکھائی نہ دیا تھا۔

تارا نے مجھے مشورہ دیا "صرف آپ ہی اُسے ان فلموں کی تقسیم سے روک سکتی ہیں۔ پیر سائیں تو ان سب میں صرف ایک سائے کی صورت ہی منڈلاتا نظر آتا ہے۔ فلم تو آپ ہی کے خلاف ثبوت بن گئی ہے۔"

میں نے اُسے پٹھان کے ساتھ ایک اور ملاقات کا بندوبست کرنے کو کہا۔ "اسے کل پہ رکھنا اور آدھی رات کو آجانا، تمہیں اتنی دیر گئے یہاں اندر آنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔ میں یہاں سے اکیلی ہی نکلنے کی کوشش کروں گی۔ عقبی دروازے کے دوسری طرف میرا انتظار کرنا۔"

آئینہ ایک تنے ہوئے کھردرے چہرے کی گواہی دے رہا تھا۔ ایسی شکل مجھے کبھی اچھی نہ لگی تھی۔ میں نے اُسے غازے اور پاؤڈر سے ملائم اور گورا کر دیا۔ شکنیں پاؤڈر کی تہہ میں دراڑوں کی صورت نمودار ہو رہی تھیں۔ سرخ لپ اسٹک میرے ہونٹوں سے خون کی صورت رس رہی تھی اور سیاہ کاجل میری آنکھوں کے آرپار پھیل رہا تھا۔ ایک پاگل پیرنی مجھے گھور رہی تھی۔ میں ناٹک کے اس ٹکڑے کو دیکھے جا رہی تھی۔ لیکن کیا یہ میں ہی تھی؟ آئینے کی عورت نے ضلع بھر کو اپنے پیچھے لگا لیا تھا۔ طوائف پیاری نے وہ کچھ کر ڈالا تھا جو پاکیزہ ہیر کے تصور سے بھی باہر تھا۔ پیروں کے آواگون کی آگ میں جلتے ہوئے میں اپنے چاروں طرف بھاگ رہی تھی تاکہ میرے قریب وجوار کی ہر چیز جل کے راکھ ہو جائے۔ خدا اور شیطان، حق اور باطل، سیاہ اور سفید میری زندگی اور میرے ذہن میں ایک جنجال بن گئے تھے۔ ایک دوسرے میں الجھے اور پھنسے ہوئے۔

ہمیشہ کی طرح میں نے خواب گاہ کو اندر سے اور باتھ روم کو باہر سے چٹخنی چڑھا دی۔ پھر تیزی سے عقبی دروازے کی طرف بڑھی۔ اسے لکڑی کے تختے لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔ کیل

ٹھک گئے تھے۔

میں پھنس گئی تھی اور لوٹ آئی۔

میں نے پاگلوں کی طرح اپنے چہرے سے پاؤڈر اور غازہ کھرچ ڈالا۔ وہ سب مجھے نشانہ بنا رہے تھے۔ پیر کو کسی نے الزام نہیں دیا۔ ہر کوئی میرے حال کی باتیں کر رہا تھا میرے اس ماضی کا کوئی تذکرہ نہ تھا جسے اُس نے برباد کیا تھا۔ وڈیو فلم کی طرح ان چرچوں میں وہ کہیں بھی نہ تھا۔ ذلت میری سوچوں کے برعکس آستانے پہ نہیں بلکہ مجھ ہی پہ نازل ہو رہی تھی۔

میرے بیٹے نے دلہن کا جوڑا تیار کرنے کا فریضہ حسب روایت مجھے سونپنے کے بجائے اپنی پھوپھی کو دے دیا تو میری اس تذلیل کے بارے میں بہت چہ میگوئیاں ہوئیں۔

اس کے بجائے وہ مجھ پہ چلایا "تم اس قابل نہیں ہو کہ ہمارے درمیان رہ سکو۔ میری بیوی کو تمہارے اثر سے باہر رہنا ہوگا۔"

میں نے بڑے آرام سے اس سے پوچھا "تم ان گناہوں کو کیسے بھول رہے ہو جو تمہارے باپ نے مجھ سے کروائے؟ میرے گناہ اس کے گناہوں سے بھاری کیونکر ہو گئے؟ کیا وہ ان گناہوں سے بھی بھاری ہیں جن میں اب تم ملوث ہو رہے ہو؟"

"تم میرے باپ کے بارے میں جھوٹ بکتی ہو۔" وہ جواباً چیخا "تم کچھ بھی کر سکتی ہو۔ تمہارے لئے اپنے بچوں کی چمڑی کے جوتے بنانا کچھ مشکل نہیں۔"

اُس کے الفاظ مجھے دُکھ پہنچا رہے تھے' لیکن اس کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ بھونک رہا تھا۔ میں نے اسے آواز نیچی رکھنے کو کہا، "میں نے کچھ نہیں کیا، ماضی کی افواہیں ہی آج کا موضوع بنی ہوئی ہیں۔ میں حویلی سے باہر نکلنے کی جرأت کیسے کر سکتی ہوں؟ یہاں کی عورتوں کو میرے حویلی سے غیر حاضر ہونے کی خبر کیوں نہیں؟"

اُس نے اپنے پاؤں فرش پہ پٹخے، ٹیبل کو ٹھڈا مارا اور مٹھیاں بھینچتا میری طرف لپکا۔ "جھوٹی تم یہ جرأت رکھتی ہو۔ تم کسی گرم کتیا کی طرح اس عقبی دروازے سے نکل کے جاتی رہی ہو جو صرف میرے باپ کے لئے مختص تھا۔ تم نے مجھے جاگیردار کے سامنے ذلیل کیا۔ تم ہر دروازے پہ جا کے انہیں بتاتی رہی ہو کہ تم درگاہ کی عزت، حویلی کی بیگم ہیر ہو۔"

میں بھونچکی رہ گئی وہ سب کچھ جانتا تھا لیکن اس کے باوجود میں اس سے بھی بلند آواز میں چلائی "لیکن میں نے تمہیں بتایا تھا کہ جاگیردار مجھے تمہارے باپ کی موت سے پہلے کا جانتا

ہے۔ جاؤ اس سے پوچھو۔ جس عورت کو تم گالیاں دے رہے ہو وہ اپنی ماں کی گود میں نہیں یہیں تمہاری درگاہ میں پیدا ہوئی تھی۔ میں نے اپنے فرائض سے بڑھ کر تمہارے باپ کو خوش رکھنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے یہاں کسی کا کوئی قرض ادا نہیں کرنا۔"

وہ نہ صرف اس سکینڈل میں اپنے باپ کا کردار تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا بلکہ وہ میرے ذہن کے اس امر کے احساس کو بھی مٹا دینے پہ تلا ہوا تھا۔

تارا کو حویلی کے صدر دروازے پہ روک دیا گیا۔

مجھے صدمہ ہوا لیکن مصروفیات بہت زیادہ تھیں۔

ہر کوئی جانتا تھا کہ راجہ جی کو اس شادی کے بارے میں پیر سائیں کی دعا حاصل نہ تھی لیکن اب اُس کے اعمال کا احتساب کون کرتا۔ شاید میری ہی طرح لیکن انجام میں وہ بھی تقدس کے اس نام نہاد حلقے کو توڑ رہا تھا، شاید راجہ جی کا ایک محرم سے نکاح ہی سچائی کے پھیلنے کا سبب بن جاتا، شاید اس کا یہ فعل ہی لوگوں کی زبانوں کا رخ میری طرف سے موڑ کر آستانے کی طرف کر دیتا۔ راجہ جی کا گناہ قبروں کی لمبی قطار کے دائمی سکوت کو درہم برہم کر سکتا تھا۔

گُھی اور اس کی بہنیں اپنے بھائی کی شادی کے لئے آئیں تو ہمارے درمیان تناؤ کی سی کیفیت رہی۔

گُھی نے کہا "اماں میری نندیں تمہارے متعلق بہت بری بری باتیں کرتی ہیں۔ وہ ایسی باتیں کرتی ہیں کہ شرم سے ڈوب جاتی رہوں ہمارے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے اسے جواب نہیں دیا۔

دیا اور منی بھی اذیت میں تھیں۔ "تمہارا دفاع کرنے پر ہمارے خاوند ہمیں پیٹنے پر اتر آتے ہیں۔ اماں ایسا کیوں ہو رہا ہے؟" میرا دل پگھلنے کو تھا لیکن میں نے اسے کڑا کرتے ہوئے رکھائی سے انہیں کہا "اپنے جیون سے واسطہ رکھو، تم پہ تو کچھ گذری ہی نہیں اور پھر بھی تم بھیڑوں کی طرح منمناتی ہو۔ تم ایک ایسی عورت کی بیٹیاں ہو جو اپنے خاوند کے بچھائے ہوئے کانٹوں پر زندگی بسر کر رہی ہے۔ میرے پاس کوئی دوسری راہ نہیں۔ ان افواہوں کو کوئی نہیں روک سکتا، میں بھی نہیں۔"

گُھی نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا اور پھر اپنی بہنوں کو تفصیل بتائی۔ ان دونوں نے بھی سر ہلائے لیکن میں جانتی تھی کسی کو کچھ سمجھ نہ آئی ہو گی۔

ماں اور بہنیں پہنچ گئیں۔

میرے کمرے کی تنہائی میں ماں نے روتے روتے اپنی چھاتی پیٹ ڈالی۔ "میری بچی تم نے یہ اپنے آپ سے کیا کر لیا ہے؟ تم نے ہم سے کیا کر ڈالا؟ تمہارا خاوند زندہ تھا تو اس کے مرتبے کے سائے ہمارے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے کافی تھے لیکن ہم ان اذیتوں کو خاموشی سے سہتے رہے۔ اب تم اس کی غلاظتیں ہم پہ پھینک رہی ہو۔ تم دیکھتی نہیں ہو میں نے باقی بچوں کو تمہاری زندگی کے خطرناک سایوں سے کیسے دور رکھا؟ اب تم نے اپنا سارا گند یکبارگی ہمارے درمیان لا پھینکا ہے۔"

اگرچہ بھائی نے ان گلی کوچوں میں پھیلی شرمناک کہانیوں کا تذکرہ نہیں کیا جہاں میرا بچپن گذرا تھا لیکن مجھ سے ملتے ہوئے وہ اسی ذہنی تناؤ کا شکار تھا جو میری بہنوں اور بیٹیوں کے چہروں پہ مجھے نظر آیا تھا باقی سب کی طرح بھائی بھی میری دشواریوں اور مصائب کو سمجھنے پہ تیار نظر نہیں آ رہا تھا۔ ماں کی طرح وہ بھی سمجھتا تھا کہ پیر سائیں کی موت کے بعد اس کے شیطانی اعمال کا تذکرہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔

تخی بی بی بھی آن پہنچی۔

اس آتشزدگی کے بعد جس نے اُس کی زندگی تباہ و برباد کر ڈالی تھی وہ پہلی دفعہ حویلی میں آئی تھیں، اگرچہ وہ اس کا ذکر نہیں کر رہی تھی لیکن اس کی جلی ہوئی کھال نے اس کے چہرے، ہاتھوں اور پاؤں پہ بڑے گہرے انمٹ اور تیز نقوش چھوڑے تھے۔ میں نے تصور ہی تصور میں آگ کی یہی چھاپ اور ٹھپہ اس کے باقی پورے بدن پہ بھی محسوس کیا۔ میرے لئے وہ پہلے کی طرح گرمجوشی نہ تھی بلکہ اس کے لہجے میں مخالفت اور ناراضگی کا شائبہ تھا۔

"میں نے تمہارے بارے میں بہت سی کہانیاں سنی ہیں۔ تم اپنا بڑھاپا اللہ کے حضور جھکتے ہوئے ایک ظالم خاوند سے نجات کے شکرانے ادا کرتے بسر کر سکتی تھی لیکن اس کے بجائے لوگ تمہیں ایک بری اور داغدار شہرت والی عورت کے نام سے یاد کر رہے ہیں۔"

میں نے ناراض ہوتے ہوئے اسے اپنے کام سے کام رکھنے اور مجھ سے دور رہنے کو کہا۔

لیکن اس نے موضوع گفتگو بدل لیا۔ "مہارانی کے خاوند کو راجہ جی کے ٹھگوں نے قتل کیا۔ وڈی ملکانی اپنے دل میں چھپے شرمناک راز کو اپنے خاوند کو راجہ جی کو کیسے بتا سکتی

ہے۔ یہ بے غیرتی ان کے لئے اجتماعی خودکشی کے علاوہ کوئی راستہ نہ چھوڑے گی، لیکن میرا فرض ہے کہ اس شادی کو روکوں اور تمہیں اس سلسلے میں میری مدد کرنا ہوگی۔ آج میں اس لئے یہاں آئی ہوں۔"

میں نے اسے بڑے پرسکون لہجے میں بتایا "میرا بیٹا شیطانی زنجیر کی ایک کڑی ہے۔ تم اس سے اللہ کے قوانین کی پابندی اور احترام کی توقع کیوں رکھتی ہو؟ یہاں اسلام کے کون سے قانون پہ عمل ہو رہا ہے جو اس پابندی کو توڑا نہ جا سکے؟ یہ واحد اور پہلا گناہ ہوگا نہ ہی بدترین، تقدس کی اس داستان کے چیتھڑے ہونے دو، غلاظت کو پھیلنے دو۔"

اُسے میری بات غیر مدلل نظر آئی اور اُس نے کہا "اس جرم کی اجازت دینے پر اللہ کا عذاب تم ہی پر نازل ہوگا۔"

میں نے اپنا سر دائیں سے بائیں ہلایا۔

"نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ اس کا عذاب صرف اس صورت میں مجھ پر نازل ہوگا اگر میں نے شیطنیت کو اس کھلم کھلا مظاہرے سے باز رکھا۔ جب تک یہ نظام ننگا اور ظاہر نہیں ہوگا لوگوں کو یہ علم کیسے ہوگا کہ یہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ جب وہ اسے جان لیں گے تو پھر وہ کسی کے کہے بنا خود اپنے ہاتھوں سے ہی اسے اکھاڑ پھینکیں گے۔ وہ یقیناً ایسا کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ میں نے اپنے طرزِ عمل کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے اس کا دل اپنی طرف سے صاف کرنے کی کوشش کی "تم دیکھ نہیں رہی ہو میں کیا کر رہی ہوں؟ غلاظت اس لئے عیاں ہوئی ہے کہ میں نے اپنا برقعہ اتار پھینکا ہے۔ سچائی کو بے نقاب کرنے کے لئے مجھے اپنا بدن عریاں کرنا پڑا۔"

سخی بی بی غیر یقینی کی کیفیت میں ڈوبی ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہی تھی۔ "لیکن تم تو اللہ کی حدود کو پار کر گئیں۔ اس کے نام پہ گناہ کو روا رکھنا تو وہی شیطانی راستہ ہوا۔"

میں کھڑی ہو کر چل دی۔

اس کے پاس وہی گھسے پٹے دلائل تھے جو دوسروں کے پاس تھے۔

میرے نزدیک برائی کو چھپاتے ہوئے اپنی شہرت اور عزت کا تحفظ کرنے کا مطلب برائی کی خدمت کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ عریاں نہ ہونے کا ایک ہی نتیجہ ہوتا کہ چیزیں جوں کی توں رہتیں اس کے معنی یہی ہوتے کہ کچھ نہیں بدلے گا۔ میں جانتی تھی کہ میں صحیح

کام کے لئے غلط ذرائع استعمال کر رہی تھی۔ سچ بہرحال جوش کھا رہا تھا۔ وہ لاوے کی طرح دیوانوں کی قبروں سے نکلنے کو تھا۔

پورے جہاں نے راجہ جی کے گناہ کبیرہ کی تقریب میں حصہ لیا، اگر کسی نے محرم سے مباشرت کا ذکر کیا بھی تو دوسروں نے کپڑوں پہ پڑی خاک کی طرح اسے اپنے دل و دماغ سے جھاڑ دیا۔

"اگر یہ سچ ہوتا تو پھر یہ شادی کبھی نہ ہوتی۔ یقیناً راجہ جی کو اس کی خبر ہوگی۔" لوگوں نے یہ کہتے ہوئے افواہ کو گویا دفن کر دیا۔

مہارانی گھر کی بیگم بن گئی تو میں اپنے بیٹے کے حق اور مخالفت دونوں میں زار و قطار روئی۔ دلہن کو مجھ سے دور رہنے کو کہا گیا۔ میں اس تذلیل کو بھی یہ سوچتے ہوئے پی گئی کہ مہارانی بھی بہرحال اس زنجیر کی ایک کڑی تھی جس نے بالآخر اس مقدس داستان کا گلا گھونٹا تھا۔

تارا علیل تھی۔

یہ اطلاع میرے ذہن کو چوکور پنجرے میں لے آئی۔ خوف کے پرانے احساسات کو جھٹکتے ہوئے میں نے ایک بااعتماد نوکرانی کے ذریعے اسے کئی پیغام بھجوائے، لیکن یہی پتہ چلا کہ وہ اس قابل نہ تھی کہ جواب دے سکتی۔ میرے جوش اور جذبے ماند پڑ گئے۔ اپنے خاوند سے انتقام لینے کی میری خواہش حمل کے پہلے مہینے میں اچار کھانے کی زبردست خواہش کی طرح اچانک غائب ہو گئی۔

تارا کی غیر حاضری نے مجھے مفلوج کر دیا۔

مسکن ادویات لئے میں پورا پورا دن سوئی رہتی اور جب آنکھ کھلتی تو میں کچھ اور لے لیتی تاکہ جو وقت بچ گیا تھا اس کے عذاب سے محفوظ رہ سکوں۔

اُمڈتی ہوئی نفرت نے مجھے جنگلی جانور بنا دیا تھا۔ کسی زخمی پرندے کی طرح میں بنا سمت اڑ گئی تھی لیکن ایسی پرواز کو جاری رکھنا مشکل تھا۔ راجہ جی نے مجھے زمین پہ گرا دیا تھا۔

پیر سائیں، لڑکیوں اور ہیروز، ماں بھائی اور اپنی بیٹیوں، چھوٹے سائیں، نوکرانیوں، چیل اور تیمور کی یہاں تک کہ سخی بی بی اور جاگیردار تک کی یادیں میرے ذہن میں دھماکوں کی طرح آ جا رہی تھیں کہ اچانک راجہ جی آندھی کی طرح میرے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے تارا کی، بااعتماد نوکرانی کو دھکا دے کر میرے قدموں میں لا پھینکا۔

راجہ جی نے اپنے باپ کی جگہ لے لی تھی۔

ستواں اور کسی درخت کی طرح لمبا اور اسی کے سے ابرووں کو الگ کرتی غصے کی وہی گہری شکنیں۔ اس کی آنکھوں میں اسی جیسی عجیب سی روشنی کی چمک تھی۔ سر اٹھائے بنا وہ اوپر دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ہونٹ ایک سیدھی پتلی سی لائن پہ مشتمل تھے۔ اس کا باقی چہرہ سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں وہی تسبیح ہوتی تھی۔ اس کی آواز سے میں چونک اٹھتی اور ماضی کی یادوں سے نکل کے حال میں داخل ہو جاتی، اُس کے پاس اپنے بیٹے کے پاس۔

”میں اس جگہ کے سیاہ و سفید کا مالک ہوں۔ کسی عورت خصوصاً میری ماں کو یہ گمان نہیں ہونا چاہئے کہ کوئی چیز مجھ سے چھپی رہ سکتی ہے۔“ اس نے خوف زدہ نوکرانی کو ٹھڈا مارتے ہوئے کہا۔

رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پہ میں نے رحم کی بھیک مانگی ”تمہارے باپ نے میری زندگی تباہ کر ڈالی تھی۔ اُس نے ہم سب کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ پرانی افواہیں ہیں لوگ ماضی کی باتیں کر رہے ہیں۔“

میں اس کے پاؤں پر گر گئی۔

اس نے مجھے پرے بھی نہ ہٹایا۔

”میرے باپ نے تمہیں ننگا کر کے گاؤں کی گلیوں میں گھماتے ہوئے کبھی میری ماں کے طور پر متعارف نہیں کروایا تھا۔ اسے جو بھی علت تھی اس نے اُسے ہم سے دور ہی رکھا۔ اُس نے اپنی کوئی غلاظت اپنے وارثوں پہ نہیں پھینکی، اگر وہ خود غرض تھا تو صرف تمہارے لئے، لیکن تم ہم سب کے خلاف خود غرض ثابت ہوئی ہو، میں اپنی گلی نسلوں کو تمہارے سائے سے ضرور بچاؤں گا۔“

میں نے وعدہ کیا کہ میں آئندہ اس کے لئے کبھی باعثِ شرم نہ بنوں گی۔ میں نے اسے درگزر کرنے کو کہا لیکن وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے اس کی منت کی ”مجھ سے منہ مت موڑو، میں وعدہ کرتی ہوں درگاہ پہ میری وجہ سے کوئی دھبہ نہ لگے گا۔ میں ہمیشہ اس دعا میں مصروف رہوں گی کہ فضا میں جن سکینڈلوں کا چرچا ہے اپنی موت آپ مر جائیں۔ مجھے صرف ایک موقع دے دو میں بہت اچھی ماں ثابت ہوں گی۔“ دروازے میں قدم رکھتے ہوئے اس نے اعلان کیا ”تمہاری شریک کار

کنجری مر چکی ہے۔“

تارا مر گئی تھی؟

تارا؟

میں نے اپنے دل کو کسی اتھاہ گہرائی میں گرنے سے تھام لیا۔ دھکا اور دُکھ برابر کے تھے۔ میرے دکھوں اور اذیتوں کے حصار کو توڑتے ہوئے وہ پھر بولا۔ مرنے سے پیشتر وہ سب کچھ اُگل گئی، میں جانتا ہوں کسی عورت سے سب کچھ کیسے اگلوایا جا سکتا ہے۔“

وہ دالان میں پہنچ چکا تھا جب میں نے اسے واپس بلوایا، اب وہ کمرے کے درمیان کھڑا تھا اور میں الماری سے چیزیں نکال نکال کے پھینک رہی تھی۔ پیر سائیں نے تمہاری ماں یا تم لوگوں کی عزت کے تحفظ کے لئے کبھی کچھ نہیں کیا' سب جانتے ہیں۔ کسی سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں، لیکن ان میں سے کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ اس کے بارے میں کچھ کہہ سکے۔

اگرچہ میں جانتی تھی کہ میرے پاس موجود شہادت اور گواہیاں صرف مجھے ان معاملات میں ملوث کر رہی تھیں اور اس کے باپ کے خلاف یہ کوئی ثبوت نہ تھا، لیکن میں نے پھر بھی وڈیو فلمیں اٹھا کے اس کی آنکھوں کے سامنے جھونک دیں۔

”تم مجھے بے عزت کرنا چاہتے ہو؟ اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھو جو تمہاری بہن بھی ہے اور وہ فلمیں دیکھو جو تمہارے باپ نے تمہاری ماں کی بنائی تھیں۔ تم بہت سے اُن مردوں کو دیکھو گے جنہیں میں نہیں جانتی' لیکن تم پہچان لو گے۔“

راجہ جی نے میرے ہاتھ سے فلمیں چھین لیں، پھر اس نے جو کچھ کہا وہ میرا دم گھونٹ دینے کے لئے کافی تھا۔

”وہ کنجری مجھے پٹھان کے پاس لے گئی۔ میں نے اس حرامزادی کا کچومر نکال دیا۔ اللہ کے فضل سے میرے والد کا ان فلموں سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ وہ ان میں کہیں بھی نظر نہیں آ رہا۔ میری ماں ہی ایک بے غیرت نکلی۔“

وہ آہستہ آہستہ باہر نکل گیا۔ ”اس سائے کے متعلق کیا خیال ہے جو ہر وقت ہر شے پہ لہراتا رہتا ہے؟ وہ کون ہے؟“ میں انتہائی بے قراری سے اس کے عقب میں چلائی۔

وہ یوں رکا جیسے کسی نے پیچھے سے اینٹ ماردی ہو، لیکن پھر وہ چل دیا کیونکہ سایوں کو کون خاطر میں لاتا ہے۔ میری چیخیں سنتے ہوئے حویلی کی ساری عورتیں میرے کمرے کے

دروازے تک چلی آئیں۔ میں نے انہیں گالیاں دیتے ہوئے واپس کر دیا۔ تارا جا چکی تھی۔ اب مجھے کسی اور کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ تصور کرتے ہوئے کہ اس نے کسی ظالمانہ طریقے سے اس پہ تشدد کیا ہوگا مجھے جھرجھری سی آئی۔ ورنہ تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اسے پٹھان کی شناخت میں مدد دیتی۔ جھرجھری مجھے اس سوچ پہ بھی آئی کہ راجہ جی میرے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔

صبح خاکستری اور ناامیدیوں سے پُر تھی۔

دیواریں مجھے دبا لینے کو آ رہی تھیں۔

میری دنیا پھر چوکور ہوگئی تھی۔ میرے بچے مجھ سے اور بھی دور ہو گئے تھے۔ اتنی دوری تو موت بھی پیدا نہ کرتی۔ عجیب بات ہے پیر سائیں کی زندگی میں چیزیں پھر بھی بہتر تھیں۔ شیطان کی عدم موجودگی میں زندگی کے بھاری بوجھ نے مجھے خدا کے سامنے جھکا دیا۔ قرآن پاک کی تلاوت کے دوران، چھوٹے سائیں کے لئے روتے ہوئے قبلہ رو بیٹھی میں اماں سائیں کی طرح پتھر کی ہوتی جا رہی تھی۔

مہارانی حاملہ ہوگئی اور میرا بیٹا جس نے یہ غلاظت پھیلائی تھی اپنے آپ سے ایک التواء میں رکھا سوال پوچھنے پہ مجبور ہو گیا۔ وہ اس کا کیا ہوتا باپ یا ماموں؟ جب یہ گھناؤنا گناہ اس کے دماغ میں کیڑے کی طرح سرائیت کر گیا تو چیختے چلاتے اس نے بیوی کو اپنے سے دور کر دیا اور اس خوف ناک حقیقت کے پیشِ نظر شراب میں ڈوب گیا۔ جب اس سے بھی سکون نہ ملا تو اس نے نگاہ میں آنے والی ہر نوجوان نوکرانی کے بازوؤں میں گم ہونے کی کوشش کی۔ نہیں تو وہ کمرے میں بند ہو کے اپنی پوری آواز کے ساتھ ماں اور بیوی کو گالیاں نکال رہا ہوتا اور حاجت مند گہرے صبر کے ساتھ درگاہ پہ نہ صرف اس کے منتظر ہوتے بلکہ اس تپ سے اس کی صحت یابی کے لئے دعائیں کر رہے ہوتے جس نے اُسے گرفت میں لے رکھا تھا۔

مہارانی کے رحم پر برائی کے بڑھتے ہوئے بیج نے وڈی ملکانی کو اذیتیں دے دے کر موت کے حوالے کر دیا۔ چھوٹی ملکانی اپنے اوپر گرتے مصائب اور غموں کے پہاڑ کے نیچے دبی واویلا کرتی رہتی۔

”ہمیں کیا ہو گیا ہے؟ ہم پہ کسی شیطانی روح کا قبضہ ہو گیا ہے، ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ یہ کیا ہے؟“ وہ ہر اس عورت کے سامنے روتی پیٹتی جو اس کی بہن کی تعزیت کے لئے اس کے

پاس پہنچتی۔

نخی بی بی نے وہ راز اُگل دیا جو وڈی ملکانی اپنے دل میں لئے قبر میں اتر گئی تھی۔ چھوٹی ملکانی اپنے خاوند کو بتانے کے لئے دوڑی دوڑی گئی اور جواباً اس کا خاوند وڈی ملکانی کے رنڈوے کو بتانے دوڑا۔

”ہمارے بچے ہمارے نہیں، نہ مہاراجہ تمہارا بیٹا تھا اور نہ مہارانی میری بیٹی ہے۔“

بھائیوں نے مایوسی اور افسوس کے عالم میں اپنے سر دیواروں سے پھوڑ لئے۔ ان کی عزت اور غیرت ہاتھوں سے نکل گئی تھی، دُکھ اور مایوسی میں ڈوبے ہوئے ان دونوں نے اپنی نبضیں کاٹ لیں اور خون بہہ جانے سے موت کے گھاٹ اتر گئے۔ چھوٹی ملکانی کی میت بھی ان کے پیچھے پیچھے قبرستان پہنچ گئی۔

یہ راز کُھلنے پہ کہ اس کا خاوند دراصل اس کا بھائی تھا مہارانی کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ ابھی تک اس نے اپنے رحم میں پرورش پاتی اس قاتل بلا کو درگاہ کے حوالے نہ کیا تھا۔ اپنے بال نوچتے اور چہرے پہ تھپڑوں کی بارش کرتے کرتے وہ دردِ زہ تک پہنچ گئی۔

میں نوزائیدہ جوڑے کو دیکھتے ہوئے اس سوچ میں غرق تھی کہ اُن کے لئے کیا محسوس کروں کہ وہ میرے پوتے تھے کہ نواسے؟

جنسی استحصال کے ہاتھوں پیدا ہوئے ان دونوں بچوں کی رگوں میں شیطانی خون دوڑ رہا تھا۔ وہ ہو بہو پیر سائیں کی شکل تھے۔

ابروؤں کے درمیان وہی کٹاؤ، لبوں کی جگہ ایک سیدھی لائن اور سروں پہ کالے سیاہ بالوں کی گھنی فصل جو جلدی ہی ان کے چہروں کو بھی ڈھانپ لیتی۔ مجھے ان کی پنگوڑوں سے وہی بو اُٹھتی محسوس ہوئی جو ان کے دادا کی قبر سے آتی تھی۔ میں نے انہیں چھوا تک نہیں۔

تارا کی موت کے بعد سے میں نے راجہ جی کو نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اسے بلا بھیجا لیکن وہ ٹھیک پندرھویں دن مجھے ملا۔

”تم مصیبت میں ہو اور میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔“ میں نے بات کا آغاز کیا لیکن اس نے مجھے کاٹ دیا اور نشے کے عالم میں واپسی کے لئے مُڑا میں نے اسے عقب سے آواز دی ”تمہاری شادی ایک گناہ ہے، مہارانی کو اپنے بچوں کے ساتھ چلا جانے دو۔“

وہ ٹھٹھی کر کے مجھ پہ ہنسا ”تم میں ابھی بھی اتنی جرأت ہے کہ مجھے گناہ کے

بارے میں بتاؤں، مجھ سے دور رہو ورنہ میں کسی روز تمہیں بھوسے کے ڈھیر پہ کھڑا کر کے آگ لگادوں گا۔"

لڑکھڑاتے ہوئے وہ چیخا "اس سے بھی بہتر ہے میں اپنے چچوں سے تمہارے بارے میں بات کروں۔" میرے دل کی دھڑکنیں تھم گئیں۔

اس کے چچاؤں کے کرتوت اور طریقے میرے خاوند سے زیادہ مختلف نہ تھے۔
راجہ جی سے معاملہ کرنا آسان تھا،ان سے کچھ طے کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔

کچھ دیر لگائے بنا راجہ جی اپنے چاروں چچاؤں کے ساتھ اماں سائیں کے کمرے میں آ پہنچا۔ دائی نے انہیں چائے پلاتے ہوئے ان کی بات چیت سنی ورنہ اسے جاننے کا اور کوئی ذریعہ نہ ہوتا۔

کئی مہینوں کی قید و بند کے باوجود میرے بارے میں پھیلی افواہوں میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ راجہ جی کی شادی کے معاملے کو بھی اس میں گڈ مڈ کر دیا گیا اور اس میں اس کے سسرال والوں کی اموات اور اس کے بچوں کی مکروہ بدبو کے قصے بھی شامل ہو گئے تھے، لیکن بھائی تو صرف میرے خلاف غصے میں بھرے ہوئے تھے۔

اس سے پہلے کبھی بھی ہمارے جیسے ممتاز اور مقدس خاندان کی یوں بے عزتی نہیں ہوئی۔ اس سے زیادہ مہیب اور بھیانک کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا۔ آج ہم پیروں کی بجائے چوروں کی طرح آ جا رہے ہیں، پھر جلد ہی ہم مقدس گنبدوں کے بجائے سکینڈلوں کے بوجھ تلے دفن کئے جا رہے ہوں گے۔

راجہ جی کے الفاظ نے میرا دل چور چور کر ڈالا "اگر وہ میرے ہاتھوں سے ہلاک ہوئی تو مجھے بے پناہ مسرت حاصل ہو گی۔"

وہ اپنے اس کو چچا کو قتل کیوں نہیں کرتا جس نے پوری زندگی ایک محرم بلکہ اپنی بیٹی سے مباشرت میں گذار دی تھی، مجھے خیال آیا، لیکن اس کے بجائے اس کے اسی چچا نے میرے بیٹے کے انتہا پسندانہ جذبات کی نفی کرتے ہوئے کہا، "موت لوگوں کی یادداشت کو اپنے ساتھ بہا تو نہ لے جائے گی سکینڈل تو جنگل کی آگ کی طرح پھیلتے ہیں۔ لوگ ان گھروں کی فہرستیں بنا رہے ہیں جہاں جہاں وہ اس کنجری تارا کے ساتھ گئی تھی۔ وہ اپنے اپنے قصے کہانیوں کے تبادلے میں مصروف ہیں۔"

زرعی دواؤں کے چور چچا نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا "یہ ناممکن ہے وہ حویلی سے باہر کیسے جا سکتی تھی؟" لیکن عیاش طبع معاملے کو شک کے حوالے کرنے کے جرم میں اس پہ چڑھ دوڑا۔ "آگ کے بغیر دھواں کہاں اُٹھتا ہے، جڑوں کے بغیر کوئی چیز بڑھتی نہیں۔"

میں بے بسی لیکن غصے کے عالم میں یہ سوچ رہی تھی کہ یہ لوگ اپنی اپنی حویلیوں سے اٹھتے بدبودار دھوئیں کو کیوں نہیں دیکھتے تھے۔ راجہ جی ان سب کو پیر سائیں کے ساتھ اس کی خواب گاہ میں آنے والے ہیروز کے بارے میں کیوں نہیں بتا رہا تھا؟ اس سائے کے متعلق بات کیوں نہیں ہو رہی تھی جو فلموں کے پس منظر میں لہراتا دکھائی دیتا تھا۔

بھائی اس بحث میں الجھے ہوئے تھے کہ ان کی ناک کے عین نیچے یہ کہانی کیسے پھیل گئی، اس کی حوصلہ افزائی کس نے کی؟ کس نے اسے بیان کیا اور اس نے اسے نہ ختم ہونے کے لئے پھیلنے میں مدد دی۔ کچھ صحیح کچھ غلط مگر لوگوں کے نام دھڑا دھڑ لئے جا رہے تھے اور جب بات لوگوں کی زبان پہ چڑھ جائے تو ایسا تو ہوتا ہی ہے، لیکن اُن سب کے باوجود وہ حقائق جاننے کے لئے ذرہ برابر بھی دلچسپی ظاہر نہ کر رہے تھے۔ خصوصاً ان لمحات میں جب ان کی مملکت کے بدحال جھونپڑوں میں ان کا تقدس ایک بڑا سوال بن چکا تھا ان کا یہ رویہ بڑا حیران کن تھا۔

انہوں نے میرے بیٹے کو یہ مشورہ دیا کہ وہ مجھے پاگل قرار دے کر کمرے میں بند کر دے۔

"اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو یہ ہمیں کرنا ہو گا۔" انہوں نے اسے تنبیہہ کی۔ "لوگ ہمیں دلال سمجھنے کے بجائے اس کام کے لئے ہماری تعریف کریں گے۔" کیا طاقت اور اقتدار ان کے ہاتھوں سے پھسلتے جا رہے تھے؟ مجھے خیال آیا۔ انہوں نے میرے بیٹے کو نصیحت کی "یہاں بہت کچھ داؤ پہ لگا ہوا ہے اور چانس صرف ایک ہے۔ اسے احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا۔"

کیا مقدس پابندیوں کو واپس لیا جا رہا تھا؟ میں حیران تھی۔ درگاہ کی قوت ایک بار پھر زیر بحث آ گئی "اس پہ کوئی سوال اٹھ گیا تو یہ ختم ہو کے رہ جائے گی۔ ذلت کو بے دردی میں بدل دو ورنہ تمہیں بے دخل کر دیا جائے گا۔" اس کے چچاؤں نے اپنا دھمکی آمیز فیصلہ سنا دیا۔

راجہ جی کا چہرہ یہ سنتے ہی لال ہو گیا۔

"بی بی جی تم تو ختم ہو چکیں۔" دائی نے پیشن گوئی کی "اب تمہاری مدد کون کرے گا، نہ ہی کوئی کر سکتا ہے۔ راجہ جی غصے کے عالم میں اکیلا ہوتا تو اس سے زیادہ خوف نہیں آتا تھا۔ اب تو خاندان کے بڑے ملوث ہو گئے ہیں جو میرے مالک سے کہیں زیادہ بے رحم ہیں۔"

میں خوش تھی کہ گنبد گرنے کو تھا لیکن ساتھ ہی مجھے یہ بھی یقین تھا کہ وہ مجھے بھی ساتھ ہی لے مرے گا۔

میں نے یہ سب کچھ بتانے پہ دائی کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے اپنا آنسوؤں کے دھبوں والا چہرہ صاف کیا مجھے دعا دی اور چل دی۔ اس کے پیچھے میں یہ سوچتی رہ گئی کہ شاید اگر میں آج اپنی سب ہی بدنصیبیوں کو گلے لگالوں تو کل خوش نصیبی مجھے آن لے گی اور میں ایک بار پھر سے پُر امید ہو جاؤں گی۔

اب تو میں سخت ناامیدی کا شکار تھی۔ میں راجہ کو مختارِ کُل سمجھے بیٹھی تھی اور انہیں تو کسی گنتی میں ہی نہ رکھا تھا جن کے وجود کو میرے وجود سے خطرہ تھا۔ میں نے روایت شکنی کی راہ اختیار کی تھی اور اب آستانے کی ساری قوتیں میرے خلاف صف آرا ہو گئی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ الماری میں رکھی شراب ختم ہو چکی تھی، لیکن پھر بھی میں ایک جام کے لئے دوڑی پھر میں بیٹھ گئی اور اپنے آپ کو نتائج سے خوف زدہ ہو کے رہ جانے کے بجائے مسائل کا حل ڈھونڈنے پر مجبور کیا۔

میرے دیوروں کے چہرے میرے ذہن کے پردے پہ آئے اور گئے۔ پیر سائیں کی موت والے روز میری چھٹی حس نے بتایا تھا کہ اب انہیں میری زندگی میں کوئی کردار ادا کرنا تھا۔

لیکن وہ کیا کریں گے؟

میری زندگی کسی بھکاری کے موسم سرما جیسی تھی۔ میں اس کے مقصد کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس کا انجام کیا ہوگا؟

سوالات ایک دوسرے کے پیچھے دائروں میں گھومتے چلے آئے...... اس دنیا کی طرح جو کبھی میری نہ ہو سکی۔ سوال تھے' لیکن جواب کوئی نہ تھا۔ کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے اَٹ گیا۔ مسکن ادویات کی بھاری خوراک کے ساتھ میں فرش پہ اوپر نیچے چلتی وہیں ڈھیر ہو گئی۔ صبح جب میں بیدار ہوئی تو گذری ہوئی رات کی سب ہی باتیں اور خیالات میرے

ذہن سے حرفِ غلط کی طرح مٹ چکے تھے۔

آخر کار میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔

میں ان سے لڑ نہیں سکتی تھی۔

میں ان سے دور ہو سکتی تھی۔

ہاتھوں میں قرآن لئے یہ قسم کھانے راجہ جی کے کمرے کی طرف بھاگی کہ ہمیشہ اپنے کمرے میں رہوں گی۔ اس کے کمرے کے باہر برآمدے میں منتظر کھڑے کھڑے میری نگاہیں میز پر رکھے اخبار پر پڑیں۔ میں نے اپنی سانس روک لی۔

دروازہ چرچرایا تو میں برق رفتاری کے ساتھ اخبار سے دور ہو گئی۔ راجہ جی لڑکھڑاتا ہوا اندر آیا۔ اس نے اخبار اٹھا کے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا اور مجھے دوٹوک کہا "تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

میں نے ایک نئی مسرت سے کہا" میں پہلے بھی تمہیں یہاں دیکھنے آچکی ہوں، اس وقت تو تم نے ناراضگی کا اظہار نہیں کیا تھا" وہ جلدی میں تھا اور مجھے مہلت کی ضرورت تھی تاکہ میں وہ سب کچھ کہہ سکتی جو مجھے کہنا تھا۔ ایک نئی تشویش لئے میں لوٹ گئی۔

اس وقت کچھ کہنا ممکن نہ تھا۔

راجہ جی اپنے کام سے نکل گیا تو میں دوبارہ اس کے برآمدے میں پہنچ کے ٹوکری کی طرف لپکی۔ اخبار اپنی چادر میں چھپاتے ہوئے چوروں کی طرح میں واپس ہو لی۔ اخبار دو روز پرانا تھا۔ رانجھا جا چکا ہو گا۔ میں نے اس ریسٹ ہاؤس کا پتہ لکھ لیا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔

کمرے میں قید ہونے سے پہلے مجھے ہر صورت رانجھا کو ملنا تھا۔ میں اسے اپنی کہانی سنانا چاہتی تھی۔

تارا! تارا!! میں نے اسے پکارا۔ مزار کو ملبے کے ڈھیر میں بدل دینے کی میری خواہش نے مجھے بالکل اندھا کر ڈالا تھا۔ میں انتقام کی آگ میں جل بھن چکی تھی۔ حویلی کے دروازے کھلنے کے بعد سے رانجھا میرے ذہن سے نکل گیا ہوا تھا۔

میرے اللہ، یہ کیسا کھیل ہے؟ میں جائے نماز پہ ہچکیاں بھر رہی تھی "تو نے مجھے موت سے روشناس کروایا اور پھر زندگی دے دی؟"

جائے نماز پہ ٹکے مارتے ہوئے میں چیخی "میں اپنے آپ کو پیار اور محبت کی اس

دوڑے سے کیسے بچاؤں، میرا بدن نہیں تو میری روح تو ضرور اس کو پالے گی۔"

قیمت خواہ میری زندگی ہوتی مجھے اپنے رانجھا کو ایک بار ضرور ملنا تھا۔ اسے ملے بنا اس چوکور میں زندگی اب ناممکن تھی۔

میرے اللہ! "میری سُن، مجھے سُن، تجھے تیرا واسطہ۔" میں چیخی، چلائی، روئی اور کراہی سجدے میں گر کے میں نے اللہ سے شکوہ کیا مجھ سے کیوں کھیل رہے ہو؟ اسے میرے ذہن میں کیا ایسے ہی لے آئے تھے؟ مجھے بتا تو اسے میرے دل میں کیوں لایا؟ کچھ سوالوں کا تو جواب دے، ایک کا تو جواب دے۔

میں روئی اور منت سماجت کی میں رانجھا کی آنکھوں میں اپنی صفائی سے پہلے اماں سائیں نہیں بنوں گی۔ اس کی آنکھوں میں اپنی غلیظ تصویر کے ساتھ تو میں ویسے بھی مری ہوئی ہوں۔ یااللہ! میری سُن، مجھے سُن، میرے خدا۔

راجہ جی کے کمرے کی طرف آتے ہوئے میں عقبی دروازے کے قریب سے گذری تو تارا مجھے بہت یاد آئی۔

دروازہ لکڑی کے تختوں کے ساتھ بند کر دیا گیا تھا۔

جیسے چڑیلوں کی گرفت میں کسی عورت کا مزار۔

جیسے جنگ، قسمت یا محض کسی طوائف کا نشان۔

سب سے کہیں زیادہ یہ رانجھا کی طرف میری پرواز کے خلاف مہر تھی۔ اسے توڑ کے نکل جانا ناممکن تھا، اُسے قبول کر لینا اس سے بھی بدتر۔ کاش گھڑیاں تارا کے دنوں کو واپس لوٹ سکتیں۔ میں آزادی کی ان راتوں کے لئے تڑپی جب میں جاگیردار کے بجائے اپنے رانجھے کو مل سکتی تھی میں نے اخبار ٹوکری میں پھینکا اور تیزی سے واپس ہولی۔

یہ ہو سکتا تھا......

یہ ہو تا رہا تھا......

میں اپنے ذہن کی طاقت سے اسے حاصل کر سکتی تھی، میں جانتی تھی میں کر سکتی تھی۔ مجھے ایسا کرنا تھا۔ بے قراری کے عالم میں نے دائی کو بلا بھیجا۔ اب وہی میری آخری امید تھی۔ میں نے اُسے اپنے سامنے بٹھایا تاکہ وہ میرا اور میں اس کا چہرہ واضح طور پر دیکھ سکیں۔

"دائی، مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں بہت جلد مر جاؤں گی، لیکن موت سے پہلے

میں اپنی عزت بحال کروانا چاہتی ہوں۔" میں نے کہا۔ اس نے اپنی ٹھوڑی پہ ہاتھ رکھتے ہوئے، اپنا منہ دائرے میں یوں ہلایا جیسے جبڑوں میں نسوار رکھنے والے ہلاتے ہیں۔ اس کے چہرے پہ شک وشبے کے سائے مجھے میری خراب شُہرت کا احساس دلا رہے تھے، لیکن اس کیفیت کے باوجود میں نے بات جاری رکھی۔

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں ایک بہت بڑے عالم دین کو ایک پیغام پہنچانا چاہتی ہوں جو میری راہنمائی کر سکیں گے۔"

وہ حیران و ششدر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اسے تاکید کی کہ جب میں بات کر رہی ہوں تو وہ دھیان مجھ پہ ہی رکھے۔ اپنی آنکھیں اس پہ مرکوز رکھتے ہوئے میں اسے ہپناٹائز کرنے کی کوشش میں تھی تاکہ وہ میری مرضی پہ چل کے میرے کام کر ڈالے۔

"دائی! فکر مت کرو۔" میں نے اُسے مطمئن کرنے کی کوشش کی "میں تمہیں اپنی مدد کے لئے مجبور نہیں کروں گی۔ لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ تم ایسا ضرور کرو گی۔"

میری سوچ کے عین مطابق اس نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا "بی بی جی میں ایک بوڑھی عورت ہوں۔ ہم لوگ اپنے باپ دادا کے زمانے سے درگاہ کے سائے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھ سے کوئی ایسی چیز مت مانگنا جو میرے بڑوں کی روحوں کے لئے بے وفائی کا طعنہ بن جائے اور میں زندگی کے آخری دنوں میں ان کے غیض و غضب کا نشانہ ہو جاؤں۔ وہ تو جیتے جاگتے میں میری کھال اتار دیں گی۔"

ہاتھ جوڑتے ہوئے اُس نے التجا کی "خدا کے لئے مجھے اس کام سے معاف رکھو۔ ہم دونوں قتل ہو جائیں گی۔ اللہ خود تمہاری عزت اور دل کا سکون لوٹا دے گا۔"

کام بن نہ پا رہا تھا اور اس کے علاوہ میں کسی اور پر بھروسہ بھی نہ کر سکتی تھی۔ تارا کو دیا گیا میرا پیغام اچک لیا گیا تھا دائی وہ واحد ملازمہ تھی جس پہ وہ کبھی شک نہ کرتے۔ شاید پوری حویلی میں وہی ایک فرد تھی جو میری مخبری بھی نہ کرتی، لیکن وقت بہت تھوڑا تھا۔ رانجھا تو شاید اس وقت روانگی کی تیاریوں میں ہو گا۔ مجھے اُسے ہر قیمت پہ راضی کرنا تھا۔

میں نے جھوٹ موٹ کا جوش و جذبہ ظاہر کرتے ہوئے کہا "دائی مجھے خواب میں کعبہ دکھائی دیا، تم اور میں حج کر رہی تھیں۔"

اس کی بوڑھی آنکھیں حیرت اور مُسرت سے پھٹ گئیں۔ "میں مدد کے لئے دعا کر

رہی تھی کہ آسمان سے آواز آئی۔ پیچھے مڑ کے اس فرشتے کو دیکھو جسے یہ کام سونپ دیا گیا ہے۔ میں گھومی تو مجھے ایک عورت سجدے میں گری نظر آئی۔ اس نے سر اٹھایا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ دائی، وہ تم تھیں۔"

دائی تو اپنے آپ کو کعبہ تک رسائی کے قابل بھی نہ سمجھتی تھی۔ خدا کی طرف سے فرشتے کا خطاب ملنا تو بڑی بات تھی۔ وہ رو دی۔

میں نے اُس کی سسکیوں سے بلند آواز میں بات کرتے ہوئے کہا "میں نے تم سے مدد اس لئے مانگی کہ اللہ نے مجھے اس کی راہ دکھائی تھی۔ میں اس عمر میں تمہیں تکلیف کیوں دوں گی۔ یہ تو اللہ کی طرف سے آزمائش بن گئی ہے۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ آیا تم اس سے ڈرتی ہو یا ان لوگوں سے۔"

میں دائی کو اس مقام پہ لے آئی تھی جہاں میں چاہتی تھی۔ اب اس میں انکار کی جرأت نہ تھی "اگر اللہ چاہتا ہے کہ میرا خاتمہ اسی طرح ہو تو بی بی جی پھر میں ضرور جاؤں گی۔ اللہ مجھے ان لوگوں کے ہاتھوں سے بچا کے خود ہی لے جائے۔ اس کے نام پہ تو میں ضرور جاؤں گی۔"

میں چھلانگ مار کے کھڑی ہو گئی۔ وقت بہت تھوڑا تھا۔ "دس منٹ کے اندر اندر واپس آ جانا۔ اتنی دیر میں میں پیغام لکھ رکھوں گی۔" میں کسی پرندے کی طرح چہچہا رہی تھی۔ میرے پر نہیں تھے لیکن میں آسمان کو چھو رہی تھی۔

میں نے رانجھے کو جمعرات کے روز غروبِ آفتاب کے وقت مزار پہ ملنے کو کہا اور نیچے ہیر لکھ دیا۔

ریسٹ ہاؤس ہم سے بہت دور نہ تھا۔ دائی بڑے آرام سے پندرہ منٹ کے اندر وہاں پہنچ سکتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد ہی مجھے خیال آیا کہ میں نے بھی پیروں کی طرح ہی اللہ کے نام کو استعمال کر کے کسی معصوم کو قابو کیا تھا۔

اسے گئے بہت دیر ہو چکی تھی۔

ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑتے رگڑتے میں کمرے میں اوپر نیچے چلتی رہی، آخر کار دروازہ کھلا اور دائی اندر داخل ہوئی۔ "تم نے انہیں ڈھونڈ لیا؟ کیا وہ وہیں تھے؟"

اُس نے اپنا سر ہلاتے ہوئے میری امیدوں پہ پانی پھیر ڈالا۔ مجھے اس کی نامراد واپسی

بہت کھلی۔ تھکی ماندی دائی نے آلتی پالتی مار کے فرش پہ بیٹھنے کے بعد سرگوشی کی، "وہ دوپہر تک لوٹ آئیں گے۔ آج رات انہیں واپس جانا ہے۔ میں نے آپ کا رقعہ وہاں چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔" میں اس سوچ میں مری جا رہی تھی کہ آیا وہ دوبارہ اسے ملنے جائے گی۔ اللہ کا شکر ہے اس نے خود ہی کہا کہ میں گھنٹے بھر میں پھر آؤں گی۔

اس دفعہ وہ کامران لوٹی۔

"میں ان سے ملی ہوں۔" اُس نے کہا اور میں خوشی سے ہنستے ہنستے دُہری ہو گئی۔

انہوں نے رقعہ پڑھا اور سینکڑوں سوال کئے جن کے میں جواب دیتی رہی۔ وہ مجھے شک بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"بی بی جی آپ کو کس نے بتایا کہ وہ کوئی مقدس دینی شخصیت ہے؟ میں نے تو لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ کوئی ولی اللہ نہیں صرف حکومت کا وزیر ہے۔ جب میں نے اصرار کیا کہ نہیں وہ ولی اللہ ہی ہے تو دیوانی سمجھتے ہوئے انہوں نے مجھے مزار کا راستہ پکڑنے کو کہا۔ میں نے کسی کو یہ نہیں بتایا کہ میں تو آئی ہی وہاں سے تھی۔ بی بی جی آپ کو اس کی طاقت کے بارے میں کسی نے بتایا؟"

مسرت کے اس عالم میں میرے پاس الفاظ کہاں تھے۔ اس نے ایک کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ "دائی، مجھے اللہ نے بتایا تھا" میں چہچہائی "اسے اللہ نے بھیجا ہے جیسے تمہیں۔" میرے دل کی تاریکیوں سے خوشیوں کے فوارے اٹھ رہے تھے۔ حنا میرے سر کو ٹھنڈا اور سفید بالوں کو رنگ دیئے ہوئے تھی۔ جمعرات کے انتظار میں میں نے بیسن کے استعمال سے اپنے چہرے کو بالکل نرم اور ہموار کر لیا اور پورے بدن کی مالش اور صفائی کرتی رہی۔

اگر دنیا انسانی قدموں میں جھک سکتی تھی تو وہ صرف ان دو پیار کرنے والوں کے ہو سکتے تھے جن کا ملن ہونے کو تھا۔

اب یہ بے معنی تھا کہ زندگی کے دائرے چوکور ہو گئے تھے۔ پیار ہی وہ جادو تھا جو کائنات اور اس کے آگے ہر شے کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھا۔

میری آنکھوں کے پیچھے جمع ہوا ہر دکھ' درد دور ہو گیا۔ اس روز میں نے کوئی پرفیوم اور عطر استعمال نہ کیا۔ آج میں وقت کے الٹے دھاروں میں بہہ نکلی تھی۔ اپنے بیاہ کے دنوں کو عبور کرتے ہوئے میں ان خوشیوں تک پہنچ گئی جن سے ماں کی وجہ سے محروم رہ گئی تھی۔

تارا کی نصیحت کے مطابق شور سے بچنے کے لئے میں نے اپنی چوڑیاں اتار ڈالیں اور پاؤں میں نرم سلیپرز پہن لئے۔ آئینے میں عکس گو نیا تھا لیکن پھر بھی پرانا۔ آخر کار ہیر مجھ پہ مسکرا اٹھی تھی۔

دائی کو اپنے مقصد کے بارے میں بتائے بنا میں اس کے پیچھے پیچھے درگاہ کی طرف چل دی۔ میرے دل میں مزید لالچ ابھر رہا تھا۔ میں پہلے ہی ایک اور ملاقات کا منصوبہ بنا چکی تھی۔

"کیا یہ حقیقت ہے؟ کیا یہ سچ ہے؟" میرے ذہن میں اسی فقرے کی بار بار گردان ہو رہی تھی۔

میں نے اپنے خاوند کی قبر سے اٹھتی سڑاند کے بھبھکوں سے بچنے کے لئے سانس روک لی اور تیزی سے باباجی کے مزار کی طرف بڑھی۔ قبر کے پاس دیوار سے ٹیک لگائے میں اس کے انتظار میں بیٹھ گئی۔

مجھے سوکھے پتوں کے کچلے جانے کی آواز آئی یا یہ کلف لگے سوتی کپڑوں کی سرسراہٹ تھی۔

میرے دل کی دھڑکن تیز تر ہو گئی۔

قدموں کی چاپ سنائی دی۔

ڈگ بھرتے وہ سیدھے میرے دل کو روندتے ہوئے آئے۔ پھر رُک گئے۔

راجہ جی؟

اس کے چچا؟

میں اس کے چاروں چچاؤں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی یہ مرجانے کا وقت تھا۔ پیار میں ڈوب کے میں سولہ سال کی ہو گئی تھی۔ اب میں سو سالہ ہو گئی۔ دوسری سانس آنے تک جیسے پوری ایک زندگی بیت گئی تھی۔

انہوں نے مجھے سٹور کے پیچھے ایک کمرے میں قید کر دیا جہاں میں نے بہت سے خطوط لکھے اور پھر انہیں خود ہی پڑھتی رہی۔

میری جان ہیر!

وہ صبح جس نے رات کو اُلٹ دیا تھا دم توڑتے ہوئے تمہاری زندگی کی تاریکیوں کو

میرے باقی دنوں پہ پھیلا گئی۔ میں کسی نابینا شخص کی طرح حالات کو ٹٹولتے ہوئے تمہارے بارے میں مزید جاننے کے لئے کوشاں رہا ہوں۔ مجھے وحشت اور جنون کے سیلاب نے آگھیرا اور میں کئی روز تک اس میں ڈوبا رہا ہوں۔ جدوجہد کے بعد جب میں اس سے باہر آیا تو میں اسی طرح شعلوں کی لپیٹ میں تھا جیسے تم۔ میرے سامنے کوئی راستہ ایسا نہ تھا جس پہ چل کر میں تمہاری مدد کر سکتا، نہ ہی کوئی ایسا جو مجھے تم تک پہنچنے دیتا۔

میں کسی غیر کی امانت تک کیسے پہنچ سکتا تھا۔ میں کسی عورت کے پردے کو کیسے عبور کر سکتا تھا جس کے پیچھے اس کے خاوند کو ہر جائز ناجائز کی اجازت حاصل تھی اور مجھے کسی بھی چیز کی نہیں۔ اس نے جس انداز میں تمہیں پیش کیا اس میں تمہیں دیکھنا مجھے گوارا نہ تھا میں تمہیں تذلیل کا شکار ہوتے دوبارہ کیسے دیکھ سکتا ہوں۔

تمہارا رانجھا

لوہے کے بکس میں رکھے نئے کپڑوں کی تہوں کے نیچے خطوط کا انبار بڑھتا گیا۔ کبھی میں سوچتی میرا پیار ہمیشہ مقفل ہی رہا...... ایسا کیوں تھا۔ وہ جو صحیح تھا اتنا غلط کیوں تھا؟ واحد رشتہ جو قائم رہا وہی کیوں تھا جو بن ہی نہ سکا؟

غیر حقیقی تخیلی لمحات حقیقی ہو گئے۔ میں ایک واہمے میں زندگی بسر کرتی رہی تھی۔ حقائق افسانوں میں اور افسانے حقائق میں بدل گئے۔ میں ان سایوں کی تصویریں بنانے میں لگی رہی جو ہر لمحے چھائے تو رہتے، لیکن کتنے غیر یقینی کتنے غیر حقیقی۔

میرے آنسوؤں میں تر کاغذ میری روح کی طرح مُرجھاتے اور جھرجھریاں لیتے۔ میرے ذہن کا میوزک اس پہ مستزاد تھا۔ میں کبھی شاعری کرتے اور کبھی اتھاہ مایوسیوں میں گھری اپنی سوانح اور مرثیے لکھتی۔

ہیر شیطان کی زوجہ
ایک طوائف زنداں میں
لوٹ گئی جہنم کو

میں نے اپنی ذہنی کیفیت اور جہنم میں زندگی کے بارے میں لکھا۔ باقی وقت میں چوکور کمرے میں دائرے بناتی گھومتی رہتی اور ساتھ ساتھ باآواز بلند بڑبڑاتی، میں اپنی دنیا کو دوسروں کی دنیا کی طرح گول کر لوں گی۔ میری دنیا ایسی ہی گول ہے جیسے خدا نے اسے بنایا۔

میں اسے ایسے ہی گول بناؤں گی جیسے خدا نے اسے بنایا۔

میں نے ایک خط مایوسیوں سے بھرا لکھا اور پھر ایک امیدوں سے بھرا۔ اپنے پیار سے ملنے کا میرے پاس کوئی طریقہ اور راستہ نہ تھا سوائے اس کے کہ کوئی معجزہ رونما ہو جاتا۔ کوئی اور دروازہ کھل سکتا اور کوئی دوسرا موقع وجود میں آ سکتا۔

ہر روز میں نے اسے لکھا۔

ہر رات میں امیدوں کو مٹا ڈالتی۔

پیار پاگل کر دینے والی محرومی میں بدل گیا۔ رانجھا نے شاید کبھی بھی میرے بارے میں نہ سوچا۔ اس نے شاید کبھی بھی پرواہ نہ کی ہو۔ شاید ہیر اس کی یادوں سے مٹ گئی ہو۔ شاید پیاری بھی معدوم ہو گئی ہو۔

خط و کتابت ختم ہو گئی۔

میں پرانے کھیل سے تنگ آ گئی۔ آزادی کے گیت اور پیار کی کہانیاں محض گیت اور کہانیاں ہی تھیں۔ میں نے اپنی روح کو پرواز کے لئے مجبور کیا۔ میں نے کوشش کی کہ وہ کنکریٹ کے جنگل سے اس طرح نکل جائے جیسے سرکش درخت نکلتا تھا لیکن میرے لئے زندگی اور موت بڑے عرصے سے ایک ہو چکی تھیں۔

میرا دماغ رانجھا، پیر سائیں، رانجھا، پیر سائیں کی دھن پہ پھڑکنے لگا۔ نہ ہی میں نئی اور پرانی اور ناکام قیاس آرائیوں اور اصولوں اور سوچوں کی کھچڑی کو اپنے ذہن کو دھنکنے سے روک سکتی تھی۔ ذہنی توڑ پھوڑ سے بچنے کے لئے میں نے دوپٹہ اپنے سر پہ زور سے کس لیا۔ گرہ کے اندر میں چلائی "مرو، مر جاؤ۔"

مالک کی آواز آئی "اُٹھو، اُٹھ جاؤ۔ طلسماتی دارو کے پروں پہ اُڑتے ہوئے آسمان پہ پہنچ جاؤ۔"

میں نے یاددہانی پہ احتجاج کیا۔ "میرے خدا تجھے تیرا واسطہ اس کی آواز کو فنا کر دے۔"

میں اس کی بڑھتی ہوئی خاموشی اور سکوت سے مخاطب ہوتے ہوئے التجائیں کر رہی تھی۔

چھٹکی میرے زندان خانے میں چلی آئی۔ اس نے فوراً چلانا شروع کر دیا۔ "خدایا! ہائے انہوں نے تمہارا کیا حال بنا دیا؟ تمہیں یہاں کس نے بند کیا ہے؟ راجہ جی نے تمہاری بیماری کی وجہ سے اماں کو بلا بھیجا تھا لیکن ہمیں تمہاری بیماری کی نوعیت کا احساس نہ ہو سکا اور

انہوں نے اپنی جگہ مجھے بھیج دیا' یہ انہوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟"

کیا کیا؟

میرا چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں لئے اسے چومتے ہوئے وہ مسلسل روئے چلی جا رہی تھی۔

مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور میں نے جیسے بہت پہلے دائی کی منت کی تھی اس کی بھی کی۔

"میں کسی اور کو نہیں کہہ سکتی تھی کیا تم مجھ پہ ایک مہربانی کرو گی؟ کیا تم میری مدد کرو گی؟"

میری بہن نے سسکیوں کے درمیان قسم کھاتے ہوئے کہا کہ وہ میرے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھی۔

"میرا خط ایک بڑے عالم کو مہمان خانے میں پہنچا دو، اور اس کا جواب مجھے آج ہی لا دو۔ اس کا ٹھکانہ صرف پندرہ منٹ کے فاصلے پہ ہے۔" میں تو ایک اور موقع کے لئے بے قرار اور بے چین تھی۔ چھٹکی کسی قیمت مجھے اکیلا چھوڑنے پہ راضی نہ تھی۔

میں نے فوراً وہاں جانے کے لئے اس کی منت سماجت کی۔ "ابھی جاؤ، انتظار کا وقت نہیں رہا۔ انتظار ہو نہیں سکتا، اگر تم نہ گئیں تو میں یہیں مر جاؤں گی۔" رانجھا کے لئے ایک اور رقعہ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے میں چلائی۔

اس کے آنسو اپنے آنچل کے پلو سے خشک کرتے ہوئے میں نے اسے اپنے خط کے ساتھ باہر بھیج دیا۔ "جاؤ، جاؤ، جلدی کرو اور جاؤ۔ جلدی آنا ورنہ میں یہیں مر جاؤں گی۔"

میں اس کے عقب میں چیخ رہی تھی۔

چھٹکی بھاگی۔

میں نے چھوٹی چوکور کو دوسرے دائروں میں رکھا تو میرا دماغ گولائی میں چکر کھانے لگا۔ چھٹکی واپس آئی تو میری دنیا ہمیشہ کے لئے چوکور ہو گئی۔ رانجھا وہاں نہیں تھا۔ ماں کو ساتھ لانے کا وعدہ کرتے ہوئے میری بہن واپس لوٹ گئی۔

میں نے اپنا آخری خط لکھا اور پڑھا۔

میری جان ہیر!

میں تمہاری زندگی کی قیمت پہ تمہیں ملنے نہیں آ سکتا۔ یہ ایسی خود غرضانہ خواہش ہو گی جو میرے پیار کی سچائی اور پاکیزگی کو ختم کر سکتی ہے۔ تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ تم

آستانے اور درگاہ کے مقابلے میں کھڑی ہو۔ تم ان کے قبے اور کتبے توڑتے ہوئے ان ہاتھوں کو قلم کر رہی ہو جو پاگل انسانوں کی قبروں پہ دعا کے لئے اُٹھے ہوئے ہیں۔ یہ کوئی سیدھا سادا گھریلو معاملہ نہیں۔ تمہیں شیطان کو اس کی ذاتی مملکت میں اور اس کے جہنم کا رکن ہوتے ہوئے للکارنے کے نتائج کا اندازہ نہیں تھا۔

اس مرحلے پہ میں تمہاری مدد کیسے کر سکتا ہوں؟ میں کسی ایسی چیز کے لئے دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں جو میری نہیں نہ تم دوبارہ شادی کر سکتی ہو اور نہ ہی میں ایک پیر کی ماں سے نکاح کا سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ کسی مرد کے لئے کسی عورت کو اپنے پاس رکھنے کا کوئی راستہ نہیں ہمارے حالات کبھی نہیں بدل سکتے۔

ہاں اگر تم کوئی اور بن جاؤ......

تم کسی اور کا روپ دھار لو......

کوئی اور......

میری کنپٹیاں، ہاں اگر تم کوئی اور بن جاؤ، کے الفاظ کے ساتھ تڑپ رہی تھی کالی، تارا اور طوطی۔ تیمرڑی چیل اور میں۔ عورتیں، بہنیں، بیٹیاں، بیویاں اور مائیں بلبلے بنتی پھوٹتی جاتیں۔ ایک سوئی مجھے چبھی۔

میری آنکھیں پیر سائیں کے بستر پہ کھلیں۔

ماں میرے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔ "الماریوں کی چابیاں کہاں ہیں؟ مجھے چابیاں دو۔ کہیں انہیں کوئی اور خط نہ مل جائے۔"

بھائی میرے اُوپر جھکتے ہوئے اپنی نرم آواز میں بولا۔ "آپا راجہ جی کے ہاتھ لگنے سے پہلے چابیاں ہمیں دے دو۔"

میری آنکھیں دیکھ رہیں تھیں، میرے کان سُن رہے تھے، میرا دماغ کام کر رہا تھا لیکن میں نہ تو ہل سکتی تھی نہ بول سکتی تھی۔

دروازہ کھلا۔

دن کی روشنی میں میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

راجہ جی میرے سر پہ کھڑا ہوتے ہوئے گرجا "یہ نری لعنت اور خدا کا عذاب ہے۔ اس نے ہمارے خاندان کو ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں دیا میری دعا ہے کہ وہ کسی سانپ

کی طرح ہمیں دوبارہ ڈسنے سے پہلے ہی مر جائے۔"

دن کی روشنی نے مجھے اندھا کر دیا اور راجہ جی چلا گیا۔ میں نے اپنی الماری کی چابیاں ماں کے ہاتھوں میں لٹکتی دیکھیں، گپی میرے چہرے کو تھامے رو رہی تھی، اماں واپس آ جاؤ، وہ دن جب ہم چاند کو چھوا کرتے تھے کتنے حسین تھے۔ تمہیں کیا ہو گیا؟ تم ہمیشہ کتنی طاقتور، کتنی بہادر، کتنی صابر کتنی اچھی تھیں۔"

میں پھول رہی تھی، پھیل رہی تھی، جامد تھی یا کثیف۔ جب میں شور وغل مچاتی انہیں مجھے اکیلا چھوڑ دینے کے لئے کہہ رہی تھی تو میرے بدن میں آگ کے شعلوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ تم بہت دیر سے آئے۔ مجھے اب کسی کی کوئی ضرورت نہیں، کوئی تیز سوئی میرے اندر داخل ہو رہی تھی اور میں بنا بولے بولتی چلی جا رہی تھی۔ وسیع و عریض اور کھلی جگہیں میرے سر کے چھوٹے چھوٹے نقطوں میں سکڑ رہی تھیں۔

میں بیدار ہوئی تو اماں میرے خطوط پڑھتے ہوئے رو رہی تھی "یا اللہ تیرا شکر ہے تو نے ہمیں مزید ذلت سے بچا لیا۔ دیکھو تمہاری بہن کس گند میں پڑی ہوئی ہے؟ دیکھو یہ ظلم اور یہ تباہی؟"

میری بہنیں رانجھا کے خطوط پڑھ پڑھ کر رو رہی تھیں۔ میں نے انہیں یہ بتانے کی کوشش کی یہ سب میرے اپنے تھے۔

صرف میرے، رانجھا کے نہیں، مجھ سے مجھ کو۔ یہاں صرف میں ہی میں ہوں اور کوئی نہیں۔ صرف میں۔

گپی وہسکی کی خالی بوتلیں ایک ڈبے میں پھینک رہی تھی۔ بھائی اسے اٹھائے باہر لے جا رہا تھا۔ فلمیں چٹکی کے پاس تھیں۔ اس سے بیشتر کہ وہ سب پتھر کی بن جاتیں جو مجھ پہ برسائے جاتے ماں نے انہیں اس سے لے لیا۔ اس نے انہیں کپڑوں کی تہوں میں چھپا دیا۔

بھائی نے انہیں پھر نکال لیا۔ ماں نے ایک بار پھر لپکتے ہوئے انہیں اپنے بیگ میں بھر لیا۔

میرے گھر والے اسی طرح گم ہو گئے جیسے وہ پہلے ہوتے تھے۔ اسی طرح جیسے کالی، تارا اور تیمرڑی گم ہو گئی تھیں۔ چیل اور بیوہ کی بیٹیاں بھی اسی طرح چلی گئی تھیں۔ طوطی بھی کبھی واپس نہ لوٹ سکی۔

کہیں بہت دور سے میں نے اسے پکارا، طوطی کیا دوسری دنیا اس سے اچھی ہے یا بدتر؟ مالک کہاں ہے؟ اگر میں مرگئی تو کیا مجھے اس کے ساتھ رہنا ہوگا؟

نہیں، نہیں، نہیں، میں اپنے دل کے تاریک کنویں میں چلاتی رہی یہاں تک کہ کمرہ بقعہ نور بن گیا۔ راجہ جی واپس آگیا تھا۔ بیٹھے ہی وہ ماں پہ چیخا' پھر وہ بھی چلائی اور اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپاتے ہوئے رو پڑی۔ دوسری طرف سے سسکیوں کی مزید آوازیں آئیں۔ میں آواز کی طرف رخ کرنا چاہتی تھی' لیکن نہ کر سکی۔

وہ کون تھا؟

چُھٹکی اور ننھی درمیان میں کسی اور کے ساتھ جڑی بیٹھی تھیں۔ سسکیوں کی آواز وہیں سے آرہی تھی۔ دیا کے چہرے سے اس کے کھلے منہ سے۔ کیا دیا رو رہی تھی؟

میرا سر چکرا رہا تھا اور میری نگاہ ٹھہر نہ پا رہی تھی۔ میں نے ایک بہت بڑی گائے کو اپنے کمرے میں اوپر نیچے چکر لگاتے دیکھا۔ اُسے کس نے اندر آنے دیا؟

گائے نے آواز نکالی، پھر سب اسی کی طرح کی آوازیں نکالنے لگے۔ ماں نے گائے کو چوما اور میری نگاہ ٹھہر گئی۔ منی پھر حاملہ ہو گئی تھی پھر حاملہ، پھر حاملہ......

ماں آنسو پونچھتے ہوئے کسی جنازے کی بات کر رہی تھی۔

کیا میں مرچکی تھی؟

سکون اور شانتی میرے سر سے کسی چشمے کے پانی کے طرح اترے، میرے بدن سے ہوتے ہوئے میرے دونوں پاؤں کی ایڑیوں کے سروں تک چلے گئے، زندگی دم توڑ گئی۔

لیکن جنت گھر جیسی کیوں تھی؟

عورتیں اندر آئیں اور اماں سائیں کی روح کے لئے بین کرنے لگیں موت تو اماں سائیں کے لئے آئی تھی۔

کیا یہ کوئی دن تھا، کوئی مہینہ، ایک سال یا یہ زندگی کے برابر کوئی عرصہ تھا؟ میں یا تو گرم دودھ کی طرح ابل رہی تھی یا برف کی طرح سرد اور منجمد۔ تصویریں اس رفتار سے گذرتیں کہ مجھے یوں لگتا کہ میں سرکس کے جھولے میں تھی۔ کسی وقت میں آسمانوں پہ تیر رہی ہوتی۔

راجہ جی طوفان کی طرح اندر آیا اور اس نے رانجھا کے متعلق کچھ کہا۔ مجھے یاد آیا میں اس سے کتنا پیار کرتی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ میں نے کچھ اور سوچنے کے لئے اپنی

یادداشت پہ زور دیا' لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

بھائی راجہ جی پہ چلایا "میری بہن مر رہی ہے۔ وہ اس کمرے میں مزید ایک دن کے لئے بھی زندہ نہ رہ سکے گی۔"

راجہ جی قبروں اور موت کا ذکر کرتے ہوئے چیخا "اگر یہ مرگئی تو اس قابل نہ ہوگی کہ اُسے ہمارے قبرستان میں جگہ مل سکے۔ اس کا کتبہ درگاہ پہ سیاہ دھبہ ہوگا۔ مجھے اس کی کوئی نشانی نہیں چاہئے۔"

میرے بھائی نے یہ کہنے پہ میرے بیٹے کو موت کی دھمکی دی، ہر کوئی زور زور سے رو دیا۔ راجہ جی نے دروازہ میرے سر میں دے مارا۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی اس کا شور میرے اندر منتقل ہو گیا تھا جہاں سب ہی مردے زندہ لوگوں کے ساتھ مل کر واویلا کر رہے تھے۔

ماں کالی کی طرح دُکھ درد کا اظہار کر رہی تھی "میں یہاں ہیر کے ساتھ ٹھہر سکتی ہوں، وہ اسے جانے نہ دے گا۔ ہمارے پاس کوئی اور چوائس نہیں۔ ہم سب یہیں اس کے پاس رہ سکتے ہیں۔"

بھائی چھوٹے سائیں کی طرح رو دیا "میں اپنی بہن کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اب میں اسے دوبارہ تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ وہ یہاں ایک روز بھی مزید نہیں رہ سکتی۔"

چُھٹکی طوطی کی طرح چیخی "راجہ جی اسے جانے نہیں دے گا۔ ہمیں یہیں اس کے پاس ہی رہنا ہوگا۔"

بھائی طوطی کے بلوچ کی طرح گرجا۔

"پھر کہیں گے وہ مرگئی ہے، کیا وہ مر ہی نہیں گئی؟ ہم اس کی موت کا اعلان کر کے اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ ہم اسے نئی شناخت دے کے کوئی اور بنا دیں گے۔"

میرے دل کے تاریک کنویں میں روشنی سی بھر گئی، اگر تم کوئی اور ہو جاؤ، اگر تم کوئی اور ہو جاؤ، میرے کانوں میں یہ الفاظ بار بار گونجنے لگے۔

نہ پیر کی بیوہ، نہ پیر کی ماں بلکہ کوئی اور۔

راجہ جی اندر آیا۔

بھائی نے کہا "میری بہن مرگئی ہے، تم سمجھتے ہو؟ وہ مرگئی ہے میں اسے اپنے باپ

کے پہلو میں دفن کروں گا۔ وہ تمہارے لوگوں کے ذہنوں سے صرف اس صورت مٹ سکے گی جب اس مزار میں اس کی قبر نہ ہو گی۔ اپنی مسجد کے لاؤڈ سپیکروں پہ اس کی موت کا اعلان کر دو۔"

ماں نے اپنے نواسے کی منت سماجت کی "اگر اس سے تمہاری بے عزتی ہوتی ہے تو بے شک اعلان مت کرو، لیکن اگر تم ہمیں اسے لے جانے دو گے تو وہ ہر ایک کے ذہن سے اتر جائے گی۔"

پھٹکی اپنے بھانجے کے پاؤں پڑ گئی "ہمیں اسے لے جانے دو اسے اپنی درگاہ سے دور چلے جانے دو۔ اس کے بعد تم کبھی بھی اس کے بارے میں نہیں سنو گے۔"

راجہ جی میری طرف آیا اور مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے جواباً سیدھا اس پہ نگاہیں گاڑ دیں، لیکن اس کے باوجود اس نے مجھے مردہ قرار دے دیا۔ کسی دیوتا کی طرح۔

صندوق، پیر سائیں کا الارم کلاک، میرے سلیپر وہ مجھے اس کے حوالے کرنے چلے تھے۔ وہ مجھے واپس پیر سائیں کے حوالے کرنے چلے تھے۔

مجھے چھوٹے سائیں کی ضرورت محسوس ہوئی اور میں نے اُسے مدد کے لئے پکارا۔

گُمی اور پُھٹکی نے میرے گرد باہیں ڈال کے مجھے غسل خانے کی طرف لے جانا چاہا تو میرا دل دھک دھک کر اٹھا۔ ننھی نے میرے کپڑے اتار دیئے۔ میں پھسل گئی۔ وہ چلائیں۔

میں ایک تختے پہ پڑی ہوئی تھی۔

یہ میرا آخری غسل تھا۔

صابن ملتے اور پانی ڈالتے ہوئے وہ دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ میرے منہ میں روئی ٹھونس دی گئی۔ میرے چہرے پہ ایک پٹی تھی۔ ایک چادر مجھے ڈھانپتی سر کے اوپر سے چلی گئی۔

اس کے اندر سے مجھے رونے اور بین کرنے کی آوازیں آئیں۔

وہ مر گئی ہے، مر گئی، ہیر مر گئی۔

پیر سائیں مجھے میری قبر میں آ لے گا۔ میں مُردوں کی صف سے اٹھ آئی اور جانے سے انکار کر دیا۔

لیکن چارپائی اٹھالی گئی اور میں ہوا میں لڑھکی۔ میں جانتی تھی گُمی کا چہرے میرے

پہلو پہ تھا، دیا اور منی دوسری طرف تھیں۔

یہ میرا شادی کا دن تھا۔ نہیں، دوبارہ نہیں، دوبارہ نہیں، میں خاموشی میں چلا رہی تھی۔ اسے روکو، اسے مجھے نہ لے جانے دو۔ اسے میرے ساتھ شادی سے روک دو۔ اسے میری طرف مت آنے دو، اسے مت دیکھنے دو، میں ہر ایک کی منتیں کر رہی تھی لیکن کوئی بھی سن نہ رہا تھا۔ پیر سائیں نے اس سب کو دھکیل دیا۔ میں پھر مر گئی۔

پیر سائیں کے بجائے راجہ جی آگے بڑھا۔

اس نے میرے چہرے سے چادر ہٹائی اور ہم دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔

"الوداع اماں" کہتے ہوئے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔

گُمی، دیا، منی اور راجہ جی معدوم ہو رہے تھے اور میں اپنے بچوں کو واپس چلے آنے کو کہہ رہی تھی۔

لوٹ آؤ، واپس آ جاؤ، خدا کے لئے مجھے معاف کر دو اور لوٹ آؤ، میں دل ہی دل میں چلا رہی تھی۔ چارپائی اینٹوں کی دیوار کے ارد گرد تیرتی ہوئی دروازے کے باہر غائب ہو گئی۔

اب میں گھڑی میں تھی۔ زندگی سے موت اور موت سے زندگی کی طرف سفر کرتے ہوئے تاریکیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں پھسلتے ہوئے یہاں تک کہ......

میری آنکھیں کھل گئیں۔ میرے چہرے سے چادر ہٹا دی گئی تھی۔ ہر طرف روشنیاں ہی روشنیاں تھیں۔ مرد گھوم پھر رہے تھے، عورتیں باتوں میں مصروف تھیں۔ لوگ دروازوں سے آ جا رہے تھے۔ وہ کہاں تھے اور میں کہاں تھی؟

کیا ہم پرانی زندگی کی کسی شناسا اور مانوس منزل پہ تھے یا یہ رانجھا کے متعلق کوئی سپنا تھا۔

اُدھر مڑتے ہوئے اِدھر گھومتے ہوئے، رُکتے، چلتے پھر مڑتے اور رُکتے ہوئے ماں باہر نکل رہی تھی۔

میں کہاں جا رہی تھی؟

چارپائی پہ پڑے پڑے میں ذرا ایک طرف کو لڑھکی۔ ہم گلی سے نکل رہے تھے۔ پھر میں بھائی کے ساتھ تنگ سیڑھیوں پہ تیرتے ہوئے گذری۔ وہ اپنی نرم آواز میں میرے

کانوں میں کہہ رہا تھا۔

"آپا اب میں دوبارہ تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ میں کسی کو تمہیں دوبارہ اپنے ساتھ نہ لے جانے دوں گا۔ میں تمہارے ساتھ رہنے کے لئے ہر کام کروں گا۔"

ماں کی آواز ہمارے عقب میں ساتھ ساتھ تھی "میری بچی اب تم اپنے گھر میں ہو، اپنے گھر میں، میں نے ماں کو دُعا کرتے ہوئے سُنا "یا اللہ مجھے اپنی بچی کو جہنم میں بھیج دینے کی معافی دے دے۔ یا اللہ اُسے اس کے صبر کا صلہ دے اور اسے ایک اور زندگی بھی عطا کر دے۔ ایک موقع، کوئی بھی موقع یا اللہ۔"

ایک مقفل دروازہ کھلا۔

مجھے چٹیا والی ایک چھوٹی سی لڑکی صحن میں پہل دوج کھیلتی دکھائی دی۔

میں نے پلکیں اٹھاتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ بابا اوپر سے مجھے دیکھتے ہوئے مُسکرا رہے تھے۔ ان کا چہرہ گہر اور دھند کے ہیولوں کی طرح کبھی ظاہر ہوتا کبھی چھپ جاتا۔

آخر کار وہ آ ہی گئے تھے۔

یہ جنت تھی۔

باب ۱۴

کُھلتے دریچے

ایک سال بعد سفید برقعہ اوڑھے میں پھولوں سے ڈھکی ایک قبر کے سرہانے کھڑی تھی۔ نقاب کے جھروکے سے میں نے سادہ سے لوحِ مزار پہ نگاہ ڈالی جس پہ "ہیر" کندہ تھا۔

ایک دہقان کنبہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی طرف بڑھا۔ انہوں نے قبر پہ گلاب کی تازہ پتیاں بکھیریں، اگربتیاں جلائیں اور مٹی کے ڈھیر پہ کچھ سبز کاغذی جھنڈیاں گاڑ دیں۔

گروہ میں سے کسی عورت کی آواز ابھری "یا اللہ اس کی، ساتوں خیریں ہوں۔ اس نیک روح پہ اپنی رحمتیں نازل فرما جس نے تیرے بندوں کو قبر پرستی کی لعنت سے نجات دلائی۔ اسے بخش دے جس نے خالق اور مخلوق کے درمیان کی دوریاں اور فاصلے مٹا ڈالے، ہمیں تیرا قرب بخشا۔"

میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بند دریچے کُھل رہے تھے کوئی تو سمجھ گیا تھا۔

ہاں! لیکن ایک اور مزار بھی تو وجود میں آ گیا تھا۔

دم بخود میں رانجھے کی طرف لوٹ آئی جو اپنی گاڑی کے سٹیرنگ پہ بازو جمائے میرا منتظر تھا۔